ڈاکٹر ابوالخیر کشفی

اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

قرآنِ حکیم کے آئینے میں

دار الاشاعت

Toobaa-elibrary.blogspot.com

اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے آئینے میں

مئولف: ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : اپریل ۲۰۱۰ء علمی گرافکس
ضخامت : 352 صفحات

AF - 1105

قارئین سے گزارش

اپنی حتی الوسع کوشش کی جاتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس بات کی نگرانی کے لئے ادارہ میں مستقل ایک عالم موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو ازراہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاک اللہ

……… ملنے کے پتے ………

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت القلم مقابل اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک ۲ کراچی
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی
مکتبہ اسلامیہ امین پور بازار۔ فیصل آباد
مکتبۃ المعارف محلہ جنگی۔ پشاور

ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انار کلی لاہور
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
مکتبہ اسلامیہ گامی اڈا۔ ایبٹ آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

انگلینڈ میں ملنے کے پتے

AZHAR ACADEMY LTD.
54-68 LITTLE ILFORD LANE
MANOR PARK, LONDON E12 5QA

ISLAMIC BOOKS CENTRE
119-121, HALLI WELL ROAD
BOLTON BL 3NE, U.K.

امریکہ میں ملنے کے پتے

MADRASAH ISLAMIAH BOOK STORE
6665 BINTLIFF, HOUSTON,
TX-77074, U.S.A.

DARUL-ULOOM AL-MADANIA
182-SOBIESKI STREET,
BUFFALO, NY 14212, U.S.A

فہرست

پیش گفتار	سید عزیز الرحمٰن	۶
اخلاق محمد ﷺ ۔ قرآن حکیم کے آئینے میں		۹
رسالت سے پہلے "صلح" کی دائمی قدر		۲۸
صلح کا منبع ۔ بے غرضی اور خیر خواہی		۳۲
تجارت ۔ امانت کا ایک وسیلہ		۳۴
اقرأ اور پھر قم		۳۷
صبر ۔ مومن کی ڈھال		۴۴
یا صباحاہ		۴۷
کافرانہ زندگی کا ہر شعبہ خطرے کی زد میں		۵۰
جماعتِ مومنین کی شیرازہ بندی		۵۳
زمانے کے مقابل تنہا، مگر اپنے ربّ کے ساتھ		۵۹
دارارقم ۔ پہلا دارالاسلام		۶۵
صحابۂ کرامؓ کا صبر		۶۷
ہجرت محض عمل نہیں بلکہ اخلاقِ حسنہ کی ایک بنیاد		۷۰
شعب ابی طالب		۸۱
عام الحزن اور سفرِ طائف		۸۵

اہلِ یثرب سے رابطہ	۹۴
معراج	۹۹
معراج، ہجرت اور عالم گیریت	۱۰۱
مدینے میں میثاق	۱۰۷
مدینہ میں اسلامی معاشرے کا قیام	۱۱۲
مدینہ منورہ کا اسلامی معاشرہ	۱۱۷
انسانی زندگی کی غیر معمولی صورت حال ۔ جنگ	۱۲۳
غزوات ۔ امن کا راستہ	۱۲۷
غزوۂ بنوقینقاع	۱۳۳
غزوۂ اُحد، اس کے سبق	۱۳۸
غزوۂ احزاب	۱۴۶
کفر کی نئی حکمت عملی	۱۵۲
ایک کے بعد دوسرا حملہ	۱۵۳
غزوۂ مریسیع، منافقوں کے جارحانہ رویئے، اور عظیم ترین برأت	۱۵۷
صلح حدیبیہ ۔ فتح مبین	۱۷۲
فتح خیبر، حدیبیہ کی تکمیل	۱۸۰
یہود کی سرکوبی صلح حدیبیہ کی تکمیل	۱۸۵
دعوت ۔ حکمت اور موعظت کے ساتھ	۱۸۷
مدینہ منورہ کا معاشرہ	۱۹۳
نظامِ عدل	۱۹۵
مدینہ منورہ میں تفریحات	۲۲۰
مدینہ منورہ کی اجتماعی زندگی میں خواتین کا حصہ	۲۲۴
مدنی معاشرے کے دوسرے پہلو اور اخلاقیات	۲۳۴

مسجد نبوی، صحابۂ کرام کی زندگی کا مرکز	۲۳۹
مدنی معاشرے میں ہر طرف رسول اللہ ﷺ کا نقشِ قدم	۲۴۴
جنگ موتہ، فوق البشر عسکری معرکہ	۲۵۱
غزوۂ تبوک	۲۶۱
صدق کی وسعتیں	۲۷۷
اسلام کی فتح مبین ۔ فتح مکہ	۲۸۴
غزوۂ حنین	۳۰۵
ہوازن کا وفد خدمتِ رسول اللہ ﷺ میں	۳۱۱
ہر راہ مدینے کی طرف	۳۱۳
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب	۳۲۹
خطبۂ حجۃ الوداع، آفاقی منشورِ اخلاق و حیاتِ انسانی	۳۴۴
رفیقِ اعلیٰ ۔ ملاقات کے لئے بے قراری	۳۷۲

پیش گفتار

سید عزیز الرحمٰن

الحمدللہ معروف محقق، صاحبِ اسلوب ادیب، عالم دین اور سیرت نگار ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفیؒ کی آخری تالیف ''اخلاقِ محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں'' قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہورہی ہے۔ اس سے قبل اس سلسلے کی دو کتب ''حیاتِ محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں'' اور ''مقام محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں'' دارالاشاعت کے ہی زیراہتمام شائع ہوکر اہل علم سے تحسین وتبریک حاصل کرچکی ہیں۔

کشفی صاحب بنیادی طور پر ادب کے آدمی تھے، مگر جب وہ سیرت نگاری کی طرف متوجہ ہوئے تو پھر شاید اسی کے ہورہے، ادب سے تعلق ان کا برقرار رہا، ادب پر لکھتے بھی رہے، مگر یہ سیرت کی برکت تھی کہ پھر سیرت نگاری اور نعت وتنقید نعت ہی ان کی پہچان بنی۔ اور ادب سے (عرف عام میں مراد لئے جانے والے ادب سے، ورنہ تو راقم کے نزدیک خود سیرتِ طیبہ پر ان کی تینوں کتابیں سیرت کے ساتھ ساتھ ادب عالیہ کا بھی شاہ کار ہیں) ان کا تعلق پس منظر میں چلا گیا۔

کشفی صاحب کی سیرت نگاری کی ابتدا تو بہت پہلے ہوگئی تھی۔ سیرت طیبہ پر اپنی پہلی باقاعدہ کتاب ''حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے آئینے میں'' کے ابتدایئے میں ''حرفِ اول'' کے تحت کشفی صاحب خود تحریر فرماتے ہیں:

> زیرِ نظر کتاب کا آغاز ۱۹۶۶ء میں مدینہ منورہ میں ہوا گنبدِ خضریٰ کے جلووں کو نظروں میں آباد کرکے سرورِ دنیا و دین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت عالیہ میں حاضری دی اور صلوٰۃ وسلام کا نذرانہ پیش کیا پھر صُفہ

> کے قریب بیٹھ کر اس تحریر کا آغاز کیا شاید وہ ستمبر کی نویں یا دسویں تاریخ تھی۔ اس تحریر نے ایک مضمون کی شکل اختیار کی اور یہ مضمون سیارہ ڈائجسٹ لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا، پتہ نہیں کیسے بعض حصے حذف ہوگئے، بعد میں یہی مضمون ایک مختصر کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا، ''عکسِ محمدی ﷺ قرآن کے آئینے میں'' (ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی/ حیاتِ محمد قرآن حکیم کے آئینے میں/ دار الاشاعت، کراچی ۲۰۰۶ء:ص ۷)

اس کتاب کا یہ سفر جاری رہا، ۱۹۷۰ میں کشفی صاحب تدریس کے سلسلے میں جاپان گئے تو وہاں پھر اس جذبۂ سیرت نگاری کو تحریک ہوئی اور اس کتابچے کو بڑھانے اور نئے انداز سے لکھنے کا خیال آیا اور کام شروع کردیا۔ اس کتاب کا پہلا مسودہ ۱۹۷۱ میں مکمل ہوچکا تھا، مگر اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آسکی، اور اشاعت التوا کا شکار ہوتی رہی، حتیٰ کہ ۱۹۹۰ء آگیا۔ ۱۹۹۰ء میں دادا بھائی فاؤنڈیشن کے تحت حیاتِ محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں پہلی بار شائع ہوئی۔

کشفی صاحب نے جب ''عکسِ محمدی'' سے سیرت نگاری کا آغاز کیا تو آپ کے ذہن میں سیرت طیبہ کو قرآن کریم کے آئینے میں پیش کرنے کے سلسلے میں ایک واضح خاکہ موجود تھا۔ اس سلسلے کی دوسری کتاب مقامِ محمد ﷺ کے ابتدایئے ''حرفِ اول'' کے تحت لکھتے ہیں:

> حمد اس ربّ العزت کے لئے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم عطا کیا اور اس سلسلے کو جاری رکھا، جس نے ہمیں تخلیق فرمایا اور بیان کی قوت عطا کی تاکہ یہ قوت وصلاحیت اس کے اور اس کے رسول ﷺ کے ذکر، قرآن حکیم کی تعلیمات کی اشاعت اور انسانی زندگی کی تعمیر کے لئے صرف کی جائے۔ (ایضاً)

الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے مصنف کی یہ خواہش پوری کی اور تینوں حصوں کی تکمیل وہ

اپنے قلم سے فرما گئے۔ البتہ تیسرا حصہ کتابی شکل میں آپ کے سامنے اشاعت پذیر نہ ہوسکا۔ یہ حصہ اب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے۔

''مقام محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں'' کی طرح موجودہ کتاب بھی ششماہی مجلّے السیرہ عالمی میں قسط وار شائع ہوچکی ہے، اس کی آخری قسط حسن اتفاق سے جناب کشفی رحمہ اللہ نے السیرہ میں اشاعت کے لئے اپنے انتقال سے چند روز قبل راقم کے حوالے کردی تھی۔ اس طرح یہ کتاب مصنف کے اپنے متعین کردہ خاکے کے مطابق مکمل شکل میں اشاعت کے لئے پیش کی جارہی ہے۔

سیرت طیبہ ﷺ کے حوالے سے اردو میں موجود بے مثال ذخیرے میں یہ کتاب اپنے سلسلۂ کتب کی دونوں جلدوں کے ساتھ نمایاں اور ممتاز ہے، جس کا بنیادی سبب مصنف علام کی محبت نبوی ﷺ، حلاوتِ ایمانی، سوز وگداز اور اخلاص کے ساتھ ساتھ مصنف کا مخصوص اسلوب اور پیرایۂ بیان ہے، جس کے سبب کسی تأمل کے بغیر کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اور سلسلۂ کتب تادیر زندہ و جاوید رہے گا۔

اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور مصنف، مرتب، ناشر اور امت مسلمہ کے لئے نافع اور سببِ شفاعت بنائے۔ آمین

سید عزیز الرحمٰن
ریجنل دعوۃ سینٹر (سندھ) کراچی
دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
۳ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ

اخلاق محمد ﷺ
قرآن حکیم کے آئینے میں

نبی کریم ﷺ کے بارے میں اللہ عزوجل نے فرمایا ہے:

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۱)

اور بے شک آپ (ﷺ) اخلاق کے اعلیٰ پیمانے اور مرتبے پر فائز ہیں۔

اس آیت کریمہ کی اہمیت وعظمت کی تفہیم کے لئے سورۃ القلم کی پہلی تین آیتوں کو سمجھنا اور ان کے پس منظر میں مرتبۂ محمد ﷺ اور آپ کے اخلاق عالیہ کاملہ پر غور کرنا مناسب ہوگا۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ ○ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ ○
وَاِنَّ لَکَ لَاَجْرًا غَیْرَ مَمْنُوْنٍ ○ (۲)

ن اور قلم کی قسم اور ان کے لکھنے والوں کے لکھنے کی کہ آپ اپنے رب کے فضل وکرم سے مجنون نہیں ہیں اور آپ کا اجر تو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

یہ آیات کریمہ مکہ معظمہ کے اس دور میں نازل ہوئیں جب نبی اکرم ﷺ کی دعوت

۱۔ القلم: ۴

۲۔ القلم: ۱تا۳

کی طرف لوگ متوجہ ہونے لگے تھے۔ حج کے موقع پر اطراف واکناف سے آنے والے زائروں کو قبول حق سے روکنے کے لئے قریش مکہ بھی استہزا کے ساتھ آپ کے نئے دین اور دعوت کا ذکران سے کرتے۔ قریش مکہ سرورِ کائنات کی بے داغ زندگی اور جو کلام آپ پیش کر رہے تھے، اس کی اس فصاحت سے بے حد پریشان اور خائف تھے، جس کی مثال انہیں کلام بشر میں نہیں ملتی تھی۔ عرب اپنی فصاحت و بلاغت اور شاعری پر بے حد نازاں تھے۔ کُن کے الفاظ میں عربوں کی ہر سانس شاعری سے عبارت تھی۔ وہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو گونگا سمجھتے تھے۔ ان کے سامنے جو کلام رسول اللہ ﷺ پیش کر رہے تھے اسے کوئی ایک نام دینے پر وہ اتفاق نہ کر سکے۔ یہی ان کی پریشان ذہنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش کردہ آیات کے کسی اور جہاں سے متعلق ہونے کا ثبوت تھا۔

کسی نے آپ کو ساحر کہا کہ آپ کا کلام دلوں کی دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔

کسی نے آپ کو مسحور کہا کہ اس کلام کا سرچشمہ کوئی عظیم جادو تھا جو آپ کے ہونٹوں سے بول رہا تھا۔ اور جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) مجنون کہنے لگے۔ لیکن آیات الٰہی کے سننے والے ان بے سروپا تہمتوں پر کان دھرنے کی جگہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ یہ تو کلام حکمت ہے اور اس میں جن اخلاقی اقدار اور تصورات حیات انسانی کو پیش کیا جا رہا ہے ان پر تو ایک نئے معاشرے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

ان آیات میں نظر بظاہر تو تخاطب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، لیکن حقیقی مخاطب قریش مکہ ہیں۔ نبی تو مسلم اول ہوتا ہے، اپنے پیغام پر اس کا یقین اتنا ہی مستحکم ہوتا ہے جتنی اس کی ذات۔ ذات کے استحکام کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس کلام کو برداشت کرنے کی قدرت پہاڑوں میں نہیں، اسے قلب رسالت برداشت کر سکتا ہے۔ نبی اس کبھی ختم نہ ہونے والے اجر سے بھی واقف ہوتا ہے جو اسے کارنبوت کے سلسلے میں آزمائشوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے، اور اس کے اخلاق عظیم کا اندازہ اسی بات سے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اس کی جان کے دشمن ہوتے ہیں، جو اس پر عرصۂ حیات تنگ کرنے کے لئے نت نئے ظلم ایجاد کرتے ہیں، وہ انہیں کی فلاح کی خاطر اپنی دعوت کو جاری

رکھتا ہے، اور انہیں کی اصلاح کی خاطر اپنے رب کے حضور دعائیں پیش کرتا ہے، راتوں کو جاگ کر اور آنسوؤں کو اپنی صداقت کا قاصد بنا کر۔

سورہ مبارکہ کا آغاز حرف ''ن'' سے ہوا ہے۔ یہ ایک رمز ہے، اللہ تعالیٰ اور رسول کے درمیان۔ ہم اس کے مفہوم کی تلاش میں زبان و بیان کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں اپنے آپ کو سرگرداں نہیں رکھتے اور اس ایمان کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں کہ یہ حرف راز اس مضمون سے پوری طرح وابستہ ہے۔ یہ کُن کے ن کی مثال ہے، جو تخلیق کائنات کا اشارہ ہے، کیونکہ نبوت کا ادارہ اور بالخصوص نبوت محمدی کائنات کی تکمیل ہے۔ صلی اللّٰہ علیٰ نبینا

قلم کی قسم سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ قلم سے مخلوق کی تقدیر لوح محفوظ پر لکھی گئی، قلم سے صحیفہ کائنات لکھا گیا، اور یہی قلم فرشتوں کے ہاتھ میں ہمارے اعمال لکھ رہا ہے، اور اسی قلم سے قرآن مجید لکھا جا رہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جیسا مفسر قرآن اور تلمیذ رسالت، رقم اعمال ہی کو ما یسطرون کا مفہوم سمجھتا ہے، اور بعضوں نے اس کو کتاب الٰہی کا لکھا جانا قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن یہ بات بھی تفسیر بالرائے کے دائرے میں نہیں آئے گی کہ ما یسطرون میں اعمال کا لکھا جانا بھی شامل ہے، قرآن حکیم کا لکھا جانا بھی اس کے دائرے میں داخل ہے، اور صحیفہ کائنات میں مسلسل اضافے کی عبارت بھی اس کے مفہوم سے باہر نہیں۔

ان شاء اللہ آگے چل کر ہم ان اخلاقی قدروں اور ان اخلاقی صفات پر گفتگو کریں گے، جن کی تجسیم ذات محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے، اور جو آپ کی زندگی اور سیرت کے حوالے سے عالم انسانیت کو عطا ہوئی ہیں۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ عام انسانوں کے اخلاق پر گفتگو کرتے ہوئے سیرت، جبلت، ماحول، موروثی اثرات اور تعلیم جیسے مسائل و مباحث پر نظر ڈالنا ضروری اور ناگزیر ہوگا لیکن انبیائے کرام اور بالخصوص سرور کائنات ﷺ کے اخلاق عالیہ کے سلسلے میں یہ نکتہ بنیادی ہے کہ ان کا اخلاق عطیہ ربانی ہے، جو ان کی زندگی کی آزمائشوں اور واقعات کے پس منظر میں ابھر کر انسانوں کے سامنے آتا چلا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری رسول ہیں، اس لئے آپ کی سیرت ہر دور کے انسانوں کے لئے کامل

ترین نمونہ ہے، اور اسی لئے اس آئینے کی قوت انعکاس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہے۔

قرآن مجید کے تدریجی نزول کے بنیادی اسباب سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ تیئیس سال کے عرصے میں ہر زمانے کے امکانی واقعات وحوادث زمانہ رسالت میں سمٹ کر سامنے آ گئے اور اہل ایمان کے لئے ہر دور میں آپ کے اخلاق اور آپ کی سیرت نمونہ بن گئے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب سوال کیا گیا کہ ہمیں اخلاق وسیرت محمدی کے بارے میں کچھ بتایئے تو ان کا یہ مختصر جملہ سیرت رسول آخر الزماں ﷺ کا جامع ترین، مانع ترین بیان بن کر حافظۂ تاریخ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگیا:

کَان خلقه القُرآن (۳)

آپ کا اخلاق قرآن تھا۔

اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں اور اسی صحت کے ساتھ قرآن آپ کا اخلاق تھا۔

اخلاق کا اظہار معاشرے میں عمل، تعامل اور ردعمل کے ذریعے ہوتا ہے، دوسرے کے ساتھ ہمارے تعلقات اور معاملات سے جو صورت حال ابھرتی ہے، اسی کے آئینے میں کسی کے اخلاقی خدوخال دیکھے جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کی چالیس سالہ حیاتِ قبل نبوت اور نبوت کے تیئیس برسوں کے واقعات میں حد درجہ تنوع ہے۔ حیات انسانی کے یہ مواقع کس کی زندگی میں، آپ کی حیات طیبہ کے سوا نظر آتے ہیں اور ان تمام مراحل میں آپ کا طرز عمل اعلیٰ ترین اخلاق کو پیش کرتا ہے اور انسانوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ بچپن ہی سے آپ کی زندگی میں انسانوں کے لئے قائم رہنے والے سبق ہیں۔ دور رضاعت میں آپ نے اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے حقوق کا احترام کیا۔ آپ کے چار رضاعی بھائی اور بہن تھے، ان میں سے دو آگے چل کر مسلمان ہو گئے تھے، عبداللہ اور شیما۔ ان کے اسلام قبول کرنے کے محرکات میں سرکار دو عالم کا بچپن اور اس عہد میں آپ کی پاکیزہ عادات کی یاد اور ان کا گہرا نقش بھی شامل ہے۔ واقعہ شق صدر اس وقت پیش آیا جب آپ ﷺ کی عمر تین سال اور پانچ سال کے

۳۔ ابن سعد/ الطبقات الکبریٰ۔ بیروت، دار احیاء التراث العربی ۱۹۹۶ء: ج ۱، ص ۱۷۵

درمیان تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو آپ کے نبی ہونے کا علم تھا تو پھر آپ کے قلب اطہر میں وہ لوتھڑا کیوں رکھا گیا جو شیطان کا حصہ تھا۔ اس کا جواب فوراً ذہن میں یہ آتا ہے کہ آپ کی خلقت تمام انسانوں کی طرح تھی اور آپ کی نبوت اور گناہوں سے آپ کی عصمت اور آپ کا معصوم ہونا عطیۂ خداوندی اور حصہ نبوت تھا۔

ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے آپ نے لغو، لہو اور لعب سے ہمیشہ پرہیز کیا۔ آپ کا طرز کلام دوسروں کے لئے آدابِ گفتگو کا ایک مکتب تھا۔ جناب ابو طالب اور جناب زبیر کی کفالت کے دور میں آپ کا طرز عمل مثالی تھا۔ یتیم بچے عام طور پر گہرے احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں، لیکن حضرت محمد ﷺ کا دامنِ صفات محرومی اور کم تری کے شائبے سے بھی محفوظ رکھا، بلکہ آپ نے آنے والے ہر دور کو یتیم کی عزت کا سبق دیا اور قرآن حکیم کے صفحات یتیم کے ساتھ حسن سلوک کے سبق سے جگمگا رہے ہیں۔ یہ اس دُرِ یتیم کا انسانیت پر احسان ہے۔ آپ کی یتیمی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آپ کو خاتم النبین بنا کر بھیجنے والے نے ہر دنیاوی سہارے سے آپ کو محفوظ اور بالاتر بنا کر بھیجا۔

آپ اپنی پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے درجے پر فائز ہو چکے تھے، اگرچہ اس بات کا علم آپ ﷺ کو بھی اس وقت تک نہیں تھا جب سن ۴۰ محمدی میں جبریل امین آپ تک اللہ کا آخری پیغام لے کر نہیں آئے۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ (۴)

رسالت کا مرتبہ انسان اپنی عبادت وریاضت اور کسی اور مشقت کی بنا پر حاصل نہیں کرتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا انتخاب اور انعام ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس بار گراں کے اٹھانے کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور اس کی پرورش، تربیت اور ارتقا منشائے الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اس حقیقت کو بار بار پیش فرماتا ہے۔ حصول نبوت سے پہلے نبی کو بھی اس کا علم نہیں ہوتا کہ اس کا رب اسے کس امانت عظیم اور مرتبہ فلک مرتبہ سے نوازنے جا رہا ہے، اگرچہ نبوت سے پہلے اسے رویائے صادقہ سے نوازا جاتا ہے اور کائنات کے مناظر، چیزیں اس کے سامنے رب

۴۔ العلق:۱

کائنات کے حکم سے اپنے اسرار کھولنے لگتی ہیں۔ قبل رسالت، رسولوں کی زندگی عام انسانوں کی طرح گزرتی ہے۔ وہی رشتے ناتے، وہی لوگوں سے معاملات، ویسے ہی دوستیاں اور تعلقات لیکن اس کے ساتھی بھی اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ اس کی زبان، نبوت سے پہلے بھی فحش اور لغو باتوں سے پاک تھی، لوگوں سے اس کے تعلق کی دنیا خیر خواہی کے سوا کچھ نہ تھی، وہ دوستوں اور دوسروں کو بھلائی کا حکم دیتا تھا۔ کفار اس واضح فرق کو نہیں دیکھ پاتے، اور اسی لئے اعلان نبوت کے بعد بھی ہمیشہ نشانیوں اور معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس حقیقت تک پہنچ نہیں پاتے یا پہنچنا نہیں چاہتے کہ رسول کوئی نشانی اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر پیش نہیں کر سکتا، کیونکہ رسول اسی لئے آتا ہے کہ لوگوں کی زندگی کا رخ رب کائنات کی طرف موڑ دے۔

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجاً وَّ ذُرِّیَّةً ؕ
وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ یَّاْتِیَ بِاٰیَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۵)

اور بے شک ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور انہیں بیوی بچوں والا بنایا، اور کسی رسول میں یہ طاقت نہیں تھی کہ وہ اللہ کے حکم اور اذن کے بغیر کوئی نشانی اور آیت دکھائے۔

اللہ تعالیٰ جن منتخب اور برگزیدہ ہستیوں کو نبوت کے لئے منتخب فرماتا ہے، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس کے ازلی وابدی کمپیوٹر میں فیڈ (Feed) ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون وفرعونیت سے انسانیت کو نجات دلائی تھی، اللہ تعالیٰ نے فرعون کے محل میں ان کی پرورش اور تربیت کے مواقع فراہم کر دیئے تاکہ انہیں آداب واسرار ملوکیت اور خدا بننے والے شہنشاہ کی تمام نفسیاتی کیفیتوں کا علم ہو سکے۔ اپنے عہد اور ہر عہد کو بدل دینے والے رسول کو اس نے نظر بظاہر ہر دنیوی سہارے سے محروم رکھا، تاکہ دنیا پر اور آپ ﷺ کے بدترین دشمنوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ رسول کی حفاظت اس کے رب کے ذمے ہے، اور وہ اس کے لئے کافی ہے۔

رسالت کا انتخاب صرف اللہ کے ذمے ہے، وہ جسے اپنے پیغام سے سرفراز فرمانا چاہتا ہے اسے اس منصب کو اٹھانے کا ظرف عطا کرتا ہے، یہ حقیقت قرآن کریم میں پوری طرح کھول

۵۔ الرعد: ۳۸

کر بیان کی گئی ہے

مَا كَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰى مَا اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰى یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَیْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (۶)

اللہ مومنوں کو اس حال میں ہرگز نہیں رہنے دے گا، جو اس وقت تمہاری حالت ہے۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاکوں سے الگ کر کے رہے گا، لیکن اللہ تعالیٰ کا طریق کار نہیں کہ وہ تم کو غیب پر مطلع کرے۔ وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے غیب کی باتیں بتانے کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

ہم نے اس آیت عظیمہ کو اس کے پھیلاؤ اور معانی کی وسعت کی وجہ سے بچ مانا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت اور طریق کار کو واضح کرتی ہے۔ مومنوں کو اللہ اس حال میں نہیں رہنے دے گا کہ منافق ان میں گھلے ملے رہیں اور فتنے جگاتے رہیں۔ منافقوں کے دلوں کا چھپا ہوا نفاق غیب کی بات ہے، جس سے صرف اللہ تعالیٰ حتمی طور پر واقف ہوتا ہے، لیکن وہ اپنے رسولوں میں سے جن کو منتخب کرتا ہے اُن پر منافقوں کے نفاق اور بعض دوسرے امور غیب کو آشکار فرما دیتا ہے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کے کئی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ امورِ غیب سے آپ کو جب مناسب سمجھتا مطلع فرما دیتا۔ مثلاً یثرب کی طرف ہجرت کرتے وقت راستے میں سراقہ بن مالک کا تعاقب کرنا، اس کے گھوڑے کا دوبار گرنا، اسے یقین ہو گیا کہ وہ سرور کائنات ﷺ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آخر اس نے رسول اللہ کو سامان سفر اور کھانے کی چیزوں کی پیش کش کی، جو آپ نے قبول نہیں کی اور صرف یہ وعدہ لیا کہ ہماری راز داری کرنا اور مخبری نہ کرنا۔ اس وقت زبانِ رسالت نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں ایران کی فتح کے بعد جب کسریٰ کے کنگن مال غنیمت میں آئے تو حضرت فاروق اعظمؓ نے وہ کنگن سراقہ کو دے دیئے۔

۶۔ آل عمران: ۱۷۹

غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کھودتے ہوئے ایک سخت چٹان ایسی آ گئی کہ صحابہ کرام کی کدالیں اس پر پڑ کر اُچٹ جاتیں۔ صحابۂ کرام نے سرورِ کائنات ﷺ کو اطلاع دی، آپ تشریف لائے، آپ نے اس پر اپنے رب کا نام لے کر اس چٹان پر ضرب لگائی۔ چٹان کے پتھر کی چنگاریاں فضا میں اُڑیں اور اس کا ایک بڑا ٹکڑا الگ ہو گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اکبر! اللہ تعالیٰ نے مجھے ملک شام کی کنجیاں عطا فرما دیں اور میں شام کے سرخ محلات کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر آپ ﷺ نے اللہ اکبر کہہ کر اس چٹان کو دوسری ضرب لگائی، پتھر کی چنگاریاں منتشر ہو گئیں اور زبانِ رسالت سے یہ بات ادا ہوئی کہ اللہ اکبر! ملک فارس میرے سپرد کر دیا گیا اور اس وقت (ان چنگاریوں میں) مدائن کا قصرِ ابیض دیکھ رہا ہوں۔ اور جب رسول اللہ ﷺ نے تیسری ضرب لگائی تو چٹان پاش پاش ہو گئی۔ اس سے نکلنے والی چنگاریوں نے فضا کو روشن کر دیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ اکبر! مجھے یمن کی کنجیاں عطا کی گئی ہیں۔ میں اس وقت صنعاء کے پھاٹک کو (کھلا ہوا) دیکھ رہا ہوں۔

اس آیت سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ نبوت اللہ کا انعام اور انسانوں کے لئے بلند ترین انعام ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس نکتے کو بھی واضح فرما دیا گیا کہ انبیاء کے مقامات اور مرتبے میں بھی فرق ہوتا ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۷)

یہ ہمارے رسول ہیں جن میں ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔

نبوت کی ماہیت سے بے خبر کفار نے ہمیشہ اپنے رسولوں کا تمسخر اڑایا۔ مادیت میں ڈوبے ہوئے یہ لوگ دولت دنیا ہی کو ہر اعزاز کی بنیاد سمجھتے تھے اور اسی لئے رسالت کو بھی اپنا حق جانتے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت اور اندازِ فکر کو قرآن حکیم نے اس طرح پیش فرمایا ہے:

وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَاۤ اُوْتِىَ رُسُلُ اللّٰهِ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (۸)

۷۔ البقرہ: ۲۵۳

۸۔ انعام: ۱۲۴

اور جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، جب تک ہم کو بھی کوئی ایسی چیز (رسالت، پیغامِ الٰہی) نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے۔

رسالت کے مرتبے کا ذکر رسولوں کو مخاطب بھی کر کے کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَ بِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَ كُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (۹)

(ہم نے موسیٰ سے فرمایا) اے موسیٰ! میں نے دوسرے انسانوں پر تمہیں اپنی رسالت عطا فرما کر اور تم کو اپنے کلام سے سرفراز فرما کر امتیاز (اور برتری) دیا ہے۔ پس میں نے جو کچھ (اپنی آیات اور اپنی وحی سے) عطا کیا ہے اس کو لے لو اور شکر گزاروں میں شامل ہو جاؤ۔

کلامِ الٰہی کا اعجاز یہ ہے کہ چند لفظوں میں رسالت کے مرتبے، وحی کو اپنے ذہن اور کردار کا حصہ بنانے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کا فریضہ، اور اس امتیاز پر اپنی شکر گزاری کے اظہار کے مضامین کو بیان کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت اس لئے عطا فرمائی کہ وہ بنی اسرائیل کو ہدایت فرمائیں، اور اپنی ہم کلامی سے انہیں انتہائی یقین عطا کیا ہے، اور ان انعامات پر شکر بجانے کا حکم بھی اپنے رسول اور اس کے متبعین کی ہدایت کا وسیلہ ہے۔

رسلِ عظام علیہم السلام پر وحی کئی طریقوں سے نازل فرمائی گئی، کبھی کلام کے ذریعے، کبھی رسول کے قلبِ مطہر پر وحی نازل فرمائی گئی، کبھی گھنٹیوں کی آوازوں کی سی آواز گونجتی، اور اکثر حضرت جبریل وحی لے کر تشریف لاتے۔ یہ بھی فرشتوں میں جبریل امین کا امتیاز ہے اور اس امتیاز کے لئے فرشتوں میں سے اللہ جل جلالہ نے حضرت جبریل کا انتخاب فرمایا:

اَللّٰهُ يَصْطَفِىْ مِنَ الْمَلٰۤئِكَةِ رُسُلًا وَّ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ

۹۔ الاعراف: ۱۴۴

بَصِیۡرٌ O (۱۰)

اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے اپنی رسالت اور پیغام پہنچانے والوں کو چن لیتا ہے، بے شک اللہ سمیع اور بصیر ہے۔

قرآن حکیم کی ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ برگزیدہ بندوں ہی کو نبوت عطا کی جاتی ہے جو اس منصب عالی کے لئے چن لئے جاتے ہیں۔ اللہ جل جلالہ اسی غرض سے ان کی تخلیق کرتا ہے۔ کسی چیز کو بنانا تخلیق ہے اس مسئلہ تخلیق کی اہمیت کو کسی حد تک سمجھ لینا ہمارے لئے ضروری ہے۔ عمل تخلیق میں اندازہ اور ظرف کا ناپنا اور امکانات کا جائزہ لینا بھی شامل ہے، یہی امکانات اور ان کا پورا ہونا کسی چیز کی تقدیر کہلاتا ہے۔

اسی مادہ (خ ل ق) سے مشتق ایک لفظ اردو میں مستعمل ہے۔ خلیق، کسی با اخلاق اور خوش نفس آدمی کو، جسے دیکھ کر زندگی کی خوش گواری کا اعتبار آئے، ہم خلیق کہتے ہیں۔ خَلق (مخلوق، تخلیق) اور خُلق (اخلاق، خلیق) یہ الفاظ ایک ہی مادہ خ ل ق سے ہیں۔ یوں خُلق کا مفہوم ہوا طبعی عادت۔ وہ عادت یا عادات جس میں استمرار ہو، جو تبدیلی سے بالاتر ہوں، اسی لئے نبی اکرم ﷺ کے لئے فرمایا گیا:

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ (۱۱)

انسان اور دوسری مخلوقات کی عادات اور فطری تقاضوں کے لئے عربی زبان میں کئی الفاظ ہیں۔ ان میں سے دو لفظ قرآن حکیم میں بھی استعمال کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک تو سیرت ہے:

قَالَ خُذۡهَا وَ لَا تَخَفۡ سَنُعِیۡدُهَا سِیۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰی (۱۲)

(اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے) فرمایا اسے پکڑ لو اور خوف نہ کرو۔ ہم اسے اس کی پہلی صورت میں دوبارہ لوٹا دیں گے۔

۱۰۔ الحج: ۷۵

۱۱۔ القلم: ۴

۱۲۔ طٰہٰ: ۲۱

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں عصا دیکھ کر رب العزت نے دریافت کیا کہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ یہ میری لاٹھی ہے، جس سے میں ٹیک لگاتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں اور اس سے مجھے دوسرے فائدے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اسے زمین پر ڈال دو۔ زمین پر ڈالنا تھا کہ لاٹھی سانپ بن کر دوڑنے لگی۔ اس پر رب موسیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ڈرو نہیں، ہم اسے پہلی صورت میں لوٹا دیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق انسان کی طبعی خصوصیت یا خصوصیات کا نام ہے اور سیرت، روش، طور طریقے اور چال ڈھال کو کہتے ہیں۔ لاٹھی کی پہلی سیرت اس کا لاٹھی ہونا ہے۔ پھر سیرت کی تشکیل، موروثی اثرات، ماحول اور تعلیم کے عناصر سے ہوتی ہے۔ ان خصوصیات کا تناسب مختلف افراد میں مختلف ہوسکتا ہے۔ کسی انسان کی سیرت کی تشکیل میں کون سا عنصر غالب ہوگا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

ایک اور لفظ جبلت بھی آج نفسیات میں حد درجہ مستعمل ہے۔ یہ انگریزی اصطلاح Instinct کے مترادف ہے۔ جبلت سے مراد انسان یا دوسری مخلوقات کی وہ خصوصیات، ضرورتیں، عادتیں اور خصائص ہیں جن پر انہیں کوئی اختیار نہ ہو، جیسے لفظ جنس، جنسی ضرورت، بھوک، پیاس وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں جبلت کا لفظ مخلوق کے لئے استعمال ہوا ہے۔

وَاتَّقُوا الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الۡجِبِلَّةَ الۡاَوَّلِیۡنَ O (۱۳)

اس اللہ (اور خالق حقیقی) کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں اور اگلی مخلوق کو پیدا کیا۔

قرآن حکیم کے احکام اور عمومی تعلیم سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے بھی تمام مخلوقات سے الگ اور مختلف ہے۔ جانوروں کو دیکھئے ان کے جنسی ملاپ کے لئے قدرت نے سال کا کوئی حصہ مقرر کردیا ہے، جس میں وہ اپنی جنسی خواہش

۱۳۔ الشعراء: ۱۸۴

کی تکمیل کرتے ہیں اور جسے Meeting Season کہا جاتا ہے۔ اس زمانے میں اعلیٰ نسل کی کتیوں کے مالک انہیں گلی کے کتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنی جبلت کے تحت ہر قید و بند کو توڑنے پر آمادہ ہوتی ہیں۔ اختلاط کے اسی زمانے میں آپ بلوں کی آؤ کی آوازیں بلکہ پکار کو سنتے ہیں، جس کو سن کر بلیاں ان تک پہنچ جاتی ہیں۔

انسان اللہ کی مخلوق ہے جسے شعور، اخلاقی حس، ضبط نفس اور اپنی جبلت پر قابو پانے اور اسے دائرہ انسانیت میں رکھنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ آج دین سے دوری کی وجہ سے بیشتر انسان اور مسلمان بھی اس اختیار سے باخبر نہیں اور وہ حیوانوں کی طرح اپنی جبلی خواہشوں کی تکمیل کے لئے گھناؤنے جرائم کے مرتکب ہو جاتے ہیں، روزانہ ہمیں اخبارات میں جو خبریں نظر آتی ہیں ان کو دیکھ کر شرف انسانیت پر یقین متزلزل ہو جاتا ہے۔ لاہور کا وہ واقعہ تو ذہنوں سے مٹنے والا نہیں جب ایک آدمی نے سو سے زیادہ بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ ہر دن معصوم بچیوں کے ساتھ زیادتی کے واقعات اس کثرت سے ہمارے سامنے آ رہے ہیں کہ دل لرز اٹھتا ہے۔ کئی بچیاں تو دو سال کی عمر سے بھی کم ہوتی ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت کھانے میں حلال حرام کا لحاظ نہیں رکھتی اور جو لوگ اپنے آپ کو دین سے بھی وابستہ رکھنا چاہتے ہیں وہ بھی غیر ذبیحہ گوشت کے لئے کیسے کیسے شرعی جواز تلاش کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبوی کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمان کس طرح اپنے اختیار، ارادے، شعور اور تربیت کے ذریعے حیوانی جبلت پر غالب آ جاتا ہے۔ جب جان پر بنی ہو تو حرام چیز حلال ہو جاتی ہے، مگر اسی حد تک کہ جسم و جان کا رشتہ قائم رہے۔ یہ جبلت پر شعور اور ایمان کی فتح ہے۔

ایک اور لفظ جو کہ نہایت درجہ استعمال ہونے والے ان الفاظ میں شامل ہے وہ کردار ہے، جو سیرت، شخصیت اور عادات و اطوار اور سیرت کے لئے استعمال ہوتا ہے، مگر اس سلسلے میں مختلف تصورات اور الوان معانی (Meaning Shades) کا احاطہ کرتے ہوئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک ڈھیلا ڈھالا (Loose) لفظ یا اصطلاح ہے، اس کے پھیلاؤ کا

اندازہ ذیل کی مثالوں سے کیجئے۔

۱۔ اس ڈرامے میں اس نے بوڑھے کا کردار انجام دیا ہے۔

۲۔ اس لڑکی کا کردار اچھا نہیں ہے (محدود اور مخصوص استعمال۔ کسی فرد کے جنسی طرز زیست کے اظہار کے لئے۔ کوئی اور عادت یا سیرت کا پہلو شامل نہیں)۔

۳۔ تاریخ عالم میں مسلمانوں نے علوم و فنون کی اشاعت اور ترویج کے سلسلے میں جو کردار انجام دیا ہے، وہ تہذیب انسانی کی تاریخ کا سنہری باب ہے۔

۴۔ مولانا محمد علی جوہر کے کردار میں منافقت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

قرآن کریم نے سیرت، کردار، شخصیت اور ایسے ہی کسی لفظ کی جگہ کی نبیٔ اکرم ﷺ کے مجموعی فضائل و خصائص کے لئے ''خُلق'' (اخلاق) کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اخلاق جو آپ کی ذات اور وجود کا احاطہ کر لیتا ہے اور پھر ارشاد ہوا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا
اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًاؕ (۱۴)

یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ (ﷺ) میں عمدہ نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ (پر یقین) اور یوم آخرت کی توقع رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے (فی رسول اللہ)۔ اس ربانی ابلاغ اور اظہار کی ہمہ گیری، گہرائی اور فصاحت کو تو ہم فانی انسان پوری طرح سمجھ بھی نہیں سکتے۔ پھر اس بات کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ وہ کون لوگ ہیں جن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں عمدہ نمونہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور یوم آخر پر پورا یقین رکھتے ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اسی دنیا کے لئے نہیں ہے بلکہ آخرت کے اجر و ثواب اور ابدی زندگی کا انحصار اسی پر ہے، اور اتباع رسول کریم ﷺ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسا انسان کسی لمحے اپنے رب کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔

۱۴۔ الاحزاب: ۲۱

عام طور پر آج یہ کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک رسول کی حیثیت اور ایک بشر کی حیثیت۔ سنت کے دائرے میں وہ باتیں آتی ہیں جو آپ نے رسول کی حیثیت سے کیں، یا کہیں اور جن کا حکم ہمیں اللہ کے رسول کی حیثیت سے دیا۔ ان کی تقلید ہم پر واجب ہے، لیکن جو باتیں طبعی ہیں اور ہر انسان ان کے کرنے پر مجبور ہے وہ سنت کے دائرے میں نہیں آتیں۔ ایسی باتیں کہنے والے نہ محبت اور محبوبیت سے واقف ہیں اور نہ رسول کے دائرہ کار سے۔ رسول تو زندگی کے ہر شعبے میں توازن، حسن اور نفاست پیدا کرنے آتا ہے، اور وہ زندگی کا کون سا عمل ہے جسے خوبصورت اور متوازن بنانے کی ضرورت نہ ہو۔ آدمی حیوانوں کی طرح غٹ غٹ کر کے ایک سانس میں رکے بغیر اپنی پیاس بجھا سکتا ہے اور وہی آدمی سنت رسول کا اتباع کرتے ہوئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے پانی پینے کا آغاز کرسکتا ہے۔ لوگوں سے ملاقات ہو، یا گھر میں داخل ہوتے ہوئے اہل خانہ کے لئے دعائے خیر و برکت ہو، کسی محفل میں آدابِ نشست و برخاست ہوں، یا کسی مہمان کی پذیرائی، کسی تقریب مسرت میں شرکت ہو یا کسی جنازے میں حاضری، لباس کا انتخاب ہو یا لباس پہننے کے آداب، کسی کو شادی اور کسی کامیابی پر مبارک باد دینے کا موقع ہو یا کسی مریض کی عیادت، کسی آدمی سے گفتگو ہو یا کسی جلسے میں خطاب۔ غرض کہ زندگی کا کوئی بھی مرحلہ ہو، کوئی بھی تقریب ہو یا کوئی بھی موقع ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انداز زیست، آپ کی سنت کریمہ کہاں ہماری رفاقت نہیں کرتی۔ اور رہا ضروریاتِ دین اور عبادات کا مسئلہ تو اس میں آپ کے اتباع کے بارے میں کسی کو کوئی اختلاف نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا کوئی پیشہ ہو۔ آپ تاجر ہوں یا سپاہی، آپ سیاست دان ہوں یا سفارت کار، آپ مبلغ ہوں یا مختلف اہم مسائل میں لوگوں کے مشیر، آپ معلم ہوں یا کسی انجمن اور ادارے کے سربراہ، آپ عبادت، ریاضت میں مصروف رہتے ہوں یا معاشی سرگرمیوں میں اپنا وقت گزارتے ہوں۔ ہر شعبہ زندگی میں ہادیٔ اعظم ﷺ کے نقوش قدم آپ کی رہنمائی کریں گے۔ آپ کسی ایسے ملک میں قیام پذیر ہوں جہاں مسلمان ہونے کی پاداش میں آپ پر ظلم کئے جاتے ہوں یا کسی ایسے ملک کے شہری ہوں جہاں مسلمان برسراقتدار

ہوں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ ہر جگہ اور ہر قدم پر آپ کی رہنمائی کرے گا۔

زندگی کے ساتھ زندگی کی سرگرمیاں بھی جاری رہتی ہیں۔ زندگی کی ان سرگرمیوں اور ہنگاموں کا رشتہ معاشرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر انسانی عمل انسانوں کے درمیان ہی وجود میں آتا ہے۔ زندگی اسی تعامل (Interaction) کا نام ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ہر میدان، ہر شعبۂ حیات اور انسانی سرگرمیوں کے ہر عمل میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ آپ ﷺ کی یتیمی کے سبب اللہ تعالیٰ نے یتیموں کو تکریم عطا فرمائی اور یہ نکتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے واضح ہوگیا کہ یتیمی کے بوجھ اور غم سے انسان دنیوی سہاروں سے نجات نہیں پاتا بلکہ اللہ کے رحم سے۔ اللہ کا رحم جو اس کے احکام کی صورت میں اہل ایمان کی زندگیوں کو روشن کرتا ہے اور وہ یتیموں کے لئے سائبان بن جاتے ہیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یتیمی نے حضرت عبدالمطلب، حضرت ابو طالب اور حضرت زبیر کی شخصیتوں میں چھپی ہوئی محبت کو ابھارا، اور بعد میں یہ شفقت اسلامی معاشرے کی پہچان بن گئی۔ اور یہ حقیقت ہمیشہ کے لئے حرف اعتبار بن گئی، کہ تمہارے گھروں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جہاں کسی یتیم کی پرورش شفقت اور محبت کے سائے میں ہو رہی ہو۔

اس یتیم بچے کے اخلاق کریمانہ کے اظہار کا سلسلہ اس کے شعور سے پہلے ہی شروع ہوگیا کیونکہ نبی پیدا ہوا تھا، اگرچہ اس کو مستقبل میں اپنی نبوت کا احساس و ادراک نہ تھا۔ حضور ﷺ نے جو پہلی رات حلیمہ سعدیہ کے خیمے میں گزاری، اس رات ہی میں سعدیہ حلیمہ کے جسم میں دودھ کا چشمہ ابل پڑا۔ ننھے محمد (ﷺ) نے بھی سیر ہو کر پیا اور اپنے رضاعی بھائی کے لئے اس کا حصہ چھوڑ دیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور اخلاق کریمانہ کی بنیاد ہی حقوق و فرائض کی ادائیگی پر ہے۔ اپنا فرض ادا کرنا اور دوسرے کے حق کی پاسداری۔ یہی اخلاق ہے۔ حضور ﷺ اپنے بچپن میں بھی اپنے رضاعی بھائی بہنوں کے لئے ایثار سے کام لیتے، محبت کا برتاؤ کرتے، معصوم شرارتوں کے علاوہ کسی ایسی بات کے مرتکب نہ ہوتے جس میں ایذا رسانی اور دوسروں کی تکلیف کا پہلو ہوتا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا لڑکپن جب نوعمری کی دہلیز پر قدم رکھنے لگا تو آپ کے

اخلاق کے روشن پہلوؤں سے آپ کا ماحول جگمگانے لگا۔ آپ ﷺ جب عمر کے پندرھویں یا سولھویں سال میں تھے تو جنگ فجار کا واقعہ پیش آیا۔ اس جنگ میں محمد ﷺ بھی شریک ہوئے مگر آپ کی شرکت کی شان بھی عجب تھی، آپ نے نہ تو تلوار اٹھائی، نہ تیر چلایا، نہ کسی سینے کو نیزے سے چھلنی کیا، بلکہ تیر اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے رہے۔ اس جنگ کا آپ ﷺ پر گہرا اثر پڑا۔ آپ کو اس بات کا بہت دکھ تھا کہ اس جنگ میں محترم مہینوں کی حرمت خون آلود ہوئی، اور حرم کی حرمت مجروح ہوئی۔ اس جنگ کے بعد بہت سے لوگ مستقبل میں ایسی جنگوں کے سد باب کے بارے میں غور کرنے لگے۔ نوجوانوں میں حضرت محمد ﷺ اپنے ہم عمروں کے قائد کا درجہ رکھتے تھے۔ جب شہر امن کے یہ سارے لوگ عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور انہوں نے یہ عہد کیا کہ وہ بلد امین میں ہر مظلوم کی حمایت کریں گے، خواہ وہ کسی بھی قبیلے کا ہو اور کہیں سے آیا ہوا ہو۔ اس معاہدے کو حلف الفضول کہتے ہیں اور رسالت کے شرف سے مشرف ہونے کے بعد بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس معاہدے میں شریک ہونے پر خوشی کا اظہار فرماتے تھے۔ یہ واقعہ حرم کعبہ میں حجر اسود نصب کرنے کے واقعے کی طرح آپ کی رسالت کے ایک طائر پیش رس کا درجہ رکھتا ہے۔

اپنے خاندان والوں سے تعاون اخلاق کی ایک اہم دفعہ ہے، اور خاص طور پر جب اس کا تعلق اقتصادیات اور حصول رزق حلال سے ہو۔ رزق حلال ہمیشہ محنت اور مشقت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس سے اخلاق کی تلوار پر دھار لگتی ہے اور اخلاق ہر ترغیب کا مقابلہ کرنے کے لائق بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں رزق حلال کے لئے یہ محنت لڑکپن ہی سے شامل ہوگئی۔ اول اول تو خاندان والوں کی خاطر، اور پھر اسی مشقت نے آپ میں وہ صبر اور استقلال پیدا کیا جو بار نبوت اٹھانے کے لئے لازم تھا۔ بچپن میں آپ نے بنی سعد کی بکریاں چرائیں۔ اس پیشے اور نبوت میں عجب رشتہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے عصا کے بارے میں اپنے رب سے کہا تھا کہ میں اس سے ٹیک لگاتا ہوں اور اپنی بکریوں کے لئے درخت سے پتے جھاڑتا ہوں۔ بھیڑ بکریوں کو چرانے سے طبیعت میں صبر اور ضبط کا مادہ بڑھتا ہے۔ انبیاء جب پیغام الٰہی اپنی قوموں کو پہنچاتے تھے تو ان کا رویہ بھی بھیڑ بکریوں کا سا ہوتا۔

وہ عقل وشعور سے کام نہیں لیتے تھے تقلید آبا چوپایوں کی طرح کرتے۔ جدھر پہلی بھیڑ نے رخ کیا دوسری بھیڑیں بھی اسی راہ پر ہولیں۔

صبر کی پرداخت کے علاوہ مویشی چرانے کا پیشہ آدمی میں تفکر کا مادہ بھی پیدا کرتا ہے۔ جنگلوں کی وسعتوں میں کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہوا چرواہا مویشیوں کی عادات واطوار کا مشاہدہ کرتا ہے، ان کے افادے اور مختلف استعمالوں پر غور کرتا ہے، اور خاموشی کی دنیا میں اپنی ذات، اس کائنات اور اس کے پیدا کرنے والے سے متعلق سوالات اس کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ مویشی جنہیں انسان ناقابل توجہ سمجھتا ہے وہ بھی تفکر کا دروازہ انسان پر کھول دیتے ہیں۔ یہ مویشی اور دوسرے جانور بھی اسے اپنی طرح تخلیق کے سلسلے کی کڑیاں معلوم ہونے لگتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو، مویشیوں، دوسرے جانوروں اور دوسری مخلوقات کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھنے لگتا ہے اور اس پر عالم اور مخلوقات کی وحدت کا راز فاش ہو جاتا ہے۔ ہم سب کس طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ ہمارے اور انعام ودواب کے رزق کے سرچشمے بھی ایک ہیں۔ یہ نباتات جو اللہ نے تخلیق فرمائی ہیں ماحول میں توازن ہی پیدا نہیں کرتیں بلکہ ہماری غذائی ضروریات کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔

اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِہٖ
نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا یَاْکُلُ النَّاسُ وَ الْاَنْعَامُ (۱۵)

پس دنیا کی زندگی تو ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے بارش نازل کی اور اس سے زمین کی نباتات (اگائیں) جن کو انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔

اور دیکھئے:

اَوَ لَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِہٖ
زَرْعًا تَاْکُلُ مِنْہُ اَنْعَامُھُمْ وَ اَنْفُسُھُمْ ط اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ O (۱۶)

۱۵۔ یونس: ۲۴

۱۶۔ السجدہ: ۲۷

کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم پانی کو بنجر زمین کی طرف بہا کر لے جاتے ہیں اور پھر اس سے کھیتیاں نکالتے ہیں جس (کی پیداوار) سے ان کے چوپائے اور یہ خود کھاتے ہیں۔

اور بات نباتاتی غذا تک محدود نہیں، بلکہ یہ مویشی بھی تمہارے لئے ایک اہم غذائی ضرورت کو مشروب خالص کی صورت میں پورا کرتے ہیں۔ یہ تمہیں دودھ دیتے ہیں جس کے غذائی عناصر کی اہمیت آج کے انسان پر سائنسی علم نے پوری طرح منکشف کردی ہے۔ تمہارے یہ مویشی تمہارے لئے سبق آموزی اور عبرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ عبرت کا لفظ بہت وسیع معانی اور مفاہیم رکھتا ہے۔ اس کا ایک واضح مفہوم ہے کہ اشیا و حقائق اور حیات و کائنات کے مشاہدے اور مطالعے سے اشیا کی غرض و غایت کو جان لینا۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو اللہ کی قدرت کے مظاہر سے عبرت حاصل کرنے کی بار بار تعلیم دی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

وَ اِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ O (۱۷)

تمہارے لئے چوپایوں میں بھی (شکر گزاری) کے لئے بڑی عبرت ہے کہ ہم تمہیں ان کے پیٹ میں جو کچھ ہے اس میں سے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں، جو آسانی سے پیا جاتا ہے اور جزو بدن بن جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ مویشیوں میں تمہارے لئے اور بہت سے فوائد ہیں۔ وہ تمہارے لئے زینت کی چیز بھی ہیں، تم ان سے لباس بھی حاصل کرتے ہو، تم ان پر سواری بھی کرتے ہو، وہ ان مقامات تک تمہارا سامان پہنچاتے ہیں جن تک تم بے حد مشقت کے بغیر نہیں لے جا سکتے تھے۔

مویشیوں کے یہ فوائد بڑی حد تک سورہ یٰسین کی تین آیات میں جمع ہوگئے ہیں:

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَہُمۡ لَہَا

۱۷۔ النحل: ۶۶

مٰلِکُوۡنَ O وَ ذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ فَمِنۡہَا رَکُوۡبُہُمۡ وَ مِنۡہَا یَاۡکُلُوۡنَ O وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ O (۱۸)

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے اپنے ہاتھوں بنائی ہوئی چیزوں، ان کے لئے چوپائے بھی خلق کئے ہیں جن کے یہ مالک ہو گئے ہیں اور ان مویشیوں کو ہم نے ان کے زیر فرمان بنایا ہے، ان میں بعض تو ان کی سواری کے کام آتے ہیں اور بعض کا یہ گوشت کھاتے ہیں اور ان میں ان کے لئے (اور) فائدے بھی ہیں۔ کیا یہ پھر بھی شکر ادا نہیں کریں گے۔

افلا یشکرون کے الفاظ کے ذریعے مویشیوں اور ان کے منافع کے ذکر کا سبب بھی بیان فرما دیا گیا ہے۔ اور وہ ہے شکر گزاری۔ شکر کا ادا کرنا ایک بڑی اور اہم اخلاقی صفت ہے۔ مومن ہمیشہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ انبیائے کرام کی امتیازی صفت ہے، پھر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا شاکر اور کون انسان ہو سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ اگر ایک دن کھانا نوش فرمائیں تو دوسرے دن اختیاری فاقہ فرمائیں۔ اور اس نکتے کو آشکار کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ میں اللہ تعالیٰ کا شاکر اور صابر بندہ کیوں نہ بنوں۔ صبر اور شکر عظیم اخلاقی صفات ہیں اور ایک دوسرے کا ضمیمہ ہیں۔ ان کی نمود اخلاق محمد ﷺ سے بڑھ کر کہاں نظر آئے گی؟

یوں گلہ بانی اور مویشیوں کا چرانا وہ ربانی نسخہ ہے جو انبیائے کرام اور خاص طور پر حضور اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انسانوں کی صف میں لانے کے لئے اور ان کے رخ کو درست کرنے کے لئے عطا کیا گیا۔

۱۸۔ یٰسین: ۷۱ تا ۷۳

رسالت سے پہلے ''صلح'' کی دائمی قدر

نبی اکرم ﷺ کے بچپن اور لڑکپن کی زندگی ہی میں آپ کے وہ اخلاق اور خصائص اُبھر کر سامنے آگئے تھے جن سے آپ کو اپنے معاشرے میں جداگانہ اور مختلف صفات کا حامل سمجھا جانے لگا۔ عرب اگرچہ ایک ایسے وجود کو مانتے تھے جو خالق اکبر تھا، لیکن اُس کے کارِ تخلیق اور اختیارات میں اُنہوں نے ساجھے دار اور شریک بنالئے تھے۔ اُن کے بت ہی اُن کے معبود بن چکے تھے۔ انہی سے اپنی حاجت روائی کی دعائیں مانگی جاتیں، انہی کی قسمیں کھائی جاتی ہیں، ان ہی کے نام پر قربانیاں کی جاتیں، ان ہی کے آستانوں پر شگون لئے جاتے۔ نوعمر محمد (ﷺ) نے اپنی زندگی کے کسی حصے میں (بچپن اور لڑکپن کے بھی تو مرحلے ہوتے ہیں) کسی بت کے سامنے سر نہیں جھکایا اور انتہا تو یہ ہے کہ آپ کو بتوں کی قسم تک سننا گوارا نہ تھا۔ آپ نے بچپن اور لڑکپن میں بھی ایسے کھیل نہیں کھیلے جن پر ''لغو'' کی اصطلاح کا اطلاق ہوسکے۔ آپ کے لڑکپن میں صرف دو مواقع ایسے آئے جن میں دوسرے نوعمروں کے ساتھ آپ ﷺ نے تفریحی تقریبات میں شرکت کرنے کا ارادہ کیا۔ ایسی راتیں جن کو قبیلے والوں اور سب گھرانوں کی اجتماعی تفریح کی راتیں کہا جاسکتا ہے، لیکن دونوں مرتبہ آپ نیند کے غلبے کی وجہ سے اُن تفریحوں میں شریک نہیں ہوئے۔ ہمارا رب اپنے رسولوں کی زندگی کے ہر لمحے کو سنوارتا اور چمکاتا ہے۔ اور انبیاء کو ان معمولی باتوں سے بھی بچاتا ہے، جو اگرچہ اُن کے معاشرے میں معروف کا درجہ رکھتی ہیں، لیکن اُن کے مرتبۂ عالیہ کے مطابق نہیں ہوتیں۔ انبیاء اور رسل کی پوری زندگیاں ایک لمحۂ حاضر کی طرح اُن کے رب کے سامنے ہوتی ہیں۔ یہ بات عام انسانوں کی سمجھ میں اُن کے اعلانِ

رسالت کے بعد کی زندگی کے مطالعے سے آتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ انسانیت کے لئے صلح کے سب سے بڑے نقیب اور **پیغمبر** تھے۔ صلح کو اس کے وسیع ترین مفہوم میں دیکھیے، جس میں عام انسانوں کی اصلاح بھی شامل ہے۔ اس میں عام انسانوں کی کمیوں اور خامیوں کو دور کرنے کا عمل بھی داخل ہے، اور یہ اصلاح فرد اور معاشرے میں توازن قائم کرنے سے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔ جنگ کے مقابل صلح کا لفظ اسی مفہوم کو اُجاگر کرتا ہے۔ زندگی، جنگ کے عالم میں اپنے توازن سے محروم ہوجاتی ہے۔ گھر اُجڑ جاتے ہیں، بستیاں پامال ہوجاتی ہیں، زندگی اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے اور عزت و آبرو کے گہر پیروں تلے روندے جاتے ہیں۔ انبیائے کرام کو اسی توازن کے برقرار رکھنے کے لئے جنگ بھی کرنا پڑتی ہے اور اُس وقت تک کہ قرآنِ حکیم کے بیان کے مطابق جنگ اپنے ہتھیار نہ ڈال دے۔ نبی کریم ﷺ کی زندگی اور قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے گہرے مطالعے سے یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اعمالِ صالحہ سے مراد ایسے عمل ہیں جن سے دنیا کا توازن برقرار رہ سکے، معاشرے کی، خاندان کی اور افراد کی زندگی متوازن بن سکے، اور انسان کو نفسِ مطمئنہ حاصل ہوسکے۔

سورۃ النساء میں صلح کا لفظ اگرچہ میاں بیوی کے تعلقات کو خوش گوار بنانے کے سلسلے میں ادا ہوا ہے مگر اس سے ہمیں ایک دائمی قدر حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ (۱)

صلح بہت اچھی چیز ہے۔

اس دائمی قدر سے انسان کی زندگی کا توازن برقرار ہے۔ یہ آیت چار فقروں پر مشتمل ہے اور ہر فقرہ اپنے دامن میں ایک اصول اور حکم رکھتا ہے۔ دوسرے اور تیسرے فقروں میں انسانوں کو ایک دائمی قدر یعنی صلح عطا کی گئی ہے اور انسانی فطرت کی اُس کمزوری کو پیش کردیا گیا ہے جو صلح کے دامن کو بار بار چاک کرتی ہے:

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ

ا۔ النساء: ۱۲۸

عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا O (۲)

اگر عورت کو اپنے شوہر کی بدمزاجی اور تغافل و بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں کہ وہ باہمی صلح کرلیں، صلح بہت بہتر ہے اور لالچ (خودغرضی) ہر نفس (انسان) میں شامل ہے اور اگر تم اچھا اور احسان کا سلوک کرو گے اور تقویٰ کو اپناؤ گے تو اللہ تمہارے عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت کو ایک طویل اور واضح جملے یا آئین کی دفعہ کی طرح پڑھیے۔ اس دفعہ (جملے) کی پہلی شق یہ ہے کہ میاں بیوی باہمی صلح کے ہر امکان سے فائدہ اُٹھائیں اور اگر ایک فریق زیادتی (بدمزاجی، تغافل) کا شکار ہو تو بھی دوسرے کو معاف کردے اور خوشگواری کے ساتھ زندگی گزارنے کی صورت نکالے۔

اس کے بعد دوسری شق (فقرے) میں یہ فرمایا گیا کہ الصلح خیر صلح بہت بہتر بات ہے۔ یہ وہ دائمی قدر اور اُصول ہے جو قرآنِ کریم نے انسانیت کو عطا کیا ہے۔

تیسری شق (فقرے) میں اُس سبب کی نشان دہی کی گئی ہے جو انسان کو صلح کے راستے سے ہٹا دیتا ہے اور فساد، نزاع، جھگڑے اور جنگ کا سبب بنتا ہے۔ یہ طمع اور لالچ ہے جو انسان کے خمیر میں شامل ہے۔ انسان اپنے مفادات اور فائدے کے لئے ہر اُصول، ضابطے اور انسانی طرزِ عمل کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ بات افراد کے ساتھ ساتھ اقوام کے بارے میں بھی درست ہے۔ قومیں اپنے مفاد اور اغراض کے لئے ظلم اور زیادتی پر تیار ہو جاتی ہیں بلکہ آمادہ رہتی ہیں۔ دوسروں کی زمین چھین لو، دوسرے کے حصے کا پانی روک دو، دوسرے کے وسائل کی راہ میں رکاوٹ بن جاؤ، ہمیں آج یہی عالمی طمع ہر خطۂ ارض میں نظر آتی ہے۔

اور چوتھی شق یہ ہے کہ اس فطری کمزوری کو خوفِ الٰہی کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے،

۲۔ النساء: ۱۲۸

اور آج افراد اور اقوام میں اگر کچھ نہیں ہے تو تقویٰ نہیں ہے۔ آج کا خودغرض انسان عاقبت کے خیال اور عدل کے تصور سے بے نیاز ہے۔

اس عظیم آیت کے پس منظر میں نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نظر ڈالئے۔ ہر ظلم اور زیادتی کا غیر معمولی پامردی سے مقابلہ کرتے ہوئے آپ نے ہمیشہ یہی کوشش کی کہ بات اس طرح سلجھ جائے کہ ہر فریق کو اُس کا حق مل جائے اور جنگ کا خطرہ ٹل جائے۔ آج دُنیا کے ہر خطے میں یا تو جنگ ہو رہی ہے یا جنگ کی فضا ہے کیونکہ آج انسان ربانی پیام سے دُور ہو گیا ہے۔ فلسطینیوں سے اُن کے علاقے چھین لئے گئے ہیں، عراق اور افغانستان، امریکہ اور اُس کی حلیف قوتوں کے قدموں تلے روندے جا رہے ہیں، ہندوستان نے کشمیر میں ہر انسانی قدر کو پامال کر رکھا ہے۔

ان سب باتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور اس سلسلے میں اُن کی تعلیمات پر نظر ڈالئے تو عالمِ انسانیت اور انسانوں کے مستقبل پر آپ ﷺ کے احسانات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ مکی دور میں وہ کون سا ستم ہے جس کا آپ ﷺ اور اہل ایمان کو نشانہ نہیں بنایا گیا اور جب اپنے اللہ کے کرم سے آپ ﷺ نے وقت اور تاریخ کے دھارے کو پلٹ دیا، تو حرمِ کعبہ نے مغلوب قریش مکہ کے ہجوم سے آپ کے اس خطاب کو سنا کہ

لاتثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء (۳)

۳۔ شبلی نعمانی / سیرت النبی۔ دارالاشاعت، کراچی: ج ۱، ص ۳۰۰

صلح کا منبع ۔ بے غرضی اور خیر خواہی

صلح، بے غرضی کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور بے غرضی خیر خواہی کے جذبے سے جنم لیتی ہے۔ ہر رسول اور خاص طور پر ہادیٔ اعظم نوعِ بشر ﷺ کا قلب مبارک خیر خواہی کا سرچشمہ تھا۔ نبوت ہے ہی بے غرضی کا دوسرا نام اور بے غرضی بھی اور خیر خواہی بھی اس درجے کی کہ آپ ﷺ کی راتیں گمراہوں کی ہدایت کے لئے اشک فشانی میں گزر جاتیں اور آپ کے مقدس آنسو ہدایت کے ستارے بن کر فضاؤں اور دلوں کی دُنیا کو جگمگا دیتے۔ حیاتِ قبلِ نبوت میں آپ ﷺ کی بے غرضی اور خیر خواہی آپ کے ہر عمل میں مکے والوں کو نظر آتی۔ آپ کی نرم گوئی اور قولِ حَسن باہمی رنجشوں کو محبت میں بدل دیتا۔ نبوت سے پہلے ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اُسے آپ ﷺ کی نبوت کا خیر مقدمی نغمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ (ﷺ) کی حیاتِ مبارکہ کا پینتیسواں سال تھا کہ خانہ کعبہ کی پرانی بنیادوں پر کعبے کی نئی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا۔ پرانی عمارت بوسیدہ ہوچکی تھی اور اُس کے منہدم ہونے کا اندیشہ تھا۔ ابھی قریش میں حرمِ کعبہ کے بارے میں اتنی اخلاقی حس باقی تھی کہ اُنہوں نے طے کیا کہ کعبے کی تعمیرِ نو میں حلال اور محنت کی کمائی صرف کی جائے گی۔ ...وں سے چھینی ہوئی دولت، سود کا روپیہ اور حرام ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت استعمال نہ کی جائے گی۔

...بنیادِ ابراہیمی پر تعمیر شروع کی گئی۔ یاقوم نامی ایک رومی ماہرِ تعمیرات، تعمیری کاموں کا نگراں مقرر ہوا۔ تمام قبائل کے لئے کعبے کی سمت اور جگہ مقرر کر دی گئی اور دیوارِ کعبہ بلند ہونے

لگی، یہاں تک کہ اتنی بلند ہوگئی کہ حجرِ اسود کو نصب کرنے کا مرحلہ آ گیا۔ وہ قبیلے جو مل جل کر تعمیر میں حصہ لے رہے تھے، ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ ہر قبیلہ اس اعزاز کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ کئی دن بحث و تکرار میں گزر گئے اور پھر نوبت یہ آ پہنچی کہ تلواریں نیام سے باہر نکلنے کے لئے بے قرار ہوگئیں۔ فضا اتنی کشیدہ ہوگئی کہ معقولیت نے دم توڑ دیا اور مفاخرت نے ہر منطق اور ہر عقلی فیصلے پر غلبہ پالیا۔ اتنے میں کسی نے یہ مشورہ پیش کیا کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے مسجدِ حرام میں داخل ہو تو اُس کو حَکم بنا دیا جائے اور سب اُس کے فیصلے کو تسلیم کرلیں۔ یہ فیصلہ سب نے قبول کرلیا۔

یہ فیصلہ کرنے والے ساری رات حرم میں رہے۔ اور جب صبح کو کائنات بیدار ہونے والی تھی تو مسجدِ حرام کے دروازے سے حرم میں وہ داخل ہوا جسے دیکھ کر سب پکار اُٹھے:

هذا الامين رضينا، هذا محمد (۱)

یہ امین ہے، ہم اس پر راضی ہوگئے، یہ محمد ہے۔

یہ تھے عبدالمطلب کے پوتے، عبداللہ کے لختِ جگر، ابو طالب کے بھتیجے، خدیجہؓ طاہرہ کے زوج، جن کو باطل میں غرق معاشرہ بھی ''امین'' اور ''صادق'' کہنے پر مجبور تھا۔

صلح قائم کرنے کے لئے خیر خواہی اور بے نفسی کے علاوہ غیر جانب داری بھی درکار ہے کہ یوں ہی ہر فریق مطمئن ہوسکتا ہے۔ محمد (ﷺ) کی خدمت میں معاملہ پیش کیا گیا اور آپ نے اللہ کے عطا کردہ نورِ بُرہانی کی روشنی میں ایک چادر منگوائی۔ اُس کے درمیان حجرِ اسود رکھا گیا۔ چادر کے کونوں کو تمام قبیلوں کے نمائندوں نے پکڑ کر اُٹھایا۔ اور جب حجرِ اسود کی جگہ تک یہ لوگ پہنچے تو اس حَکم نے پتھر کو اُٹھا کر اُس کی جگہ پر لگا دیا۔ یوں ایک بڑا فساد دم توڑ گیا اور قبائلِ قریش ایک ایسی جنگ سے بچ گئے کہ اگر وہ چھڑ جاتی تو کئی نسلوں تک جاری رہتی۔

۱۔ حلبی، علی بن برہان الدین/ انسان العیون۔ بیروت، دارالمعرفہ: ج ۱، ص ۲۲۹

☆ ابن سید الناس/ عیون الاثر۔ مدینہ منورہ، مکتبہ دارالتراث، ۱۹۹۲ء: ج ۱، ص ۷۰۔

تجارت......امانت کا ایک وسیلہ

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بچپن اور لڑکپن میں بکریاں چرانے کے بعد تجارت کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے پہلا تجارتی سفر اپنے چچا جناب ابوطالب کے ساتھ کیا۔ آپ شام تشریف لے گئے تھے۔ قرآنِ مجید میں **سیروا فی الارض** (۱) کی ترغیب بار بار دی گئی ہے۔ اس سفر میں بارہ سالہ محمد (ﷺ) نے کئی مقامات اور شہروں کو دیکھا، لوگوں کی عادات واطوار کا مشاہدہ کیا، گزشتہ مغضوب قوموں کے مساکن اور دیار سے گزرے۔ آپ کو ساری انسانیت کے لئے رسول ہونا تھا تو دوسرے علاقوں سے یوں آپ کا تعارف کرایا گیا۔ ان میں رومی سلطنت کے مقبوضہ علاقے بھی تھے۔ جب ہم آپ کے ''تاجرانہ اخلاق'' کے بارے میں گفتگو کریں گے تو سیر وسیاحت کی اہمیت اور تجارت سے اُس کے رشتے کو زیرِ بحث لائیں گے۔ اسی سفر میں بحیرا راہب سے آپ ﷺ کی اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ روایت بہت مستند نہیں ہے، اور اسی مبینہ ملاقات پر مستشرقین نے اپنے اس نظریے کی عمارت کھڑی کر لی ہے، کہ اسی ملاقات میں آپ ﷺ کو زبور وانجیل کی تعلیمات کا علم ہوا، اور انہیں روایات کو آپ نے معاذ اللہ قرآن میں استعمال کیا۔ اول تو آپ کی عمر بارہ سال کی تھی اور پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ چند گھنٹوں کی ملاقات میں آپ تورات وانجیل کے عالم ہو گئے، اور ایک حرف ناشناس لڑکے نے کس طرح ان یہودی اور عیسائی روایات میں اخذ وانتخاب کے عمل سے کام لے کر ایک صحیفہ مکمل کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ بحیرا نے مشورہ دیا کہ محمد (ﷺ) کو بصریٰ

۱۔ مثلاً آل عمران: ۱۳۷۔ الانعام: ۱۱۔ النحل: ۳۶

سے وطن واپس بھیج دو، ورنہ شام میں یہودیوں کے ہاتھوں جان کا خطرہ ہے، اور جنابِ ابو طالب نے چند معتبر آدمیوں کے ساتھ آپ کو واپس بھیج دیا۔ (۲)

اگر اس واقعے میں صداقت ہوتی تو چچا آپ کو چند سال بعد تجارتی سفرِ شام کی اجازت کیسے دیتے؟۔ قریش تو تجارت پیشہ تھے۔ نوجوان محمد (ﷺ) نے قریش کے تجارتی قافلوں کے ساتھ تجارتی سفر شروع کر دیا۔ آپ لوگوں کا تجارتی سامان لے کر جاتے اور سامان فروخت کر کے سامان کے مالکوں سے معاوضہ حاصل کرتے۔ تجارت سے آپ کی دیانت، امانت اور حساب میں کھرے ہونے کی شہرت اور محکم ہو گئی۔ آپ کی ان اخلاقی صفات کو مشہور اور مستحکم کرنے میں تجارت نے بڑا حصہ لیا۔

آپ ﷺ کی دیانت اور معاملہ فہمی کی شہرت سن کر ایک مشہور اور مالدار تاجر خاتون خدیجہ بنت خویلد نے آپ ﷺ کو اپنا تجارتی نمائندہ مقرر کیا۔ خدیجہؓ ایک معزز بیوہ خاتون تھیں۔ کردار ایسا پاکیزہ تھا کہ عہد جاہلیت میں بھی اہل مکہ اُنہیں طاہرہ کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ پچیس سالہ محمد (ﷺ) خدیجہؓ کا مالِ تجارت لے کر اُن کے غلام میسرہ کے ساتھ شام کے تجارتی سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں (حضرت) خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کو ایسا منافع ہوا جس میں دیانت اور حسن معاملہ کے ساتھ آپ کی ذات کی برکت کا فیض بھی شامل تھا۔ خدیجہؓ پر آپ کی ایمانداری، صداقت، احساس امانت اور معاملہ فہمی کا ایسا اثر ہوا کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو محمد (ﷺ) سے شادی پر آمادہ پایا۔ خدیجہؓ نے اپنی سہیلی نفیسہ کے ذریعے آپ تک پیغام پہنچایا اور آپ ﷺ نے ساری بات سے اپنے چچاؤں کو مطلع کیا۔ خدیجہ کی شرافت و نجابت سے مکے میں کون واقف نہ تھا۔ کتنے ہی مالدار اور معزز سردارانِ قبیلہ آپؓ سے شادی کی تمنا رکھتے تھے۔ جناب ابوطالب نے پیغام منظور فرما لیا اور خود خطبۂ نکاح پڑھا۔ یوں دو شخصیتیں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں۔ محمد (ﷺ) کی عمر اُس وقت پچیس سال تھی، اور خدیجہؓ زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی تھیں۔ بعض قابل توجہ روایات کے مطابق اُس وقت آپ ﷺ کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ یہ شادی آج تک انسانی تاریخ میں ایک مثالی شادی کا درجہ

۲۔ ترمذی، محمد بن عیسیٰ/ السنن۔ بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۴ء: ج ۵، ص ۳۵۷، رقم ۳۶۴۰

رکھتی ہے، جس میں دو روحیں مل گئیں اور دو دل ایک طرح دھڑکنے لگے۔ ازدواجی اخلاق کے باب میں ہم اس شادی کے متعلقہ نکات کا ذکر کریں گے، ان شاء اللہ۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، سب سے پہلے ایمان لائیں۔ حضور ﷺ مسلم اول ہیں اور مسلم ثانی خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ ازدواجی زندگی اخلاق کی بنیاد باہمی اتفاق رائے اور تعاون کی اخلاقی قدر ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے اخلاق کا ہر پہلو ایک اخلاق سمجھنے کا درجہ رکھتا ہے۔ اعتماد ہی ازدواجی زندگی کو جنتی زندگی کا دیباچہ بناتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ دین کے راستے میں نبی اکرم ﷺ کے دوش بہ دوش کھڑی رہیں اور آپ کی تسکین اور تسلی کا موجب بنیں۔

رسول اللہ ﷺ جب پہلی وحی کے بعد گھر تشریف لائے تو اس عظیم تجربے کا بوجھ آپ کی ذات مبارکہ پر بہت شدید تھا۔ اُس وقت حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی۔ یہ تسلی بھی آپ کے اخلاق کی بنیاد پر تھی۔ اسلام کی خاتونِ اوّل نے یہی فرمایا:

> آپ ﷺ کو آپ کا اللہ کبھی رُسوا نہیں کرے گا۔ اُس کی نصرت و اعانت آپ کے ساتھ رہے گی کیونکہ آپ ﷺ رشتوں کی پاسداری کرتے ہیں اور صلۂ رحمی آپ کا شعار ہے۔ آپ بے سہاروں کا سہارا ہیں، اور اُن کا بار در ماندگی آپ کے کاندھے اُٹھاتے ہیں، آپ ﷺ غریبوں کی دست گیری کرتے ہیں، مہمانوں کی تکریم اور تواضع کرتے ہیں اور جو صحیح راستے پر ہیں اُن کی اعانت کرتے ہیں۔ (۳)

یہ بات کتنی اہم ہے کہ آپ کی رسالت کی تصدیق کرنے والی پہلی شخصیت نے آپ ﷺ کے دعویٰ کی دلیل آپ کے اخلاق کو بنایا۔ وہ جس کی صداقت کی گواہی اُس کا معاشرہ دیتا تھا، وہ جس کی امانت ضرب المثل تھی، وہ اپنے اللہ پر کیسے بہتان باندھ سکتا تھا۔ تصدیق خدیجہ اخلاق محمد ﷺ کی بلندی کی گواہی ہے اور وہ بھی ایک ایسی ذات کی زبان سے، جو آپ ﷺ سے سب سے زیادہ قریب تھی، جس پر آپ کا ظاہر و باطن پوری طرح آشکار تھا۔

۳۔ بخاری، محمد بن اسماعیل/ الصحیح۔ مصر، مصطفیٰ البابی الحلبی، ۱۹۵۳ء، ج ا، ص ۴

اقرأ اور پھر قلم

نبی اکرم ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ تھی:

اقرا باسم ربک الذی خلق (۱)

ایک حرف ناشناس کو پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، اور تخلیق آدم کے اسرار و رموز اُس پر فاش کئے جا رہے ہیں۔ اُس اُمّی لقب کے وسیلے سے علم کی عظمت اور حقیقی ماہیئت ''فاش'' کی جا رہی ہے۔ وہ علم جو ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی۔ اخلاق کی عمارت اسی علم یقین کی بنیاد پر استوار ہو سکتی تھی۔ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے اخلاق معاشرے کی رسوم، بالا دست طبقے کی عادات اور توہمات اور معاشرے کے رہن سہن کا دوسرا نام تھا۔ یہ بات عرب تک محدود نہ تھی بلکہ ہر معاشرے میں اخلاق کا تعین اُس کے سربرآوردہ، بااثر اور پڑھے لکھے کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کا تناظر، دائرۂ فکر محدود تھا۔ یونان کے عظیم فلسفیوں کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ غلامی کا ادارہ انسانیت کی تذلیل ہے۔ اُنہوں نے نہ غلاموں کو معاشرے میں عادلانہ اور باعزت جگہ دلانے کی کوئی کوشش کی، اور نہ اس ادارے کو بتدریج ختم کرنے کے بارے میں کچھ سوچا۔ رسول اللہ ﷺ کو جو اخلاق اور اخلاقی اقدار عطا کی گئیں، اُن کا سرچشمہ وحی الٰہی تھا۔

سورۂ اقرا کی ابتدائی پانچ آیتوں کے نزول کے بعد نزول وحی کا سلسلہ کچھ عرصے کے لئے رُکا رہا۔ اس زمانے کو زمانہ فترت وحی کہا جاتا ہے۔

معتبر روایات کے مطابق اس کے بعد پہلی نازل ہونے والی سورۃ المدثر ہے۔

ا۔ العلق: ا

المدثر میں کئی اخلاقی ضوابط بیان کئے گئے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالت کے بنیادی مقاصد میں سے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق بھی ہے۔آیات کی تلاوت، تزکیۂ قلوب اور کتاب وحکمت کی تعلیم کسی بھی رسول اور خاص طور پر حضرتِ محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرائضِ نبوت میں اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔

سورۂ المدثر میں مدثر (ﷺ) سے فرمایا گیا کہ اب تنذیر کے ذریعے فریضے کی تکمیل کے لئے کمربستہ ہوجایئے اور اپنے رب کی عظمت و کبریائی کا اعلان کیجئے۔اس کے فوراً بعد فرمایا گیا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَلَاتَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْO(۲)

اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے، اور گندگی سے دور رہیے، اور احسان کر کے بہت بدلے کے خواہش مند نہ ہویئے، اور اپنے رب سے اُمید رکھیے (اور اس کے لئے صبر کیجیے)

ان تین آیات میں طہارت اور پاکیزگی کا لفظ وسیع ترین معانی میں استعمال ہوا ہے جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرلیتا ہے۔ ثیاب، ثوب کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں کپڑے۔انسان کے اعمال، اُس کا ظاہر ہوتے ہیں اور جس طرح آدمی اپنے لباس سے پہچانا جاتا ہے اُسی طرح اپنے اعمال سے۔اسی لئے محاورۂ عرب میں ثوب کا لفظ عمل اور انسانی فعل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ظاہری افعال کے علاوہ ثوب کے مجازی معانی میں قلب اور اخلاق بھی شامل ہیں۔تقویٰ کو اسی لئے قرآن مجید میں بہترین لباس قرار دیا گیا ہے:

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ط وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَO (۳)

۲۔المدثر:۴،۷

۳۔الاعراف:۲۶

یابنی آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس نازل کیا (پیدا کیا) جو تمہاری شرم گاہوں کو چھپاتا ہے اور تمہارے لئے باعثِ زینت بھی ہے۔اور تقویٰ کا لباس۔یہ تمام لباسوں سے بہتر ہے، یہ اللہ کی آیات میں سے ہے، تاکہ یہ لوگ یاد رکھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس قرآنی حکم کو اس کے وسیع ترین سیاق وسباق میں سمجھنا ہوگا۔لباس کی پاکیزگی کے بعد گندگی سے دور رہنے کا حکم دیا گیا۔اس سے یہ بات خود بخود واضح ہوجاتی ہے کہ یہ رجز لباس کی، جسم کی ظاہری نجاست نہیں ہے بلکہ ہر قسم کی نجاست، خطا اور گناہ اس میں شامل ہے۔حضور ﷺ کی خلقت ہی معصومیت پر مبنی تھی۔اللہ نے ہر گناہ سے آپ کو محفوظ کردیا تھا، اس لئے ادنیٰ تامل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ حکم آپ کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو دیا جارہا ہے۔قرآنِ مجید کا یہ عام اسلوب ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول یا عمل سے حکم کا اثبات قوی تر ہوجاتا ہے۔قل ھو اللہ احد پر غور کیجئے۔اللہ کے احد ہونے کے بیان سے پہلے ''قل'' کی کیا ضرورت تھی؟ ضرورت تھی اور اس لئے کہ رسالت احدیتِ رب کو یوں جانتی تھی جیسا کہ جاننے کا حق تھا۔یہ حقیقت رسول کے لئے عین الیقین کے درجے پر تھی۔آئمہ تفسیر نے رجز سے مراد بت پرستی لی ہے۔نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی کسی بت کے آستانے پر سر نہیں جھکایا۔سورۃ المدثر میں بتوں کے چھوڑ دینے سے مراد ہر دور میں مسلمانوں کے لئے اس حکم کی تاکید ہے۔اس پر اضافہ کیجئے ہمارے عہد میں غیر مرئی بتوں کی یلغار ہے، وہ بت جو دل ونگاہ میں اپنے استھان سجائے ہوئے ہیں۔اقتدار کا بت، سرمایہ پرستی کا بت، کبر ونخوت کے بت۔انہیں بتوں کی موجودگی میں عہدِ حاضر اور آنے والے ادوار کے مسلمانوں کو لا الٰہ الا اللہ کا حکم دیا گیا ہے:

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ

اور ان احکام پر عمل کرنے کا نسخہ ''صبر'' ہے وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ اُردو میں تو صبر مجبوری کا دوسرا نام ہے، لیکن قرآنی صبر ضمیرِ کائنات کو بدل کر، مسخر کر کے اُسے مومن بنا دیتا ہے:

صبر کے لفظی معنی اپنے نفس کو روکنے اور قابو میں رکھنے کے ہیں، اس لئے صبر کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی پر اپنے نفس کو قائم رکھے اور یہ بھی داخل ہے کہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نفس کو روکے۔ اور یہ بھی داخل ہے کہ مصائب اور تکلیف میں اپنے اختیار کی حد تک جزع فزع اور شکایت سے بچے، اس لئے یہ حکم ایک جامع حکم ہے جو تقریباً پورے دین کو شامل ہے۔ (۴)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی اہلِ مکہ بلکہ عالمِ انسانیت کے لئے بہت عظیم نعمت تھی اور اُسے انسانوں تک پہنچانا بہت بڑا احسان، لیکن کارِ نبوت تو انتہائی بے غرضی کا مطالبہ کرتا ہے، اسی لئے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجنے والے نے یہ ہدایت واشگاف انداز میں فرمائی کہ احسان کر کے انسانوں سے بدلے کے خواہش مند نہ ہوئیے گا، آپ کا اجر تو آپ کے ربّ کے پاس ہے، اور اُسی سے اجر اور کامیابی کی اُمید رکھیے گا۔

بعثت کے پہلے تین سال آپ نے خاموشی کے ساتھ قریبی عزیزوں اور حلقۂ احباب میں تبلیغ فرمائی۔ قریبی دوست اور عزیز کسی شخص کے ظاہر و باطن، اخلاقی کیفیت، صداقت، دیانت، امانت اور معاملہ فہمی سے سب سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ یہ بھی آپ کی صداقت کی پہلی دلیل اور سچائی کا معجزہ ہے کہ پہلی وحی کے نزول کے پہلے ہی دن آپ ﷺ سے سب سے قریب لوگ مسلمان ہو گئے۔ سب سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ایمان لائیں۔ آپ ﷺ کی زندگی کی شریک، آپ کی خلوت و جلوت کی رفیق، آپ کی نرم دلی، خیر خواہی خلق، اور بے پایاں وسعتِ قلب کی شاہد۔ حضرت علی المرتضیٰؓ جو آپ کے گھر میں آپ کے زیرِ نگرانی پرورش پا رہے تھے اور جو اپنے چچیرے بھائی کو اپنا آدرش سمجھتے تھے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کو وجۂ سعادت جانتے تھے، اُن کو ایک لمحے کا تأمل بھی قبولِ اسلام میں نہ ہوا۔ وہ اگرچہ بہت کم عمر تھے اور ابھی اُنہیں لڑکپن سے نوجوانی کی حدود میں داخل ہونے میں کئی سال درکار تھے مگر ہاشمی استقلال، اصابتِ رائے اور ذہنِ رسا کے مالک تھے۔ ان ہی اولین حلقہ بگوشانِ اسلام میں

۴۔ مفتی محمد شفیع / معارف القرآن۔ کراچی، ادارۃ المعارف: ج ۸، ص ۶۱۲

زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ، بھی شامل تھے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام تھے، جن کی زندگی کی ہر سانس آپ کی محبت کی امانت دار تھی۔ اس آسمان نے ایسی کوئی مثال نہ پہلے دیکھی تھی اور نہ بعد میں دیکھی کہ زید کے والد اور چچا اُنہیں لے جانے کے لئے آئے۔ انسان کو ہر زنجیرِ غلامی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آزاد کرنے والے ہادی، رہبر (ﷺ) نے اُنہیں جانے کی بخوشی اجازت دے دی، لیکن زید اپنے محسن، اپنے مربی اور اپنے آقا کو چھوڑ کر جانے پر رضامند نہیں ہوئے۔ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر جیتے تھے۔ اسی محبت کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے اُنہیں آزاد کر کے اپنا متبنیٰ (منہ بولا بیٹا) بنایا اور وہ زید بن محمد کہے جانے لگے۔ یہاں تک کہ تبنیت کے رواج کو اسلام نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

ان ہی میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔

حضرت صدیقؓ کے فضائل اقبال کے اس شعر میں سمٹ آئے ہیں:

همتِ او کِشت ملت را چو ابر
ثانئِ اسلام و غار و بدر و قبر

وہ آزاد مردوں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے تھے، ہجرت کے وقت وہی رفیقِ نبی ﷺ تھے، غارِ ثور میں دو افراد (نبی و صدیق) میں سے ایک تھے، اور وفات کے بعد آپ رسول اللہ کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے محوِ خوابِ ابد ہیں۔

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ، سرورِ کائنات ﷺ کے سب سے گہرے اور قریبی دوست تھے۔ اس دوستی کی بنیاد عادات و خصائل اور اخلاقِ حمیدہ کی یکسانیت تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ مکہ کی نہایت بااثر، بارسوخ اور محترم شخصیات میں سے تھے۔ علانیہ تبلیغ کے دور کے آغاز سے پہلے ہی اُن کی تبلیغ کے نتیجے میں حضرت عثمان غنی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم مسلمان ہو گئے تھے۔ کفر کے سمندر میں ایمان کے یہ جزیرے اُبھر آئے تھے۔ کفر کے گلیشیر پگھلنے لگے تھے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں حضرت بلال حبشی، حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمرِ فاروق کی بہن فاطمہ بنت خطاب اور حضرت خباب بن ارث رضی اللہ عنہم اور بعض

دوسرے صحابۂ کرامؓ بھی شامل ہیں۔

''سابقین اولین'' یہ پہلے مسلمان ہونے والے اس مرتبے اور سعادت میں بدرجۂ اولیٰ شامل ہیں۔ قرآنِ کریم کے اوراق ان کے علوئے مرتبہ کے شاہد ہیں۔ اللہ کے فضل اور نبی محترم ﷺ کی رحمت کا کوئی ٹھکانا ہے کہ سابقین الاولین میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ ان میں مکہ معظمہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والے بھی شامل ہیں اور اسلام قبول کرنے والے اولین انصاری بھی شامل ہیں جنہیں پہلی بیعتِ عقبہ اور دوسری بیعتِ عقبہ میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ O (۵)

اور جو مہاجرین اور انصار میں سابق اور مقدم ہیں، اور جو لوگ احسان اور اخلاص کے ساتھ اُن کے متبع ہیں، اللہ اُن سب سے راضی ہوا، اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے، اور اللہ نے اُن کے لئے ایسے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور ان باغات میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ بے شک بڑی کامیابی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اُس نے ان کے لئے جنت کے باغات تیار کر رکھے ہیں اور جنت اُن کے لئے ہے جن کی بشری کوتاہیاں اور گناہ رب العزت معاف کر دے اور اُن کے حسنات قبول فرمالے۔ ایک گروہ جو اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے یہ بھی عقیدہ رکھتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد چھ سات صحابیوں کے علاوہ معاذ اللہ معاذ اللہ سارے صحابۂ کرامؓ مرتد ہو گئے تھے۔ قرآنِ کریم کی اس واضح اور مستقل بشارت کے بعد ایسا عقیدہ صریح کفر ہے۔

۵۔ التوبہ: ۱۰۰

سب سے پہلے مسلمان ہونے والے مہاجرین اور انصار تو سابقون الاولون میں شامل ہیں ہی۔ آئمۂ تفسیر نے شرکائے بدر کو سابقون الاولون میں شامل کیا ہے۔ بعض اکابر کی رائے میں بیعتِ رضوان میں شرکت کرنے والے صحابۂ کرام بھی اسی جماعتِ سعادت و برکت میں شامل ہیں۔ راقم الحروف کے ذہن اور دل کی یہ گواہی ہے (اور خدا نہ کرے کہ یہ تفسیر بالرائے ہو) کہ کسی کافر معاشرے میں پہلے ایمان لانے والے سابقون الاولون میں شامل ہوں گے، کیونکہ امتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) خیر الامم ہے۔ اور اس کے حدود و آفاق میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے اور نئے نئے علاقے دائرۂ اسلام میں شامل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اور سابقون الاولون کا اتباع کرنے والوں کو گروہ تابعین کہا گیا ہے اور یہ گروہ ان شاء اللہ تا قیامِ قیامت دینِ اسلام پر خلوص اور احسان کے ساتھ عمل کرتا رہے گا۔

نیکیوں اور سعادتوں میں آگے بڑھ کر حصہ لینے والوں کا سلسلہ ان شاء اللہ جاری رہے گا، اگرچہ ان کی تعداد زمانۂ رسالت کے لوگوں کے مقابلے میں کم ہوتی جائے گی۔ نیکو کاروں اور نیکیوں کے حصول میں سبقت کرنے والوں اور سبقت لے جانے والوں سے ہی ہر دور میں پیغامِ رسولِ عربی ﷺ پھیلتا رہے گا، اسلام کا چراغ روشن رہے گا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۚO اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚO فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ O ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۙO وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ O (۶)

اور جو (نیکیوں میں) آگے والے ہیں وہ تو آگے والے ہی ہیں۔ وہ مقامِ قربت پر فائز ہیں، نعمتوں والی جنتوں میں۔ ان سابقون الاولون میں ایک بہت بڑا گروہ اگلے لوگوں میں سے ہوگا، اور تھوڑے سے لوگ بعد میں آنے والوں میں سے۔

ان شاء اللہ سابقون الاولون کی کیفیت، مختصر واقعات اور حالات متعلقہ حصۂ کتاب میں پیش کئے جائیں گے، جن کی مدد سے اُن کے اخلاق کا بیان روشن تر اور واضح تر ہو سکے گا۔

۶۔ الواقعہ: ۱۰ تا ۱۴

صبر...... مومن کی ڈھال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل اور اپنی استقامت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حق کی سربلندی اور صراطِ مستقیم پر چلنے کے سلسلے میں صبر کا سبق سکھایا۔ صبر، اسلامی اخلاق کا عنوانِ جلی ہے۔ استقامت، توکل علی اللہ اور تواصوا بالحق کا حاصلِ جمع صبر ہے۔ صبر انسان کو وہ قوت عطا کرتا ہے کہ ہر ناوکِ ستم انسان سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے۔

مکۂ معظمہ میں جو لوگ سب سے پہلے مسلمان ہوئے اُن میں غلام اور پس ماندہ طبقے کے لوگ بھی شامل تھے۔ تاریخِ رشد و ہدایت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ پیغامِ حق کو سب سے پہلے وہ قبول کرتے ہیں جن کے پاس کھونے کو کچھ نہیں ہوتا اور پانے کو جنت، اچھی زندگی، آزادی اور اگلی دُنیا پر یقین ہوتا ہے اور پیغامِ حق کی مخالفت میں وہ خوش حال طبقہ سب سے آگے ہوتا ہے جس کے مفادات پر رسول ﷺ کا پیغام سب سے زیادہ ضرب لگاتا ہے۔ ربانی پیغام استحصال اور انسان کی غلامی سے انسان کو نجات دلاتا ہے۔ یہ مترفین اس کچلے ہوئے طبقے کو ظلم و جبر کا نشانہ بناتے ہیں اور وہ صبر کی قوت سے باطل کی طاقت اور نشے میں چُور ان جابروں کو شکست دے دیتا ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ کو گرم ریت پر گھسیٹا جاتا ہے اور سینے میں تپتی ہوئی چٹان رکھ دی جاتی ہے مگر اس کے جواب میں اُن کے لبوں سے اَحد، اَحد کی صدا بلند ہوتی رہتی ہے۔ اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑے رہنے کا عمل صبر ہے، اور اس صبر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صابر، ظالم کو اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

قریبی عزیزوں کو دعوتِ اسلام دینے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تبلیغ عام کا حکم دیا

گیا۔ تبلیغ عام کی اجازت کے ساتھ ہی مکی معاشرے میں بھونچال آیا۔ رسول اللہ ﷺ کا تمسخر اُڑایا جانے لگا۔ آپ کو طرح طرح سے جسمانی، ذہنی اذیتیں دی جانے لگیں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تاریخِ انبیائے عظام دُہرائی جانے لگی، لیکن رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقا تو ایک دوسری ہی دنیا میں بس رہے تھے۔ وہ دُنیا جو نبی ﷺ کے اخلاق اور کردار کی روشن دُنیا تھی۔ کفار کے نزدیک اگر دینِ حق جرم تھا تو ان قدسی نفس انسانوں کا ''ذوقِ جرم'' سزا کے بعد بڑھتا چلا گیا، ان حالات میں ربِ جلیل نے اپنے رسول ﷺ کو یوں تسلی دی:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ O وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۙ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۙ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (۱)

پس آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اُس کو کھول کھول کر بیان کیجئے اور مشرکوں سے اعراض کیجئے (اُن سے منہ پھیر لیجیے) آپ سے تمسخر کرنے والوں (کی سزا) کے لئے ہم کافی ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبودوں کو شریک کرتے ہیں اُن کو جلد ہی (اپنی گمراہی کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ (مشرکین) جو کچھ کہتے ہیں اُن باتوں سے آپ دل تنگ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہیں (اور اُس کی) حمد کرتے رہیں اور اُس کو سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جائیں اور اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں یہاں تک کہ آپ کو موت آ جائے۔

ان مختصر سی آیات میں کیا کچھ نہیں آ گیا؟۔ پیغامِ رسالت کا خلاصہ، کافروں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ کا رخ، اُلجھنے کی جگہ اُن کو نظر انداز کرنا۔ اُن کے مظالم کی وجہ سے یہ طرزِ عمل (اعراض) کتنا مشکل تھا۔ اور یہ اعراض کسی مجبور کا اعراض نہیں تھا،

۱۔ الحجر: ۹۴ تا ۹۹

بلکہ اس کی پہلو تہی کا روّیہ تھا جس کا رب اُس کے ساتھ تمسخر کرنے والوں کے لئے کافی تھا۔ اور جلد ہی مشرکوں نے اپنے سربرآوردہ لوگوں کا حشر میدانِ بدر میں دیکھ لیا، اور ابولہب کی عبرت ناک موت بھی اُن کے سامنے آ گئی، یہی فتحِ مکہ کے موقع پر پوری جماعتِ مشرکین اللہ کے رسول کے سامنے سر جھکائے ہوئے کھڑی تھی۔ ذلت اُن کے لئے کافی تھی اور رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جب ربانی کلمہ لاتثریب علیکم الیوم ادا ہوا، تو یہ اُن کی شکست پر تازیانہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی دل تنگی کے لئے اُن کے رب نے اپنی معیت کا یقین دلانے کے ساتھ ساتھ انشراحِ قلب کا نسخہ بھی عطا کیا۔ وہ تھا تسبیح، حمد اور سجدہ۔ پھر یہ حقیقت بھی سامنے آ گئی کہ یہ صرف نسخۂ تسخیرِ تمسخر ہی نہیں ہے بلکہ آپ کے لئے اور آپ کے ساتھیوں کے لئے طرزِ زندگی ہے۔ وہ اسلوبِ حیات جو موت تک جاری رہے گا۔ ان آیات کی تکمیل سورۃ النصر ہے:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ
اَفْوَاجًا ○ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ○ (۲)

اور جب اللہ کی نصرت اور فتح آ جائے اور آپ لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیں تو اپنے ربّ کی تسبیح بیان کریں، اور اُس سے مغفرت طلب فرمائیں، وہ بے شک بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یہ نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ عظیم کے کئی پہلوؤں کا بیان ہے جو صبر کے ہم عنان و ہم رکاب ہیں۔ بیانِ حق اور واضح طور پر مشرکوں سے پہلو تہی، استقامت کے ساتھ تمسخر کا مقابلہ، اور اس تمسخر سے دل میں تنگی نہ محسوس کرنا، پھر اس طرزِ زندگی پر مداومت و استقلال، موت تک۔ یوں موت حیاتِ ابدی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔

ان اخلاقی تعلیمات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عمل بنا لیا اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کی تقلید کی۔ یوں صحابۂ کرامؓ کا اخلاق، اخلاقِ محمد کا پرتو بن گیا اور آج بھی رسول اللہ ﷺ کی سیرت مسلمانوں میں اسی اخلاق کو اپنانے کا حوصلہ پیدا کر رہی ہے۔

۲۔ النصر: ۱ تا ۳

یا صباحاہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کے تدریجی مراحل سے سیرتِ طیبہ کا ہر طالب علم اور عام مسلمان واقف ہے۔ قریبی رشتے داروں میں تبلیغ کے مرحلے کے بعد جب آپ کو کھول کھول کر بیان کرنے کا حکم دیا گیا تو ایک صبح آپ ﷺ نے کوہِ صفا کی بلندی سے آواز بلند کی۔ یا صباحاہ (ہائے صبح)۔ یہ آواز، قوم کو باخبر کرنے کا نعرہ تھا، جب کسی دشمن کا خطرہ ہوتا تو قریش اسی نعرے سے ایک دوسرے کو اطلاع دیتے۔ یا صباحاہ کی آواز سن کر قریش کے قبیلوں کے افراد آپ ﷺ کے گرد جمع ہو گئے۔ آپؐ بلندی پر کھڑے تھے اس لئے آپ کی نظر کے سامنے آپ کی پشت کا منظر بھی تھا اور آپ کے سامنے کا منظر بھی۔ قریش آپ کی صداقت پر مکمل اعتقاد رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میری پشت پر دشمن کا ایک لشکر موجود ہے تو تم یقین کر لوگے؟ مجمعے نے جواب دیا کہ ہاں! ہم تمہاری صداقت پر کامل بھروسہ کرتے ہیں۔ اس پر رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ کی حمد بیان کی اور قریش کو توحید اور اپنی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ اس دعوت پر قریش کے ردعمل کا اظہار ابولہب نے یوں کیا:

اے بھتیجے! تمہارا دن غارت ہو۔ تم نے ہمیں اسی لئے جمع کیا تھا۔ یا صباحاہ کے نعرے کو تم نے کس طرح استعمال کیا۔

یہ کہہ کر ابولہب وہاں سے چل پڑا، دوسرے لوگوں نے بھی اُس کی پیروی کی۔

ابولہب کے الفاظ یہ تھے:

تبًا لکَ اَلِھٰذَا جَمَعْتَنَا(۱)

ہلاکت ہو تمہارے لئے، کیا اس کے لئے تم نے ہمیں جمع کیا تھا۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے تبًا لکَ کا جواب نہیں دیا، لیکن رب ذوالجلال نے اس کا جواب دیا، ایسا جواب جو ابولہب کی تقدیر بن گیا:

تَبَّتْ یَدَآ اَبِیْ لَھَبٍ وَّتَبَّ O(۲)

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ ٹوٹ کر رہ گیا۔

ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ اس کا مفہوم واضح ہے کہ اُس کے منصوبے ناکام ہو گئے۔ اور خود اُس کے ٹوٹ جانے کی خبر، اُس کی ہلاکت کی خبر ہے۔ مستقبل کی یہ خبر، صیغۂ ماضی میں ادا کی گئی جو انتہائی یقین اور قطعیت کا اظہار ہے۔

جب ابولہب نے تبًا کہا تھا تو مسلمانوں کے دلوں میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ سرورِ دین و دنیا ﷺ بھی اُس کے حق میں بددُعا فرمائیں، لیکن جو ذات رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجی گئی تھی، جو کافروں کے ایمان لانے کی تمنا میں دُعا کرتے کرتے اپنی رات کو سحر بنا لیتی تھی، اُس کے لبوں سے بددُعا نہ نکلی۔ تبت یدآ ابی لھب کی بددُعا کلامِ الٰہی کی صورت میں سامنے آئی، اور اس بددُعا کا نتیجہ بھی فرما دیا گیا کہ وَتَبَّ۔ غزوۂ بدر کے سات دن بعد ابولہب طاعون میں مبتلا ہوا۔ اس موذی مرض کے اثرات سے بچنے کے لئے اُس کے گھر والوں نے اُسے گھر سے باہر پھینک دیا اور اسی عالم میں وہ لقمۂ اجل بنا۔ تین دن تک اُس کی لاش یوں ہی پڑی رہی اور پھر کرائے کے آدمیوں نے اُس کی لاش کو ایک گڑھے میں ڈال کر اُسے پتھروں سے پاٹ دیا۔

ابولہب کی موت کفر کے انجام کا ایک اشاریہ ہے۔ اُس کی موت کے لئے ربِّ کریم نے جس وقت کا انتخاب فرمایا اُس کی معنویت پر غور فرمایئے۔ بدر کو یوم الفرقان فرمایا گیا۔ جب حق و باطل بالکل واضح اور الگ ہو گئے اور حق غالب آ گیا۔ ربِّ ذوالجلال نے امامِ کفر ابولہب کو کفر کا یہ انجام دکھا دیا اور پھر ذاتِ باری اُس کی طرف متوجہ ہوئی اور کفر کے اس نشان کو

۱۔ بخاری: ج ۳، ص ۱۵۹

۲۔ اللہب: ۱

مٹا دیا۔ اُس کی موت کی عبرت ناکی بھی ایک رمز تھی۔ ایسی رمز جو ظاہر اور واضح ہے۔

اس رمز میں اصحابِ محمد ﷺ کے لئے نوید تھی۔ ابولہب کی موت کے ذکر نے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے اصحاب کی داستانِ صبر و استقامت کے تسلسل کو توڑ دیا مگر یہ ابدی حقیقت اُبھر آئی کہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

کافرانہ زندگی کا ہر شعبہ خطرے کی زد میں

قریش، تبلیغ کی ابتدا کے ساتھ ہی اُس تبدیلی کو سمجھنے میں کامیاب ہوگئے جو اس ''نئے دین'' کے نتیجے میں پیدا ہوسکتی تھی۔ اُنہیں دینِ آبا خطرے میں نظر آیا۔ دینِ آبا ہی نہیں بلکہ زندگی کے سارے رسم ورواج، سارے معاشرتی ادارے، اور سب سے بڑھ کر اپنا قبائلی نظام، سماجی احساس تفاخر۔ اُنہوں نے اسلام کی تعلیمات میں انسانی اُخوت ومساوات کے پہلو کو آج کے روایتی مسلمانوں سے بھی زیادہ واضح طور پر موجود پایا۔

اُنہوں نے بجا طور پر اس پہلو کو بھی سمجھ لیا کہ زندگی کے ہر شعبے کو اسلام کے دائرے میں شامل کرنا پڑے گا، چاہے وہ اپنی آمدنی اور اپنی دولت کو خرچ کرنے کا مسئلہ ہی کیوں نہ ہو۔ جیسے جیسے اسلام کا چرچا بڑھا، قریش کی مخالفت بھی بڑھنے لگی۔ افراد اور معاشرے پر اسلام کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر گرفت قریش کو قبول نہیں تھی۔

انبیائے سابقین بھی اپنے اپنے ادوار میں اسی اسلام اور نظام کے داعی تھے۔ اسلام کے بنیادی اُصول، احکام اور تعلیمات ہر دور میں چند عصری تقاضوں اور فروعات کے علاوہ ایک ہی رہی تھیں۔ ہر نبی نے توحید، آخرت، دُنیا میں عدل وانصاف، عبادات میں نماز، روزے، انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دی اور اُن پر ان کی اُمتوں کے اعتراضات اور اُن کی مخالفت کے اسباب بھی یکساں رہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر کا ذہن ہمیشہ سے ''جامد'' رہا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام مدین والوں کی طرف بھیجے گئے۔ ان کی دعوت، تعلیمات اور اُن کی قوم کے روّیے کا ذکر قرآن حکیم نے اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ہر

دور کے کافروں اور منکروں کا احاطہ کرلیتا ہے:

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا ط قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ مَالَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرُہٗ ط وَلَا تَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ اِنِّیْٓ اَرٰکُمْ بِخَیْرٍ وَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ O وَیٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِکْیَالَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَھُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ O بَقِیَّتُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ج وَمَآ اَنَا عَلَیْکُمْ بِحَفِیْظٍ O قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط اِنَّکَ لَاَنْتَ الْحَلِیْمُ الرَّشِیْدُ O (۱)

اور مدین (والوں) کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُنہوں نے (اپنی قوم والوں سے) کہا کہ اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو کہ تمہارے لئے اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ میں تمہیں آسودہ حال دیکھ رہا ہوں اور مجھے تم پر اُس دن کے عذاب کا خوف ہے، جو تمہیں گھیر لے گا۔ اور اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ پوری پوری ناپ تول کرو اور لوگوں کو اُن کی چیزیں (بددیانتی سے) کم نہ دو اور زمین پر فساد نہ مچاتے پھرو۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ تعالیٰ کا حلال کیا ہوا جو بچ رہے تمہارے لئے بہت بہتر ہے اور میں تم پر نگہبان اور داروغہ نہیں ہوں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ اے شعیب! کیا تمہاری صلوٰۃ تمہیں یہی حکم دیتی ہے کہ ہم اُن معبودوں کو چھوڑ دیں جنہیں ہمارے آبا واجداد پوجتے تھے اور ہم اپنے مالوں میں بھی ویسا تصرف نہ کرسکیں جو کرنا چاہتے ہیں، تم تو بڑے بردبار اور نیک کردار آدمی ہو۔

۱۔ ھود: ۸۴ تا ۸۷

ہر نبی عبادات کے ساتھ فرائض واحکام کی تعلیم بھی دیتا رہا ہے۔ حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو رزقِ حلال اور جائز تجارت کا حکم دیا، جس میں ناپ تول کی کمی بیشی نہ ہو، صلوٰۃ سے واضح طور پر مراد نماز ہے، مگر یہ لفظ وسیع ترین معانی میں پورے دین کے لئے استعمال ہوا ہے، پورا نظامِ دین، جس میں عبادات، معاملات اور فرائض واحکام سب شامل ہیں، خاص طور پر زکوٰۃ وصدقات۔ مشرکوں اور منافقوں پر زکوٰۃ بہت گراں گزرتی ہے، جس کا اندازہ نبیٔ اکرم ﷺ کے وصال کے بعد انکارِ زکوٰۃ کے فتنے سے ہوسکتا ہے۔ یہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی فراست، ایمان اور استقلال تھا جس نے اس فتنے کی جڑ کاٹ دی ہے۔ (قومِ شعیبؑ کا حضرت شعیب علیہ السلام کو حلیم الرشید کہنا استہزا کی ایک شکل ہے)

جماعتِ مومنین کی شیرازہ بندی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتبلیغ کے ساتھ جماعتِ مومنین کی شیرازہ بندی، اُن کی تعلیم وتربیت اور اُن کو احکام وفرائض کی تعلیم بھی وابستہ ہے۔ ۳ نبوت میں آپ کو کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دیا گیا۔ اُس سے پہلے آپ ﷺ نے قریبی عزیزوں کو دعوتِ اسلام دی اور اولین مسلمانوں نے اپنے قریبی دوستوں اور قابلِ اعتماد عزیزوں تک اسلام کا پیغام پہنچایا، یوں مسلمانوں کی تعداد چالیس پینتالیس افراد تک پہنچ گئی۔ یہ اہلِ ایمان ایک دوسرے سے حرمِ کعبہ میں ملتے اور اشاروں، کنایوں میں گفتگو کرتے، پہاڑوں کی گھاٹیوں میں مل بیٹھتے، مل کر نماز پڑھتے اور اپنے ربّ کی عبادت کرتے، باہمی صلاح ومشورہ کرتے، نبی کریم ﷺ کی معیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی کوشش کرتے، آپ ﷺ سے طہارت اور وضو کے احکام معلوم کرتے اور نماز سیکھتے۔ اسی ابتدائی دور میں سورۃ المدثر نازل ہوئی۔ بہت سی مستند روایات کے مطابق سورۂ اقرأ کی پہلی پانچ آیات کے بعد المدثر سب سے پہلے نازل ہونے والی سورۃ ہے جس میں آپ کو تنذیر کے لئے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا، اپنے رب کی تکبیر بلند کرنے کا فریضہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ پاکیزگی کا حکم آپ کو اور جماعتِ مومنین کو دیا گیا اور بت پرستی اور تمام معصیتوں سے اہلِ ایمان کو روکا گیا۔ معاشرتی احکام میں اس بات کو اولیت دی گئی کہ معاوضے کے خیال سے کسی پر احسان نہ کیا جائے اور اس ''نئے'' راستے پر چلنے والوں کو صبر کی تلقین کی گئی اور صبر بھی اپنے رب کے لئے۔ ''صلوٰۃ'' اور ''صبر'' اسی نسخے کو اپنا کر اہلِ ایمان ہر ظلم کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

نماز ابتدائی دور میں بھی مسلمان برابر اور پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے، اگرچہ پنج وقتہ نمازوں کی فرضیت واقعۂ معراج سے وابستہ ہے۔ نماز جسے سرکارِ عالم و عالمین ﷺ نے ''معراج المومنین'' قرار دیا، تحفۂ معراج ہے لیکن یہ بات بڑی حد تک متفق علیہ ہے کہ بالکل ابتدائی دور میں صبح اور شام کی دو نمازیں فرض قرار دی گئیں اور ان دونوں نمازوں میں دو دو رکعتیں ادا کی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں یہ آیت دلیل کے طور پر پیش کی جاتی رہی ہے:

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَاللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ O (۱)

اے نبی! آپ صبر کیجئے، بے شک اللہ کا وعدہ حق ہے۔ آپ (اور آپ کے رفقا) اپنی کوتاہی پر استغفار کرتے رہیں اور صبح و شام اپنے ربّ کی تسبیح اور حمد بیان کرتے رہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم پیدا کئے گئے تھے اور آپ ہر گناہ سے محفوظ و مامون تھے۔ ذنب کے لغوی معانی ہیں ''ذَم''۔ اسی لئے اُن تہمتوں کو بھی ذنوب کہتے ہیں جو کسی آدمی کے پیچھے لگا دی جائیں۔ سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر اعلان فرمادیا کہ اے رسول! آپ پر جو اتہام پہلے لگائے گئے، یا بعد میں لگائے جائیں گے ہم نے آپ کو اُن سے محفوظ کر دیا اور یہ فتحِ مبین اُس کا ایک ثبوت ہے۔ اور حضور ﷺ کی مستقل مغفرت طلبی شکر کی ایک صورت ہے۔ صبر اور صلوٰۃ رزمِ حق و باطل میں اور کارگاہِ حیات میں مومن کے وہ ہتھیار ہیں جو اُسے اُس کے رب نے عطا کئے ہیں۔ نماز تو مومن کی اللہ تعالیٰ سے سرگوشی اور کلام ہے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کا راستہ ہے اور صبر ایک ایسی اخلاقی قوت ہے جو اُسے استقامت عطا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اخلاقِ عالیہ عطا کئے ہیں اُن میں ہر خُلق دوسری اخلاقی خوبی سے ہم رشتہ ہے۔ صبر کا نتیجہ استقامت ہے۔ استقامت راہِ حق میں ہر قربانی کے لئے تیار کرتی ہے اور مومن میں یہ قربانی اس یقین کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے کہ اُس کا اللہ اُس کے ساتھ ہے۔ یہ تعلق باللہ نماز کے ذریعے مستحکم ہوتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا:

۱۔ المومن: ۵۵

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (۲)

اور اللہ کی مدد صبر اور صلاۃ کے ذریعے طلب کرو۔

نماز کے حکم سے پہلے صبر کا حکم دیا گیا، اور صبر کی تلقین میں نصرتِ حق کا مژدہ بھی شامل ہے۔ سورۂ العصر ابتدائی قرآنی سورتوں میں سے ہے۔ اس کے اختصار، اس کے معنی اور اس کے احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُسی دور کی سورۃ ہے:

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)

زمانہ اس حقیقت کا شاہد ہے کہ بے شک انسان خسارے میں ہے، سوائے اُن کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے، اور جنہوں نے ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

تین آیات کی اس مختصر سورت پر غور کرتے جایئے، انسان کی پوری تاریخ آپ کی نظروں کے سامنے سے زندہ مناظر کی طرح گزرتی جائے گی۔ تاریخِ انسانی اور مصر و نینوا کے کھنڈرات، یونان، ہند کے باقیات اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ اول و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا۔ بس وہی نقش قائم رہتے ہیں جن کو انبیائے کرام نے وحی الٰہی کی روشنی میں پیش کیا اور جن پر اہل ایمان کے ایمان اور عمل کی مہر ثبت ہے۔ ''ایمان'' اور ''عملِ صالح'' کا تعلق افراد کے قلب و ذات سے ہے اور وصیت بالحق اور وصیت بالصبر کا رشتہ اہل ایمان کے معاشرے سے ہے۔ بالخصوص سابقین الاولین سے، جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے تھے، دُکھ سہتے اور ظلم برداشت کرتے تھے۔ روایات کے مطابق اس دورِ ابتلا و آزمائش میں جب دو مسلمان ایک دوسرے سے ملتے تو اُس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک ایک دوسرے کو سورۂ العصر نہ سنا دیتے۔ یہ تین آیات اُن کے لئے ہدایت نامہ بھی تھیں، اُن کے ایمان کا اعلان بھی، اور

۲۔ البقرۃ: ۴۵

۳۔ العصر

اُن کا منشورِ حیات بھی تھیں۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قریبی رشتے داروں میں تبلیغِ حق کے بعد کھلم کھلا اسلام کی دعوت دینے کا حکم ملا تو آپ نے اس فریضے کو تنِ تنہا انجام دینا شروع کیا۔ اُس وقت تک ۴۰۔۴۵ افراد حلقۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ ان میں پس ماندہ اور کچلے ہوئے طبقے کے افراد بھی تھے۔ کئی مسلمانوں کو کسی قبیلے کی حمایت بھی حاصل تھی۔ نبی اکرم ﷺ کا دل مسلمانوں کے لئے خزینۂ رحمت تھا۔ کسی مسلمان کی ادنیٰ سی تکلیف آپ کو مجسم اضطراب بنا دیتی۔ یہ وہ ذاتِ گرامی تھی جس کے جوتے طائف میں خون آلود ہوئے تھے، اور اس طرح کہ آپ کے تلوے سے چپک گئے تھے۔ اس عالم میں بھی آپ استحکام کے قلعے کی مستحکم فصیل کی طرح کھڑے رہے اور کسی حرفِ شکایت کے بغیر۔ لیکن اسلام کے اس ابتدائی دور میں جب کوئی بے سہارا آپ کے پاس آیا اور اُس نے آپ کے حضور اسلام قبول کیا تو آپ نے کہا کہ اپنے اسلام کو فاش نہ کرو، اپنے وطن واپس جاؤ اور جب سننا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کر دیا ہے تو ہمارے پاس آ جانا۔

نبی کریم ﷺ کی یہ شفقت، مسلمانوں کے ساتھ آپ کا یہ رحم اور مکمل رافت آپ کے خُلقِ عظیم کا عجب پہلو ہے۔ آپ کی رافت و رحمت صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھی۔ آپ حیوانوں پر شفقت فرماتے۔ بے زبان جانور بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس رحمت کا شعور رکھتے تھے۔ وہ اُونٹ جن کے مالک اُن سے زیادہ مشقت لیتے اور انہیں مناسب غذا نہ دیتے یا انہیں مارتے پیٹتے، رحمتِ عالم ﷺ سے اُن کی شکایت کرتے۔ آپ کا یہ حسنِ سلوک پودوں اور درختوں کے ساتھ بھی تھا۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایسی چراگاہوں، سبزہ زار اور باغات کی سرپرستی فرمائی جنہوں نے ماحول کو حسن اور صحت بخشی عطا کی تھی۔ سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کو باغات میں تفریح کی غرض سے کچھ وقت گزارنے کا شوق تھا۔ آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے۔ تفریح کے ساتھ اُن کی تعلیم اور تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ یہ آپ ﷺ کی رحمت اور رحم کا ایسا ماجرا تھا جو اپنی وسعت میں ایک ختم نہ ہونے والا دفتر بن گیا تھا۔ ہم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے اس مطالعے

میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار اور اُن ادوار میں واقعات و حالات کے سبب اُبھرنے والی اخلاقی صفات زمانی ترتیب سے آپ کے سامنے آ سکیں، لیکن ہادیٔ اعظم ﷺ کی رحمت ہر دور میں نمایاں رہی ہے، اسی لئے ہم اس کا ذکر قدرے تفصیل سے دعوت کے ابتدائی مراحل میں ہی کر رہے ہیں اور یہ داستانِ دل نواز مختلف ادوار میں مختلف اسالیب سے اپنے آپ کو دُہراتی رہے گی۔

سورۃ الحجر مکی سورہ ہے اور اسی میں وہ عظیم آیت ہے جس میں آپ ﷺ کو عام تبلیغ کا حکم دیا گیا:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ O (۴)

پس آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اُسے کھول کر (واشگاف انداز میں) سنا دیجئے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔

اس سورہ کی آیات میں قرآنِ عظیم کے دوسرے سوروں کی طرح اندرونی اور معنوی ربط ہے۔ ایسا ربط جو مختلف احکام اور وضاحتوں کو ہم رشتہ کر دیتا ہے، جس نے نبی کریم ﷺ اور اُن کے ذریعے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو زندگی کے حقائق سے روشناس کیا اور اس طرح کہ وہ قرآنِ عظیم کی سات دہرائی جانے والی آیتوں کی نعمت کو پا کر دنیا کی تمام ترغیبات سے بے نیاز ہو گئے۔ اور اُن کی آسودگیٔ قلب کو صرف قرآنی اصطلاح ہی ادا کر سکتی ہے۔ ''نفسِ مطمئنہ''

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ O لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ O (۵)

یقیناً ہم نے آپ کو سات بار بار دہرائی جانے والی آیتیں اور قرآنِ عظیم عطا کیا ہے۔ آپ اپنی آنکھیں ہرگز اُن چیز کی طرف نہ دوڑائیں

۴۔ الحجر: ۹۴

۵۔ الحجر: ۸۷، ۸۸

(اور اُن کو مرکزِ توجہ نہ بنائیں) جو ہم نے اُن میں سے کئی طرح کے لوگوں کو دے رکھی ہیں اور نہ آپ ان چیزوں کے نہ ہونے پر افسوس کریں اور مؤمنوں کے لئے اپنے بازو جھکا دیجئے (جس طرح پرندے اپنے بچوں کے لئے اپنے بازو پھیلا دیتے ہیں)

اس قرآنی بیان میں مکے کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی زندگی اور سرورِ کائنات کی دردمندی کا نقشہ نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مشرکوں کو حاصل تمام نعمتیں صرف سورۂ فاتحہ کے سامنے کتنی حقیر ہیں۔ ان سات آیتوں میں اسلام کی روح اُسی طرح سمٹ کر آ گئی ہے کہ جس طرح ہماری آنکھوں کی پتلی میں وسیع آسمان سمٹ کر آ جاتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری یہ تشبیہ سورۂ فاتحہ کی وسعتوں کو سمیٹ نہیں سکتی۔ سورۂ فاتحہ میں ہمیں اپنے رب کے اپنی شہ رگ سے نزدیک تر ہونے کا یقین اور احساس ہوتا ہے اور ہم اُس کی حمد بیان کرتے ہیں، اُس کی رحیمی اور رحمانیت کے سمندروں میں غوطہ زن ہوتے ہیں، روزِ آخرت میں بھی اس دنیا کی طرح اُس کی حاکمیت کا ادراک کرتے ہیں اور اُس سے مدد مانگتے ہوئے اُس کی عبودیت کا اقرار کرتے ہیں، یہ سورہ انسان کی روح کی دُعا ہے جو گمراہوں اور عتاب زدہ افراد سے الگ ہو کر اپنے لئے نجات و عافیت اور جنت طلب کرتی ہے۔

اُس وقت مسلمان دنیوی آسائشوں سے دور ایمان کی ڈوری کو پکڑتے ہوئے شرک کی تمام قوتوں کے خلاف نبرد آزما تھے اور انہیں رہبرِ دُنیا و دین کے ذریعے تسلی دی جا رہی ہے کہ مال و متاعِ دُنیوی کا غم نہ کرو اور حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ تمہاری شفقت سب سے بڑی رحمت اور حالات کے سورج کے مقابل سایۂ رحمت ہے۔

زمانے کے مقابل تنہا، مگر اپنے ربّ کے ساتھ

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اسلام کی علانیہ تبلیغ حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تن تنہا شروع کی۔ آپ میلوں اور بازاروں میں تشریف لے جاتے، باہر سے آنے والے زائروں اور تاجروں کے پاس جاتے اور انہیں توحید کی دعوت دیتے۔ وہ بدبختِ ازلی جس کی ناکامی اور ''ہلاکت'' کی خبر قرآنِ مجید نے دی ہے آپ کے پیچھے پیچھے ہر مجمع میں پہنچ جاتا، آپ کا مضحکہ اُڑاتا اور اجنبیوں سے کہتا کہ اس شخص نے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے، ہم میں تفرقہ پیدا کر دیا ہے، ہمارے معبودوں کا مذاق اُڑاتا ہے، اس کے پھندوں میں نہ پھنس جانا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابولہب اور دوسرے قریشیوں کی مخالفت کا سامنا انتہائی تحمل سے فرماتے اور باہر سے آنے والے آپ کے وقار، اخلاق اور تحمل کا موازنہ قریش کے طرزِ عمل سے کرتے اور یوں اُن کے دل حضور نبی کریم ﷺ کی دعوت کی طرف جھکنے لگتے۔ ضلالت کے اس طوفان میں نبیٔ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام مسلسل حرم شریف جاتے رہے، خانۂ کعبہ کا طواف کرتے رہے، مقامِ ابراہیم پر نماز ادا کرتے رہے۔ عام صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ہدایت تھی کہ وہ آپ سے دور رہیں، ہاں حضرت ابوبکر صدیقؓ جہاں تک ممکن ہوتا آپ کے ساتھ رہتے اور جب قریش کا طرزِ عمل ناقابلِ برداشت ہو جاتا تو آپ کی حفاظت اپنی سلامتی اور جان کی قیمت پر کرتے۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علاوہ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اکثر مسجد الحرام پہنچ جاتے اور آئمۂ کفر کے سامنے کلمۂ حق ادا کرتے بلکہ

حضرت حمزہؓ نے سرورِ کائنات کے ساتھ ابوجہل کی بدسلوکی اور گستاخی کی خبر سنتے ہی شکار سے واپسی پر حرم کا رخ کیا اور مجمع آئمہ کفر میں پہنچ کر اپنی کمان ابوجہل کے سر پر اس زور سے ماری کہ کمان ٹوٹ گئی، اور آپؓ نے اعلان کیا کہ سن لو! حمزہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اسی طرح حضرتِ عمرؓ کے مسلمان ہونے پر اہلِ ایمان نے اس زور سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا کہ حرم کعبہ تک صدائے تکبیر پہنچ گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خانۂ کعبہ کا طواف کرتے تو سردارانِ کفر آپ کا تمسخر اُڑاتے، ایک دوسرے کو اشارے کرتے اور ٹھٹھے مار کر ہنستے۔ ایک دن قریش نے آنحضرت ﷺ کی پشت اور کندھوں کے درمیان خون آلود اوجھڑی اُس وقت ڈال دی جب آپ سجدے میں تھے اور آپ کا دم گھٹنے لگا۔ اُسی وقت حضرت فاطمہؓ تشریف لائیں اور اُس بوجھ کو اٹھا کر آپ کے جسم سے الگ کیا۔ آپ کے جسم کو صاف کیا اور قریش کو برا بھلا کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز سے فارغ ہو کر اپنے ہاتھ دُعا کے لئے بلند کئے اور ہمیشہ کافروں کے لئے ہدایت کی دعا کرنے والے کے ہونٹوں سے تین مرتبہ یہ بد دُعا بلند ہوئی:

اے ربّ کعبہ! قریش کو پکڑ لے۔ عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، عمار بن ولید، اُمیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط کو پکڑ لے۔

اور یومِ فرقان، یومِ بدر اُن کی پکڑ کا دن تھا۔ جب ان کے لاشے خاکِ بدر پر پڑے ہوئے تھے، سورج کی بے مہر کرنیں عذابِ الٰہی بن کر اُن کو جھلسا رہی تھیں۔ اس دنیا ہی میں اُن پر ابدی عذاب کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ وہ تھے جن میں سے ایک نے آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر تھوکا تھا، ایک نے آپ کی گردنِ بلند پر اپنا پیر اس زور سے رکھا تھا کہ آپ کی آنکھیں جیسے حلقۂ چشم سے باہر نکل آئی تھیں، ان میں وہ تھا جس نے آپ کے چہرے اور سر پر مٹی ڈالی تھی، ان میں ایک وہ تھا جس نے آپ کی پشت مبارک پر اوجھڑی ڈالی تھی۔ یہ سب زمین کا بوجھ تھے اور زمین انہیں قبول کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ آخر ان کے لاشے بدر کے کنوئیں میں پھینک دیئے گئے۔

حرم کعبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جب ایسے ظلم کئے گئے تو آپ

نے اُن ظالموں کو اُن کے انجام سے باخبر کر کے رسالت کا حق ادا کر دیا۔

ایک دن حضور نبی کریم ﷺ مقام ابراہیم پر نماز ادا کر رہے تھے تو عقبہ بن ابی معیط نے آپ کی گردن میں اپنی چادر ڈال کر اس زور سے کھینچی کہ آپ ﷺ زمین پر گر گئے اور قریش سمجھے کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ اطلاع پا کر پہنچے اور اپنے رسول کو زمین سے اُٹھایا۔ حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو آپؐ نے سایۂ کعبہ میں بیٹھے ہوئے آئمہ قریش سے جا کر فرمایا کہ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے کہ مجھے تمہاری طرف تمہیں ذبح کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ اور آپ نے اپنے ہاتھوں کو اس طرح جنبش دی کہ جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو، ابوجہل نے کہا کہ محمد! تم نادان تو نہیں ہو۔ کیا ہوا جو ایسی باتیں کر رہے ہو؟ آپ نے ابوجہل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ تم بھی ان ذبح ہونے والوں میں سے ایک ہو۔

سردارانِ کفر کے ازدہام میں صرف اللہ کا رسول ہی اس لہجے میں بات کر سکتا تھا۔ صرف وہ انسان ہی ان کفرزادوں کو اُن کا انجام دکھا سکتا تھا جس کے ربّ نے اُس کے لئے مستقبل کے مناظر کو لمحۂ حال بنا کر پیش کر دیا ہو، جسے اُس کے رب نے یہ یقین دلا دیا ہو کہ تمہارا ربّ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ المائدہ اگرچہ مدنی سورت ہے مگر اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی اس حفاظت کی یقین دہانی کا اظہار کیا گیا ہے جس سے آپؐ کے ربّ نے آپؐ کو تبلیغ کے ابتدائی دور ہی میں مطلع کر دیا ہوگا:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ۚ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (۱)

اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اُسے (لوگوں تک) پہنچا دیجئے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو رسالت کا حق ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں (کی اذیت

۱۔ المائدہ: ۶۷

رسانی) سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اخلاقِ انسانی کا اہم نکتہ یہ ہے کہ اخلاقی صفات ایک دوسرے سے مربوط اور پیوستہ ہوتی ہیں، اور ان کے درمیان تناسب اور توازن کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر اخلاق ایک کُل نہیں بن سکتا۔ پھر اخلاقی صفات و اعمال میں مداومت کے بغیر کسی کے اخلاق کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ایک سخی آدمی اہل ضرورت کا خیال رکھتا ہے، اُن کو خوب نوازتا ہے، لیکن اگر کسی وقت اُس کے مزاج میں برہمی ہے تو وہ اُنہیں سختی سے جھڑک دیتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اہل ایمان میں اپنی مثال اور اُسوۂ حسنہ سے اسی اخلاقی وکلیت کا سبق دیا ہے۔ آپ کا صبر، استقلال سے جڑا ہوا تھا، اور اس استقلال میں اقامت کا رنگ بھرا ہوا تھا۔ یہی استقلال، اقامت، شجاعت اور بہادری کی انتہائی صورت تھا۔ جب آئمۂ کفر کا جمگھٹا زیرِ سایۂ دیوارِ کعبہ، رعونت اور ظلم کی تصویر بنا بیٹھا تھا آپ ﷺ نے اُن کو بے خوفی کے ساتھ اُن کے ذبح کیے جانے کی خبر دی۔ اس شجاعت کا دوسرا پہلو آپ کا عفو و درگزر ہے۔ جب یہی جان کے دشمن فتحِ مکہ کے دن سر جھکائے، دھڑکتے دل کے ساتھ آپ ﷺ کے فیصلے کے منتظر تھے تو آپ ﷺ نے اُنہیں لاتثریب علیکم الیوم کی بشارت دی۔

توازن کی صفت آنے والے صفحات میں، آپ ﷺ کی دوسری اخلاقی صفات کے تذکرے کے ساتھ روشن تر ہوتی جائے گی۔ ہم ابتدائی مکی دور میں آپ کے صبر اور حق کی راہ میں آپ کی قربانی اور سب کچھ نثار کرنے کے باب میں صرف ایک اور واقعہ پیش کرنے کے بعد صحابۂ کرامؓ کے صبر کی چند مثالیں پیش کریں گے، کیونکہ صحابۂ عظامؓ کا صبر بھی آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا ایک نقش اور آپ ﷺ کے صبر کا پرتو ہے۔ اس واقعے سے ہم پر یہ حقیقت بھی اپنی تمام معنویت اور پہلوؤں کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے:

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (۲)

نبی (ﷺ) مومنوں پر خود اُن کی ذات سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

اس قرآنی ارشاد سے اس حدیث کے معانی کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے:

۲۔ الاحزاب: ۶

لایُؤْمِنُ احدکم حتیٰ اکون احبَّ الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (۳)

تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اُسے اپنے والدین، اپنی اولاد، تمام انسانوں حتیٰ کہ اپنی ذات سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔

اس واقعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ''ثانی اثنین اسلام و غار و بدر و قبر'' نے کس طرح حبِ رسول کو مومن کی زندگی کی حقیقت بنا دیا تھا۔ ایک دن حرمِ کعبہ میں قریش کے سرداروں نے نبیٔ اکرم ﷺ کی تبلیغی گفتگو کو روکنے کے لئے ہر طرف سے آپ کو اپنے نرغے میں لے لیا اور چادر ڈال کر آپ کا گلا گھونٹنے لگے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی ساتھ تھے۔ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچانے کے لئے قریش کے سرداروں کو دھکا دینا اور پیچھے ہٹانا شروع کیا۔ آپ روتے جاتے اور کہتے جاتے کہ تم اس شخص کو صرف اس لئے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ یہ کہتا ہے کہ اللہ میرا رب ہے۔ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی مزاحمت سے کافروں کے غصے میں اضافہ ہوتا گیا۔ عقبہ بن ربیعہ نے پرانے اور سخت تلوے والے جوتے سے آپؓ کے چہرۂ مبارک پر اتنی ضربیں لگائیں کہ چہرہ خون میں ڈوب گیا، اور ورم کی وجہ سے خدوخال پہچانے نہ جاتے تھے:

بنی تمیم آپ کو بے ہوشی کے عالم میں اُٹھا کر لے گئے۔ موت ابوبکرؓ کو چھو کر گزر گئی۔ گھنٹوں کے بعد جب ہوش آیا تو جو لفظ زبان سے ادا ہوئے وہ یہی تھے کہ رسول اللہ تو خیریت سے ہیں؟

آپ کو اپنی قبائلی حمیت کی بنا پر بچا کر لانے والے عمائدِ بنو تمیم برا بھلا کہنے لگے کہ دیکھو اپنی پروا نہیں، اُسی کا ذکر ہے جس کی وجہ سے اس حال کو پہنچے۔

اُمِ جمیل مسلمان ہو چکی تھیں۔ وہ جب قریب آئیں تو اُن سے بھی یہی سوال کیا۔ اُنہوں نے اشارے سے کہا کہ کیسے بتاؤں، آپ کی والدہ سن لیں گی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ ان کے سامنے بتا دو، کوئی بات نہیں، اُمِ جمیل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت

۳۔ احمد بن حنبل/ المسند۔ بیروت، دار احیاء التراث العربی، ۱۹۹۳ء: ج ۴، ص ۱۸۳، رقم ۱۳۴۹۹

سے مطلع فرمایا تو بے ساختہ الحمدللہ کہا۔ جب (حضرت ابوبکرؓ کو) کوئی مشروب پیش کیا گیا تو جانثار محمد عربی ﷺ نے انکار کر دیا اور کہا کہ اللہ کے حضور میری یہ نذر ہے کہ چہرۂ زیبائے رسول اللہ کو دیکھے بغیر نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا۔ جب قبیلے والے چلے گئے تو اپنی والدہ اور اُم جمیل کا سہارا لے کر ہزار دقت سے اپنے آپ کو گھسیٹتے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ ابوبکرؓ کی وفاداری کے اس نقش کو دیکھ کر سرکارِ ختمی مرتبت کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہ لکیر نمودار ہوئی جس میں مستقبل کے پردے میں چھپی ہوئی اسلام کی ساری کامیابیوں اور فتوحات کی روشنی تھی۔ صاحبِ خلقِ عظیم ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ کی والدہ کا شکریہ ادا کیا اور یہی وہ لمحہ تھا کہ اُن کا دل اسلام کے لئے کھل گیا اور وہ مسلمان ہوگئیں۔ (۴)

۴۔ سید ابوالخیر کشفی / حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، قرآنِ حکیم کے آئینے میں۔ کراچی: دادا بھائی فاؤنڈیشن، ۱۹۹۱ء: ص ۱۰، ۱۱

دارِ ارقم۔ پہلا دارالاسلام

نبوت کے تیسرے سال تک اسلام قبول کرنے والے حرمِ کعبہ میں، بازاروں میں، مکۂ معظمہ کی وادیوں میں ایک دوسرے سے ملتے اور چھپ کر عبادت کرتے۔ تبلیغ کا تیسرا سال تھا حضرت ارقم بن الارقمؓ کا وجود نورِ ایمان سے منور ہوگیا۔ اُن کا مکان عام رہ گزر اور بستی سے الگ کوہِ صفا کے قریب تھا۔ اُنہوں نے اپنا مکان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام لانے والوں کے لئے وقف کر دیا۔ یہ دارالکفر میں پہلا ''دارالاسلام'' تھا۔ حضرت ارقم بن الارقمؓ ساتویں یا گیارہویں مسلمان تھے۔ ان آٹھ دس نفوسِ قدسیہ کو حضور نبی کریم ﷺ کی صحبتِ کردار ساز کے لئے سکون کی گھڑیاں نصیب ہونے لگیں۔ دارالارقم کی فیض بار اور ایمان آثار فضاؤں میں سعید روحیں آتیں اور دستِ رسالت مآب ﷺ پر بیعتِ ایمان کرتیں۔ اس مختصر سے گھر میں آیاتِ قرآنی کی مسلسل صدا ایک نغمۂ ابد کی طرح گونجتی، اللہ کے ذکر سے قلوب زندہ تر ہو جاتے، اور ان بندگانِ رب اور اُن کے رب کے درمیان دوسروں کی مداخلت کم سے کم تر ہوتی گئی، ورنہ اس سے پہلے جنگ و جدال کے امکانات آسانی سے پیدا ہو جاتے۔ ایک بار صحابۂ کرام ایک پہاڑ کی گھاٹی میں نماز ادا کر رہے تھے کہ کافروں کے ایک گروہ نے دیکھ لیا، تمسخر اور ٹھٹھول شروع کر دیا یہاں تک کہ ایذا رسانی تک پہنچ گئے۔ جماعتِ صحابہ رضی اللہ عنہم ہر تکلیف کا صبر سے مقابلہ کر سکتی تھی، مگر گروہِ مشرکین نے اسلام اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ نازیبا کلمات ادا کیے۔ اس پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک کافر کو اُونٹ کی ایک بڑی ہڈی سے ضرب لگائی اور اُس کا سر پھٹ گیا۔ یہ اسلام کے راستے

میں جہاد کا ''نقطۂ آغاز'' تھا۔

دارِارقم مسلمانوں کے لئے ایک پناہ گاہ کا درجہ رکھتا تھا، لیکن معاشرے سے کلیتاً بے تعلق ہو کر وہاں رہنا ممکن نہیں تھا۔ پھر ان اولین مسلمانوں میں سے کئی مشرکین کے غلام تھے۔ یہ مشرک مسلمان ہونے کی ''سزا'' کے طور پر اُن پر ظلم کے پہاڑ توڑتے تھے۔ اس سلسلے میں پہلا نام جو ذہن میں آتا ہے وہ حضرتِ بلال حبشیؓ کا ہے۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کا تعلق اگرچہ قبیلۂ تمیم سے تھا، لیکن غلام بنا کر مکۂ معظمہ میں بیچ دیئے گئے تھے۔ حضرت صہیبؓ رومی بھی غلام بنا کر مکہ معظمہ میں بیچے گئے تھے۔ حضرت یاسر، حضرت عمار اور حضرت عمار کی والدہ حضرت سمیہ بھی عرب معاشرے کے مظلوم طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سب پر ان کے مالکوں نے ظلم وستم ایجاد کیے۔ ان کے علاوہ عرب کے معزز گھرانوں کے جو نوجوان مسلمان ہوئے، اُن کے عزیزوں نے انہیں راہِ حق سے ہٹانے کے لئے طرح طرح کے آزار دیئے۔ اُن کے مظالم اور ان مسلمانوں کا صبر تاریخ انسانیت میں صبر اور ثابت قدمی کا عظیم باب ہے۔

اولین مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ عمر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو ایک سال چھوٹے تھے۔ باقی مسلمانوں کی عمریں اوسطاً تیس سال سے بھی کم تھیں۔ یہ وہ متلاشیانِ حق تھے جن کے مالی، معاشی اور کسی طرح کے مفادات خطرے میں نہیں تھے جو اُنہیں قبولِ حق سے روک سکتے۔ راہِ حق میں ان کے صبر و استقلال اور ہمت کو تاریخ نے اپنی پیشانی پر لکھ لیا ہے۔ تاریخ وسیرت اور طبقات الصحابہ سے متعلق کتابوں کے مطالعے سے یہ ایمان افزا ماجرا ہمارے سامنے آتا ہے۔ قارئینِ کرام سے درخواست ہے کہ قرآنِ مجید کی تلاوت اور ایمانیات کے بارے میں کتابوں کے علاوہ وہ سیرت النبی ﷺ اور حیاتِ صحابہؓ پر مشتمل کتابوں کا پابندی سے مطالعہ کیا کریں تاکہ ہمارے معیاری نمونے (رول ماڈل) ہمارے سامنے رہیں۔ جناب محمد یوسف کاندھلوی علیہ الرحمہ کی کتاب حیات الصحابہؓ کی تینوں جلدوں کا ترجمہ اُردو میں ہو چکا ہے۔ مترجم ہیں مولانا محمد احسان الحق۔ اسے اپنے مطالعے کی بنیادی کتابوں میں شامل کر لیجیے۔

صحابۂ کرامؓ کا صبر

ہم اس دورِ آزمائش وابتلا کے چند واقعات پیش کر رہے ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ ایمان کے مقابل جانِ عزیز کی کوئی قیمت نہیں۔ سابقین الاولین نے اپنی زندگی کی قیمت پر اسلام کو اپنایا۔

حضرت عمارؓ، اُن کے والد حضرت یاسر رضی اللہ عنہما اور اُن کی والدہ حضرت سمیہؓ کو اُن کے آقا پتھریلی اور ریتیلی زمین پر گرمیوں کی دوپہر میں ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیتے۔ ایک دن جب وہ یہ اذیت برداشت کر رہے تھے تو رحمتِ عالم ﷺ کا اُدھر سے حضرت عثمانؓ کے ساتھ گزر ہوا۔ اپنے رسول اور ہادی ﷺ کو دیکھ کر حضرت یاسرؓ کے ہونٹوں پر یہ فریاد اُبھری کہ یارسول اللہ! (ﷺ) کب تک۔ کیا ہم مرنے تک یوں جئیں گے۔ سرکارِ دوعالم ﷺ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ آپ نے مظلوم سے کہا اے آلِ یاسر صبر کرو اور اپنے رب سے دُعا فرمائی۔ بارِ الہا! آلِ یاسر کی مغفرت فرما۔ یہ دونوں جملے نبوت کے معجزے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک طرف مظلوم کی ہمت افزائی اور دوسری طرف ربِ کائنات سے مغفرت کی دعا۔ مغفرت کی دُعا میں عقبیٰ کے ساتھ ساتھ دُنیا بھی شامل ہے کہ ظلم سے نجات ملے۔

ابوجہل کی پوری زندگی ایک مسلسل تاریکی تھی لیکن اُس کے سیاہ تر کرتوتوں میں یہ بھی ہے کہ اُس نے حضرت سمیہؓ کی شرم گاہ میں اس بے رحمی سے نیزہ مارا کہ وہ شہید ہو گئیں۔ اسی طرح حضرت یاسرؓ بھی اذیتوں کی تاب نہ لا کر اپنے ربّ کے حضور پہنچ گئے۔ یہ وہ شہیدانِ وفا تھے کہ مرتے وقت اُن کے لبوں پر یہ کلمہ ہوتا کہ ''ربّ کعبہ کی قسم! ہم نے اپنی مراد پالی''۔

مشرکین قریش کے اپنے رواج اور دستور تھے۔ اُن میں یہ دستور بھی تھا کہ قبیلے اپنے افراد کی حفاظت کرتے اور اس طرح کہ دوسرے قبیلے والے اُن پر ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے سلسلے میں ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ غلاموں کا معاملہ مختلف تھا جس کا اندازہ حضرت یاسر اور حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہما کی شہادت سے ہو سکتا ہے۔

حضرت یاسر، حضرت عمار، حضرت سُمیہ رضی اللہ عنہم کی طرح حضرت بلال حبشیؓ، حضرت صہیب رومیؓ اور حضرت مقدادؓ کو کسی قبیلے کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ قریش اُس موسم میں جب زمین اور آسمان تپ رہے ہوتے، انہیں لوہے کی زرہیں پہناتے اور انہیں سخت دھوپ میں ہاتھ پیر باندھ کر رسیوں سے جکڑ کر ڈال دیتے۔ ان سب نے اپنے اپنے طور پر اس ظلم کا سامنا کیا لیکن بلال رضی اللہ عنہ نے تو اپنے لہو سے ایسا گلستان تعمیر کیا جس میں حبِ محمد عربی ﷺ کے جاوداں پھول اب تک مہک رہے ہیں۔ مشرکوں نے حضرت بلالؓ کو اپنے اوباش نوجوانوں کے سپرد کر دیا جو اُنہیں آہنی زرہ بکتر میں ملبوس مکّے کی گلیوں میں کھینچتے پھرتے مگر مشرکین مکہ کو حد درجہ پشیمانی اور پریشانی ہوئی کہ بلال رضی اللہ عنہ کی زبان سے ایک بار بھی اُف اُف کی آواز نہ سنائی دی اور اُن کے لبوں سے اَحد، اَحد کا ترانہ اُبھر کر فضا کو منور اور معطر کرتا رہا۔ بلالؓ ایک فرد کا نام نہیں بلکہ ظلم کے مقابل انسانی برداشت کا نام ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لفظ بلال ایک نعرۂ حق بن گیا ہے جو ظلم کی ہر رات میں روشنیٔ حق سے چراغاں کرتا ہے۔

آخر ایک دن اُمیہ بن خلف اور ابوجہل وغیرہ حضرت بلالؓ کو طرح طرح سے اذیتیں دے رہے تھے، اُدھر سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گزر ہوا تو اُنہوں نے ان ظالموں پر نفریں کی۔ جواب میں اُمیہ نے کہا کہ اگر اس کا اتنا ہی درد ہے تو اس نگمّے کو خرید کیوں نہیں لیتے۔ حضرت صدیقؓ نے کہا کہ یہ اتنا قیمتی ہے کہ تم اس کی جو قیمت لگاؤ گے، مجھے منظور ہوگی اور یوں اُسؓ نے جس کا لقب عتیق تھا، حضرت بلالؓ کو اس جہنم عذاب سے نجات دلائی۔ پندرہ صدیاں ہونے کو آئیں، مگر بلال رضی اللہ عنہ کا نام آج تک وفا اور استقامت کا مترادف ہے:

راہِ وفا میں پھول کھلائے بلالؓ نے
اپنے لہو سے خود کو گلستاں کئے ہوئے

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے آلِ یاسر اور حضرت بلالؓ کی طرح اسلام قبول کرنے کی پاداش میں بے حد اذیتیں برداشت کیں۔ ایک دن مشرکوں نے آگ دہکائی اور اس پر حضرت خبابؓ کو لٹا دیا، اور آخر یہ آگ خباب کی چربی پگھلنے سے ٹھنڈی ہوئی۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی تھی کہ چربی سے آگ اور بھڑکنے کی بجائے بجھ گئی۔

یہ ظلم و ستم بے سہارا غلاموں تک محدود نہ تھا، بلکہ مکّے کے معزز خاندانوں کے جو نوجوان مسلمان ہو گئے تھے اُن کے بزرگ والد، چچا اور دوسرے فرد بھی انہیں دینِ آبا میں واپس لانے کے لئے قید و بند، تعزیر اور ظلم سے کام لیتے، لیکن اسلام کا سُرور ایسا نہیں تھا جو ان حربوں سے اُتر جاتا بلکہ یہاں تو ''ذوقِ جرم'' ہر سزا کے بعد بڑھتا تھا۔ حضرت عثمان بن عفانؓ مسلمان ہوئے تو اُن کے چچا حکم ابوالعاص بن اُمیہ نے ایسی رسیوں سے اُنہیں باندھ دیا کہ ہر گرہ کھال کو کاٹتی ہوئی گوشت میں اُترتی جاتی، اور چچا نے کہا کہ اپنے معبودوں کی قسم! جب تک تم اُن کو ماننے اور اُن کی عبادت کے لئے تیار نہیں ہو گے، ان رسیوں کی بندش یوں ہی تمہارے جسم میں پیوست ہوتی رہے گی۔ بھتیجے کا جواب تھا کہ ربِّ کعبہ کی قسم! وہ گھڑی کبھی نہیں آئے گی۔ اور آخر بھتیجے کا قول کُرسی نشین ہوا اور ظالم چچا کو رسیاں کھولنی پڑیں۔

ایک دن صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہوئے حضرت مسعود بن حراشؓ نے دیکھا کہ ایک نوجوان کے ہاتھ اُس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے تھے اور اُس کو کچوکے دینے والوں اور برا بھلا کہنے والوں کا ہجوم اُس کے گرد ہے۔ ان لوگوں میں ایک عورت بھی تھی جو بد زبانی اور برا بھلا کہنے والوں میں سب سے آگے تھی۔ میں نے معلوم کیا کہ معاملہ کیا ہے؟ تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان طلحہ بن عبید اللہؓ ہے اور اُس کو گھیر کر اذیت دینے والے اُس کے اعزا ہیں، جو چاہتے ہیں کہ طلحہ اسلام سے اپنی برّیت کا اعلان کر دیں، اور یہ عورت طلحہ کی ماں ہے، جس کی ممتا نفرت کی آگ میں جل بجھی۔

ہجرت محض عمل نہیں بلکہ اخلاقِ حسنہ کی ایک بنیاد

ہجرت محض ایک ''زمانی'' اور ''مکانی'' عمل نہیں ہے، بلکہ ہجرت کا عمل کئی ایسی اخلاقی صفات کے اُبھرنے کا محرک بنتا ہے جو کسی اور طریقے سے انسان کی ذات، شخصیت اور کردار کا حصہ نہیں بن سکتیں۔

اپنے مقصد، اپنے ایمان اور ایک مسلم معاشرے کے قیام کے لئے اپنے وطن کو چھوڑ دینا اللہ پر توکل اور اعتماد کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ توکل اور اعتماد علی اللہ کی اخلاقی صفت ہجرت کے عمل سے پیدا ہوتی ہے، اسی لئے ہم ہجرت کو کتابِ اخلاقِ نبی ﷺ میں شامل کرنے کی سعادت حاصل کرر ہے ہیں۔

اپنے وطن کو چھوڑ کر نئے دیار کا رُخ کرنا مستقبل کے سمندر میں اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے چھلانگ لگانے کے مترادف ہے۔ ماں یا بچے، عزیز و اقارب کو چھوڑنا، بچپن جن گلی کوچوں میں گزرا، اُن سے جدائی، ساتھی سنگیوں سے مفارقت، اجنبی ماحول میں اجنبی لوگوں کے ساتھ زندگی کی روش کیا ہوگی؟ اس سوال میں کتنے ہی سوال چھپے ہوئے ہیں۔

نبوت کے پانچویں سال میں جب مسلمانوں پر ظلم و جبر کی کوئی انتہا نہ رہی تو حضور ﷺ نے اپنے رفقا کو ہجرت کی اجازت عطا کی۔ حضور نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ فیصلہ ''اندھیرے میں تیر'' نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے نبوی بصیرت اور ربانی ہدایت کے تحت ہجرتِ صحابہؓ کے لئے حبشہ کا انتخاب کیا۔ بعض شہادتوں کے مطابق سرورِ کائنات ﷺ نجاشی سے ذاتی طور پر واقف تھے، اور اس بات کو بھی آپ نے اہمیت دی کہ حبشہ والے وحیٔ الٰہی اور پیغامِ ربانی

کے سلسلے سے واقف تھے۔ آخرت کا تصور اُن کے لئے اجنبی نہیں تھا۔ ہادیٔ برحق ﷺ نے نبوت کے تیرہویں برس میں ہجرت کی اور اُس سے کئی سال پہلے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ہجرت کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہ حقیقت مسلمانوں کے ساتھ آپ ﷺ کی شفقت اور رحمت کا ثبوت ہے۔ آپ اللہ کے پیغام کی تبلیغ کے لئے اُسی جگہ مقیم رہے جہاں آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا، جہاں کفر کے سردار جمع تھے، جہاں اندھیروں میں آپ ﷺ کی تبلیغ کی روشنی سعید روحوں کے لئے ہدایت کا راستہ بن رہی تھی، جہاں کے قیام سے آنے والے برسوں میں یثرب کو مدینۃ النبی ﷺ اور اسلامی ریاست کا مرکز بننا تھا۔

حضور ﷺ نے حبشہ کا انتخاب کرتے ہوئے اوّلین مہاجرین سے فرمایا کہ وہاں کا حکمران کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ وہاں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کوئی سبیل پیدا کرے گا۔ آپ کے اس اعتمادِ کامل کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ پہلے قافلۂ مہاجرین میں آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت رُقیہؓ اور آپ کے داماد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ قافلۂ اوّل گیارہ مردوں اور چار خواتین پر مشتمل تھا۔ خواتین کی شمولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ حبشہ میں مسلمانوں کی سلامتی ایک واقعے کی طرح اللہ نے آپ ﷺ کی نظروں کے سامنے پیش کر دی تھی۔

ہجرت صرف خاتم الانبیا ﷺ کی سنت نہیں ہے، بلکہ یہ سنتِ انبیا علیہم السلام ہے، اور حضور کے جد اور ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔ اس سنت کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت رسولِ کریم ﷺ تک، اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تاریخ اور جغرافیہ دونوں کو بدل دیا اور اس عقیدے کو ہماری زندگیوں کا عنوان بنا دیا:

ہر ملک مُلکِ ما است

قرآنِ کریم کے مطابق ہجرت نقلِ مکانی کا نام نہیں بلکہ یہ ربّ العزت کی طرف سفر ہے، اور اس سے بڑی اخلاقی صفت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دُنیا سے منہ موڑ کر انسان یکسوئی کے ساتھ اپنے ربّ کا ہو لے۔

حضرتِ لوط، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ وہ اپنے چچا حضرت ابراہیم

علیہ السلام پر ایمان لائے۔ گمراہی زمین پر اس طرح پھیل گئی تھی کہ دنیا کے مختلف علاقوں کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی ضرورت تھی:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ O (۱)

پس لوط (ابراہیم پر) ایمان لے آئے اور کہنے لگے میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں۔ وہ ہی غالب اور حکمت والا ہے۔

میں اللہ کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں (اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ)۔ یہ سیاق و سباق میں حضرت ابراہیمؑ کا قول معلوم ہوتا ہے لیکن اس بات کا بھی قرینہ ہے کہ یہ بات حضرت لوطؑ نے کہی ہو اور تاریخی واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات دونوں نے کہی ہو، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ حضرت لوط علیہ السلام نے بھی ہجرت فرمائی اور وہ سدوم کے علاقے میں ہدایت کے لئے بھیجے گئے۔ اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کے لئے اُن کی بستیوں کا انتخاب فرماتا تھا، یہاں تک کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ساری دنیا کے لئے مبعوث فرمائے گئے۔

دو رسولوں کو ہجرت کا حکم دیا جا رہا ہے اور اُن کا ردِعمل یہ ہے کہ جو ذات ہمیں اجنبی سرزمینوں میں بھیج رہی ہے وہ صاحبِ حکمت ہے اور اُس کے اس حکم میں جو مصالح اور حکمتیں ہیں وہ اُن سے پوری طرح واقف ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہر غلبہ اُسی کا ہے اور اُسی کا حکم اور امر غالب ہو کر رہے گا۔ ہجرت کے وقت اللہ پر رسولوں کے توکل کا یہ عالم ہوتا ہے کہ کوئی اندیشہ اُن کی جمعیتِ خاطر کو پریشان نہیں کرسکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کے ساتھ اس طرح رہے کہ اُن کی ہدایت کے لئے سرگرداں اور اُن کے کفر سے بے زار تھے۔ جب اُن کی قوم نے اُن سے اپنے قومی تہوار میں چلنے کے لئے کہا تو فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ O (۲) ''میں بیمار ہوں''۔ اس چھوٹے سے کلمے انی

۱۔ العنکبوت: ۲۶

۲۔ الصّٰفّٰت: ۸۹

سقیم میں قوم کے ساتھ رسول کے تعلق کی پوری داستان سمٹ آئی ہے۔ مراد ہے کہ تمہارا طرزِ زندگی میرے لئے سب سے بڑا روگ ہے۔ یہاں سقیم میں بیماری کے ساتھ بیزاری کا مفہوم بھی سمٹ آیا ہے جو خود ایک بیماری یا بیماری کی علامت ہے۔ مختلف زبانوں میں یہ پیرایۂ بیان موجود ہے۔ کسی بات سے انتہائی بے زاری کے لئے انگریزی زبان کا بھی محاورہ ہے:

I am sick of it

جب قوم والے اپنے تہوار میں شرکت کے لئے چلے گئے تو حضرتِ ابراہیمؑ نے اُن کے معبد میں اُن کے بتوں کو توڑ ڈالا تاکہ وہ اپنے معبودوں کی بے بسی اور بے کسی کو دیکھ لیں۔ یہی وہ موقع ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا اور آگ آپ پر گلزار ہوگئی۔ کفار کی اس شکست کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اعلان فرمایا:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ O (۳)

اور (ابراہیمؑ نے) کہا کہ میں تو اپنے ربّ کی طرف جانے والا ہوں (ہجرت کرنے والا ہوں)۔ وہی میری رہنمائی کرے گا۔

ان آیاتِ قرآنی سے ہجرت کا حقیقی مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ انبیائے کرام کو اپنا پیغام اور انسانوں کی ہدایت ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ وطن کی فضاؤں، گھر کے آرام، احباب کی محفلوں، مانوس ماحول اور ہر آرام وعیش کو اشارۂ ربّی پر قربان کرنے کے لئے آمادہ رہتے تھے۔ نبیٔ اکرم ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو صرف ظلم سے بچنے کے لئے ہجرت کا حکم نہیں دیا بلکہ آخری رسول ﷺ نے اقصائے عالم میں اسلام کو پھیلانے کے لئے صحابہؓ کو حبشہ جانے کی اجازت دی۔ ویسے یہ بات اس باب میں یاد رکھنے کی ہے کہ ہجرت، جدوجہد کے ایک نئے مرحلے کا نام ہے۔ کردار میں مسلسل جدوجہد کے جذبے کو زندہ رکھنے کے لئے ہجرت وسیلۂ قوی ہے، اسی لئے ہم نے ہجرت کو اخلاق نبی ﷺ واخلاق صحابہؓ کا عنوانِ جلی قرار دیا ہے۔ ہجرت فی سبیل اللہ، کے بعد بھی جہاد وسعی فی سبیل اللہ، جاری رہتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس ترتیب اور رفاقتِ ہجرت و جہاد کو واضح فرما دیا ہے:

۳۔ الصّٰفّٰت: ۹۹

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (۴)

بے شک جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا (اور مسلسل جدوجہد کی) وہی اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جَاهَدُوا سے جہاد بالسیف کے ساتھ ساتھ مسلسل جدوجہد اور کوشش بھی مراد ہے۔ حبشہ کے مہاجرینِ اوّل نے تبلیغی کاوش کی اور مدینے ہجرت کرنے والوں نے بھی نبیٔ اکرم ﷺ کے ساتھ میدانِ کارزار میں حق کی سربلندی کے لئے جہاد بالسیف کا حق ادا کیا۔

انتہائی نامساعد حالات میں مہاجرینِ حبشہ کی ہجرت نے مہاجرین مدینہ کی ہجرت کی طرح اس حقیقت کو روشن تر کر دیا:

وَمَنْ يُهَاجِرْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً (۵)

اور جو کوئی اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں بہت سی قیام گاہیں (اور ٹھہرنے کے مقام) پائے گا اور کشادگی و وسعت بھی۔

اللہ کا وعدہ ان شاء اللہ تا قیامِ قیامت مہاجروں کے لئے وجۂ تسلی رہے گا اور یوں ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

ہجرت مسلمانوں کی کتنی ہی اخلاقی صفات کے لئے وجۂ محرکہ ہے۔ گزشتہ سطور میں ہم نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ ہجرت نے جغرافیہ کو بھی بدل دیا اور تاریخ کو بھی۔ جغرافیہ اسلامی نظریۂ قومیت کے تحت بدل گیا اور مسلمان قیدِ مکانی سے بلند تر ہو گیا۔ ہجرت نے مسلمان کی قومیت کے عُقدے کو حل کر دیا۔ مسلمان ایک قوم ہے۔ ایسی قوم جو زمین پر ایک وحدت کی حیثیت رکھتی ہے، اور اس قومیت کی اساس کلمۂ طیبہ ہے۔ آج ہمارے دور میں عالم گیریت

۴۔ البقرہ: ۲۱۸

۵۔ النساء: ۱۰۰

(Globalization) کا بڑا چرچا ہے۔ یہ عالم گیریت اور اس کا تصور ہجرت کا ثمرہ ہے۔ اسی نے پوری زمین کو ہمارے لئے مسجد بنا دیا۔ ہجرت محض ایک واقعہ نہیں بلکہ مسلمان کی زندگی کا آئین ہے اور مسلمان کو اسی آئین کی بدولت ثبات حاصل ہے۔ ہجرت نے ہمیں کائنات کے سمندر میں مچھلی کی طرح زندہ رہنا سکھایا ہے اور یوں مسلمان قیدِ مقامی سے بلند تر ہو گیا۔

عُقدۂ قومیتِ مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تاز بخششہائے آں سلطانِ دیں
مسجدِ ما شد ہمہ روئے زمیں
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

نبوت کے چھٹے سال میں مہاجرین کا دوسرا قافلہ حبشہ پہنچا، جس میں ۸۳ مرد اور ۱۸ عورتیں تھیں۔ اِن میں حضرت جعفر بن ابی طالبؓ بھی شامل تھے۔ حضرت جعفرؓ کو نبیٔ اکرم ﷺ نے نجاشی کے نام خط بھی دیا تھا جس میں اُسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ اپنی رسالت پر کامل ترین ایمان اور اللہ تعالیٰ پر حد درجے کا توکل تھا۔ جس حکم راں کی مملکت میں مسلمان امن کی تلاش میں ہجرت کر رہے تھے اُس کی خیر خواہی کا تقاضا تھا کہ اُسے ابدی عافیت اور نجات کی طرف بلایا جائے۔ رسول ﷺ کی دعوت نے نجاشی کے قلب کی دُنیا بدل دی اور اُس نے حضرت جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔ (۶)

اتنی بڑی تعداد میں مکہ معظمہ کے جگر گوشوں کی ہجرتِ حبشہ ایک بڑا واقعہ تھی جس سے قریش کی دُنیا زیر و زبر ہو گئی۔ یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ مسلمانوں کی ہجرت سے قریش کے دل لرز

۶۔ ابن ہشام/ السیرۃ النبویہ۔ بیروت، دار المعارفہ، ۱۹۷۸ء: ج ۲، ص ۸۷

☆ شامی، محمد بن یوسف/ سبل الہدیٰ والرشاد۔ بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۹۹۳ء: ج ۲، ص ۳۸۹

اُٹھے۔ اسلام کا یہ سفر اُنہیں ایک عالمی یلغار محسوس ہونے لگا اور اُنہوں نے حبشہ ایک سفارت بھیجنے کا فیصلہ کیا جس میں عمرو بن العاص اور ابوجہل کا بھائی عبداللہ بن ابی ربیعہ شامل تھے۔ اُن کے ساتھ نجاشی کے لئے بیش قیمت تحائف بھیجے گئے۔

نجاشی نے قریش کے وفد کے ساتھ شریفانہ برتاؤ کیا، لیکن مسلمانوں کو اُن کے حوالے کرنے کے بجائے اس نے اگلے دن مسلمانوں کو بھی اپنا مؤقف پیش کرنے کے لئے اپنے دربار میں بلایا، حالانکہ اُس کے ممتاز مشیروں اور پادریوں نے مکہ کے وفد کی حمایت کرتے ہوئے مسلمانوں کو واپس بھیجنے کا مشورہ دیا تھا۔

مسلمانوں نے نجاشی کے دربار میں حاضری دیتے ہوئے اُس سے اجازت طلب کی ''بادشاہ سلامت! اللہ والے آپ سے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں'' حق پسند اور خدا آشنا نجاشی کو یہ اذن طلبی بے حد پسند آئی اور جب مسلمان دربار میں پہنچے تو اُس نے قریش کے دونوں ایلچیوں سے پوچھا کہ کیا ان مسلمانوں میں سے کوئی غلام ہے جو اپنے مالک سے بھاگ کر یہاں آیا ہو؟ عمرو بن العاص اور عبداللہ ابن ربیعہ کا جواب نفی میں تھا۔ نجاشی نے دریافت کیا کہ ''کیا ان مہاجروں میں سے کسی پر تمہارا قرض ہے، جو اُس نے ادا نہ کیا ہو؟'' جواب پھر نفی میں تھا۔ آخر کہا تو یہ کہا کہ ''یہ لوگ دین آبا سے پھر گئے ہیں اور ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں''۔ نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ توحید، رسالت، یومِ آخرت، عدل اور مساوات کے ذکر کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی۔ جعفرؓ کے لبوں سے آیاتِ الٰہی چشمۂ ہدایت کی طرح جاری ہوگئیں۔ نجاشی، اُس کے درباریوں اور عیسائی پادریوں اور راہبوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضرتِ زکریا، حضرت یحیٰ علیہما السلام کی پیدائش کے بعد حضرت مریمؑ کا قصہ شروع ہوا۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ (۷) کس طرح جبرئیل امینؑ اُن کے پاس آئے اور کس طرح پاک اور کنواری مریمؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ماں بنیں، اور کس طرح اپنی قوم کی طرف لوٹیں:

۷۔ مریم:۱۶

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۚۖ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِى الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا ۙ وَّجَعَلَنِىْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِىْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۙ وَّبَرًّاۢ بِوَالِدَتِىْ وَلَمْ يَجْعَلْنِىْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَىَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝ (۸)

پس مریم اپنے بچے کو لئے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ وہ لوگ کہنے لگے اے مریم! تو نے بری بات کی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں، باغی اور بے راہ تھی۔ مریمؑ نے اپنے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ قوم والے کہنے لگے کہ ہم گہوارے میں لیٹے اس بچے سے کیسے بات کریں۔ اس پر بچے نے کہا کہ میں عبداللہ ہوں اور میرے اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے اپنا نبی بنایا ہے اور مجھے بابرکت بنایا ہے۔ اور میں جہاں بھی رہوں اور جب تک زندہ ہوں اُس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اور اُس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا ہے اور اُس نے مجھے سرکش اور شقی نہیں بنایا ہے اور مجھ پر اُس دن بھی سلام ہے جب میں پیدا ہوا، اور جو میری موت کا دن ہے اُس دن بھی مجھ کو سلام، اور جس دن مجھے دوبارہ زندہ کیا جائے اُس دن بھی مجھ پر سلام۔

مسلمانوں نے اُس دن بھی پامردی، استقلال اور تبلیغ کا حق ادا کیا، جس دن اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہونا تھا۔ حضرت مریم علیہ السلام کی عصمت کی ایسی واضح اور حتمی شہادت تو بائبل کے الفاظ میں بھی نہیں تھی، اور کس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کی جگہ اُن کی

۸۔ مریم: ۲۷ تا ۳۳

زبان سے عبداللہ کہا گیا اور کس طرح اُن کے وجود کی برکات بیان کی گئیں۔ نجاشی کے دربار میں موجود پادریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ''ابن اللہ'' ہونے سے انکار پر غوغا مچادیا، مگر نجاشی نے کہا کہ عیسیٰؑ کے پیدا کرنے والے ربّ کی قسم! عیسیٰؑ نہ اس سے کم تھے اور نہ زیادہ۔ قرآن کی آیات نے ابن مریم کی عظمت و صداقت کو اس طرح پیش کیا تھا کہ صداقت دل میں اُترتی جاتی ہے۔ نجاشی نے قریش کے وفد کے تحائف واپس کردیئے اور وہ نامراد مکۂ معظمہ واپس چلے گئے۔(۹)

صبر اور سچ مومن کے کیسے حربے ہیں جو کفر، شرک اور جھوٹ کی جڑ کاٹ دیتے ہیں۔

یہ صبر ایک مسلسل اور جاری مرحلہ ہے بلکہ یہ مراحل کا ایک سلسلہ ہے۔ یہ وہ جماعت تھی جس نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور اُن میں سے بیشتر اپنے اس قول پر یوں جم گئے کہ باری تعالیٰ کی توحید کی شہادت اُن کی زندگی بن گئی۔ یہ حضور ﷺ کا صبر اور استقامت تھی جو مومنوں کے لئے نمونہ بنی اور وہ قرآنِ عظیم کی اس آیت کی تجسیم بن گئے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ○ (۱۰)

بے شک جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور اس قول (و عقیدہ) پر وہ ڈٹ گئے اور جم گئے، اُن پر فرشتوں کا نزول ہوتا ہے اور اس قول کے ساتھ کہ نہ خوف کرو اور نہ حزن اور تمہیں اُس جنت کی بشارت ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

نازل ہونے والی چیز ہمارے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ اپنا خارجی وجود رکھتی ہے۔ وحی کی طرح فرشتے بھی اپنا وجود رکھتے ہیں اور ہم اُن کے وجود کو اُس کیفیت سے جان

۹۔ ابن ہشام: محولہ بالا۔ سبل الہدیٰ والرشاد: محولہ بالا

۱۰۔ حٰم السجدۃ: ۳۰

سکتے ہیں جو اُن کی موجودگی ہماری ذات میں پیدا کرتی ہے۔ فرشتوں کا نزول انسانوں میں سکینہ پیدا کرتا ہے، جیسے میدانِ بدر میں فرشتے اُس نصرت کے قاصد اور پیغمبر بن کے آئے، جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔ فرشتے طائف کے سفرِ نبوی ﷺ اور اُحد و حنین کے میدانِ کارزار میں نازل ہوئے اور اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی استقامت میں اضافہ کیا، شکست کو میدانِ اُحد میں ایسی فتح میں بدل دیا کہ دشمن اپنی ظاہری فتح کے ثمرات سے محروم رہا اور حنین میں رسول اللہ ﷺ کی آواز پر

اَنَا النَّبِی لا کذب اَنَا اِبن عبدُالمُطلب

مجاہدوں کے اُکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور فتح نے اس استقامت کے قدم چومے۔

یہ سارے واقعات صبر اور استقامت کی دستاویزیں ہیں، ہم نے نبی کریم ﷺ اور سابقین الاولین کے صبر کے چند واقعات آپ کی خدمت میں پیش کئے۔ حرمِ کعبہ میں رسول آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ قریش کے مظالم کو بھی اجمالاً پیش کیا گیا، لیکن جناب ابوطالب پر قریش کے دباؤ اور اُن کی استقامت کا ذکر ابھی باقی ہے۔

قریش کے سردار بنو ہاشم کے سربراہ جناب ابوطالب کی خدمت میں وفود کی شکل میں کئی بار گئے اور اُن سے درخواست کی کہ اپنے بھتیجے کو ''نئے دین'' کے پرچار سے روکیں۔ ابو طالب کمال دانش مندی سے ان وفود کو بغیر کسی یقین دہانی کے واپس بھیج دیتے۔ آغازِ تبلیغ عام میں ایسا ایک وفد آیا اور اپنی بات کہہ سن کے واپس لوٹ گیا۔ دوسرے وفدِ قریش نے سوال جواب کی جگہ اپنے مؤقف کو دوٹوک انداز میں بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم آپ کے پاس آئے اور آپ نے ہمیں اپنے فیصلے سے مطلع نہیں کیا۔ اب معاملہ حد سے گزر چکا ہے۔ آپ یا تو اپنے بھتیجے کو ہمارے معبودوں کی تذلیل سے منع کریں یا اُس کی حمایت سے دست بردار ہوجائیں۔ پھر ہمارے درمیان فیصلہ ہوکر رہے گا۔ ہم میں سے ایک فریق ختم ہوجائے گا۔ اس دھمکی کے بعد سردارانِ قریش واپس لوٹ گئے۔ ابوطالب نے حضور ﷺ کو بلا کر کہا کہ بھتیجے! اب قریش کے سرداروں کا تنِ تنہا مقابلہ میرے بس کی بات نہیں۔ حضور ﷺ اپنے چچا کے

انتہائی شکر گزار تھے، مگر تبلیغ تو حکمِ خداوندی تھی۔ جس طرح دریا اپنی روانی کو روکنے پر قادر نہیں، جس طرح طوفانِ برق و باراں کی رفتار اُس کے قابو میں نہیں ہوتی، اُسی طرح سرورِ کائنات ﷺ اپنی تبلیغی کاوش پر قدغن نہیں لگا سکتے تھے۔ اُن کے ربّ نے اُن کو اسی فریضے کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا اور وہ پہلے وفدِ قریش سے کہہ چکے تھے کہ جس طرح آفتاب اپنی حرارت کو کم اور زیادہ کرنے پر قادر نہیں اُسی طرح مجھے تبلیغ کو روکنے پر قدرت نہیں۔ دوسرے وفد کے جانے کے بعد جناب ابو طالب نے اپنے بھتیجے کو اس سلسلے میں کچھ سمجھانے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے اُس کے جواب میں جو بات کی وہ تاریخِ استقلالِ انسانی کے گلے میں پڑے ہار کی طرح آج بھی جگمگا رہی ہے:

> چچا جان! ربِ محمد کی قسم: اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیں تو بھی میں تبلیغ کے سلسلے کو نہیں روک سکتا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ نازل فرمادے۔ اُس کا دین غالب ہوکر رہے، یا میں دنیا سے گزر جاؤں۔ (۱۱)

۱۱۔ ابن ہشام: ج ۲ ص ۴

☆ عیون الاثر: ج ا ص ۱۸۹

شعب ابی طالب

جناب ابو طالب نے اپنے بھتیجے کو اپنی حمایت کے جاری رکھنے کا یقین دلایا۔ اس کے بعد ابو طالب نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کا اجتماع منعقد کرایا، اور اُس اجتماع میں محمد (ﷺ) پر قریش کے دوسرے قبائل کے ممکنہ حملے اور آپ کے قتل کے اندیشے کے پیشِ نظر بنو ہاشم اور بنو مطلب قبائلی عصبیت کی بنیاد پر متفق ہوگئے، اور آپ کی حفاظت پر آمادہ ہوگئے۔ کفار اپنا مکر کر چکے تھے اور یہ ربِّ محمد کی تدبیر تھی کہ اُس نے قبائلی عصبیت کو ایک نیا رنگ عطا کر دیا۔ اب بنو ہاشم اور بنو مطلب کے مسلم اور غیر مسلم دوسرے قبائل کے مقابل حضور ﷺ کا ساتھ دینے پر متفق ہوگئے۔

حضرت محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے اصحابؓ کی حفاظت کا ربِّ جلیل نے یوں انتظام فرمایا کہ قبائلِ مکہ اور بنی ہاشم اور بنی مطلب کے درمیان قبائلی امتیاز وتفرق کا مسئلہ یوں کھڑا ہوگیا کہ مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کے بغیر بنی ہاشم اور بنی مطلب کے معاشرتی و معاشی انقطاع (بائیکاٹ) کا فیصلہ کیا گیا۔ تمام مسلمانوں کو معاشرے سے الگ کر دینا یوں ممکن نہ تھا کہ دسوں بڑے قبائل میں مسلمان ہو جانے والے قابلِ ذکر تعداد میں موجود تھے اور ان دوسرے قبیلوں کے مسلمانوں کے بائیکاٹ سے خانہ جنگی پیدا ہونے کے امکانات تھے۔ اس پس منظر میں بنی ہاشم، بنی مطلب اور بنی عبد مناف کے مقاطعے پر دوسرے قبیلوں نے ایک عہد نامہ مرتب کیا۔ اس عہد نامے میں کسی مدت کا تعین نہ تھا بلکہ مقاطعہ غیر معین مدت کے لئے تھا جب تک کہ حضور ﷺ کے قبیلے والے آپ کو اُن کے حوالے نہ کر دیں۔ اُس عہد نامے کے

مطابق بنی ہاشم، بنی مطلب اور بنی عبد مناف کے ساتھ لین دین مطلقاً ختم کر دیا گیا، باہمی شادی بیاہ پر پابندی عائد کر دی گئی، اُنہیں آزادانہ بازاروں میں جانے سے منع کر دیا گیا، اُن سے بات چیت اور مجلسوں میں اُن کی شرکت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس مقاطعے کے جواب کے طور پر بنی ہاشم میں طے کیا گیا تھا کہ وہ ایک جگہ رہیں اور اپنی پناہ گاہ کے طور پر شعبِ ابی طالب کا انتخاب کیا۔

اس معاہدے کی تحریر یکم محرم ۷ نبوت کو مرتب کی گئی۔ نئے سال کا آغاز اس طرح کیا گیا کہ حضرت نبی کریم ﷺ اور اُن کے اہلِ قبیلہ شعب ابی طالب میں محصور ہو گئے۔ یہ گھاٹی آج بھی بیت الحرام کے قریب ہی ایک بازار کی صورت میں موجود ہے۔ اسلام دشمنی میں کتنے ہی حقائق قریش والوں کی نظر سے چھپ گئے۔ اب تک تو بنی ہاشم، بنی مطلب اور بنی عبد مناف کے لوگ اسلام کی مخالفت کی وجہ سے نبیٔ اکرم ﷺ کے خلاف تھے اور ان میں سے بعض تو اپنی دشمنی میں دوسروں سے آگے تھے، لیکن جب ''اسیری'' اور ''مقاطعہ'' ان کے درمیان قدرِ مشترک بن گیا تو ان کا ذہنی رد یہ اسلام اور نبیٔ اکرم ﷺ کے بارے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر ہمہ وقتی جبری ساتھ نے اُنہیں اس تبدیلی کے مطالعے کا موقع فراہم کیا جو اسلام نے اُن کے مسلمان ہو جانے والے اہلِ قبیلہ میں پیدا کر دی تھی۔ جب کھانے کو کچھ نہ ملتا اور درختوں کے پتے، چھال اور چمڑے کو اُبال کر نگلنے کا موقع آتا تب بھی ان مسلمانوں کے لبوں پر الحمدللہ کے سوا کوئی اور بات نہ ہوتی۔ فاقے کی صورت میں اگر کوئی ہمدرد کسی مسلمان کو کھانے کی کوئی چیز چھپ چھپا کر دے جاتا تو وہ خود کھانے کی بجائے کسی اور مستحق کو دے دیتا اور اس بات میں مسلم اور غیر مسلم کی بھی تفریق نہیں کرتا۔ حضور نبی کریم ﷺ کے غیر مسلم اہلِ قبیلہ یہ بھی دیکھتے اور حیرت کے ساتھ کہ ان تکالیف میں بھی سرکارِ مدینہ ﷺ اور آپ کے رفقائے کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کس دل جمعی کے ساتھ اپنے ربّ کی عبادت کرتے ہیں اور کس طرح بیمار اور کسی تکلیف میں مبتلا اہلِ قبیلہ کی خدمت کرتے ہیں، مسلم اور غیر مسلم کی تفریق کے بغیر۔ اس طرح دیکھنے والی آنکھوں، تجزیہ کرنے والے ذہنوں اور محسوس کرنے والی روحوں میں اسلام اپنی جگہ بناتا رہا اور محصوری کا یہ دور دلوں میں اسلام کے جاگزیں

ہونے کا دور بن گیا۔ (۱)

اس احصار کا ایک اور اہم اور مثبت نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ قریش کے قبائل کے کتنے ہی دلوں میں اس ظلم کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا۔ یہ اخلاقی داعیہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھا ہے اور یہ گمراہیوں کے عہد میں بھی افراد کے دلوں کو روشن رکھتا ہے۔ اس ظالمانہ عہد نامے کے خلاف کئی قریشی نوجوانوں کے دلوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ لوگ شعب ابی طالب میں چپکے چپکے کھانے پینے اور ضرورت کی دوسری چیزیں پہنچا دیتے۔ ہشام بن عمرو بن حارث، زبیر ابن ابی اُمیہ، ہشام مطعم بن عدی، ابوالبختری اور زمعہ بن اسود ایک دوسرے سے اس عہد نامے کو ختم کرنے کے صلاح مشورے کرتے رہے۔ اُدھر اللہ جل جلالہٗ نے اپنے رسول ﷺ کو اطلاع دی کہ کعبے کی چھت پر رکھے اس عہد نامے کو دیمک نے چاٹ کر بے معنی نقش و نگار میں بدل دیا ہے۔ ایک دن جب یہ نوجوان مسجد الحرام میں عہد نامے کو چاک کرنے کی بات بلند آواز میں کر رہے تھے تو جنابِ ابو طالب حرم میں داخل ہوئے اور اُنہوں نے فرمایا کہ میرے بھتیجے کو اللہ تعالیٰ نے اس عہد نامے کے مٹائے جانے کی اطلاع دی ہے۔ میرے بھتیجے کے منہ سے آج تک کوئی غلط بات نہیں نکلی ہے۔ عہد نامہ منگوا کر دیکھو۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو عہد نامہ منسوخ اور اگر عہد نامہ سلامت ہے تو میں محمد (ﷺ) کو تمہارے حوالے کرنے پر تیار ہوں۔ کفارِ قریش فوراً آمادہ ہو گئے اور جب کعبے کی چھت پر سے عہد نامہ اُتار کر دیکھا گیا تو اُس پر سوائے بِاسمک اللّٰھم کے الفاظ کے کوئی لفظ دیمک کا چارہ بننے سے نہیں بچا تھا۔ یوں یہ عہدِ محصوری ختم ہوا اور بنی ہاشم، بنی مطلب، بنی عبد مناف اپنے گھروں کو لوٹے۔ (۲) ہم نے اس واقعے کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے، اگرچہ ایامِ احصار میں ساتھیوں کی حالت اور پریشانی کے واقعات کو دانستہ چھوڑ دیا ہے۔

اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اہلِ ایمان کے صبر اور استقامت سے

۱۔ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۰۱

۔۔ ابن قیم/ زاد المعاد۔ کویت، مکتبہ المنار الاسلامیہ، ۱۹۸۷ء: ج ۳، ص ۳۰

۲۔ ایضاً

وقت اور تاریخ کے دھارے کس طرح مڑ جاتے ہیں۔ یہ صبر مجبوری کا نام نہیں بلکہ اہلِ ایمان کے اختیار کی داستاں ہے۔

یہ صبر اور استقامت، عزم کا اظہار ہے۔ اور اُولوالعزم رسولوں کا امتیاز ہے اور رسول اللہ ﷺ رسولانِ اُولوالعزم کے سردار تھے۔ اس سلسلۂ رسالت کی طرف قرآنِ حکیم بار بار ہماری توجہ مبذول کراتا ہے:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ ؕ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ (۳)

پس اے رسول (ﷺ)! آپ ایسا صبر کریں، جیسا اُولوالعزم رسولوں نے کیا، اور ان کے لئے عذاب طلب کرنے میں عجلت نہ کریں۔ یہ جس دن وہ عذاب دیکھ لیں گے جس کا اِن سے وعدہ کیا جاتا ہے تو ان کو محسوس ہوگا کہ یہ دن کی صرف ایک گھڑی دنیا میں رہے تھے۔

شعب ابی طالب میں قیام اور اُس کے شدائد کے پس منظر میں اس آیت کے معانی روشن تر ہو جاتے ہیں۔ اس ڈھائی تین سال کی مدت میں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ مکۂ معظمہ میں تو تبلیغ نہیں کر سکے لیکن قرب وجوار کی بستیوں اور قافلوں کی شاہراہوں کا رُخ فرماتے اور اُن تک اسلام کا پیغام پہنچاتے۔ ابولہب ان مواقع پر بھی آپ ﷺ کے تعاقب کا سلسلہ جاری رکھتا اور مختلف قافلے والوں کے سامنے آپ کے بارے میں نازیبا باتیں کرتا۔ لوگ جب آپ ﷺ کے کلماتِ حق اور حکمت سے پُر گفتگو کا اُس کے ہزوات سے مقابلہ کرتے تو آپ کا کارِ تبلیغ آسان تر ہو جاتا۔ اسی زمانے میں بنی سلیم، بنی نصر، بنی حارث، بنی غسان، بنی کعب، بنی خزیمہ اور کئی دوسرے قبیلے والوں سے آپ ﷺ کی ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ کے چہرۂ اقدس پر رسالت کے نور اور آپ کے کلام میں حکمت کے تابندہ گوہر دلوں پر اثر ڈالتے رہے اور ذہنوں کی فضا اسلام کے لئے ہموار ہوتی گئی۔

۳۔ الاحقاف: ۳۵

عام الحزن اور سفرِ طائف

وہ نبوت کا دسواں سال تھا کہ آپ ﷺ کے سر سے شفقت کا وہ سائبان ہٹ گیا جس کا نام ابوطالب تھا۔ جناب ابوطالب کی زندگی حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت اور حفاظت میں کٹی، لیکن آخری وقت میں عمائد قریش کی موجودگی میں آپ ﷺ کی زبان سے کلمۂ طیبہ ادا نہ ہوسکا، کہ کہیں قبیلے والے اسے بزدلی کی علامت نہ سمجھیں۔

جناب ابوطالب کی وفات کے چند دن کے بعد وہ ذات بھی اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئی جس نے سب سے پہلے آپ ﷺ کی تصدیق کی تھی اور آپ پر ایمان لائی تھی، جس کی رفاقت آپ کے لئے سکینت اور باعثِ سکون تھی، جسے جبرائیل کی معرفت ربِ محمد ﷺ نے اپنا سلام بھیجا تھا، جس ذات کے وسیلے سے رب العزت نے آپ کو غنا عطا کیا اور جو ہمیشہ آپ کے خانۂ دل میں ایک زندہ وجود کی طرح مقیم رہی، جس کی روشنی پچیس سال تک کاشانۂ نبوت میں پھیلی رہی اور جس کی سہیلیوں اور اعزہ کے ساتھ حسنِ سلوک معمولِ حضرت خیر البشر ﷺ رہا۔ ان دونوں ہستیوں کے انتقال کی وجہ سے یہ سال عام الحزن کہلایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی وفات کا مہینہ وہی ہے جو ماہِ نزولِ قرآن ہے، یعنی رمضان المبارک ۱۰ ر سالِ نبوی۔ (۱)

ایک طرف تو زندگی میں یہ غم والم، دوسری طرف قریش والوں کے ظلم وستم، مگر اس عالم میں اللہ کا رسول ایک لمحے کے لئے بھی اپنے فریضۂ تبلیغ ورسالت سے غافل نہیں رہا۔

۱۔ بخاری: ج ۲، ص ۲۲۴

☆ شامی: ج ۲، ص ۴۳۴

ابولہب سردارِ بنو ہاشم کی حیثیت سے چند دن تو آپ ﷺ کا حامی رہا، پھر لات کی جھوٹی خدائی سے اُس کی محبت جاگ اُٹھی اور پھر مکۂ معظمہ آپ ﷺ کے لئے ایک اجنبی اور نامہربان شہر بن گیا، جہاں کوئی آپ ﷺ کی بات سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ان حالات میں آپ نے فیصلہ کیا کہ طائف جا کر تبلیغ کریں۔ مکۂ معظمہ اور طائف کو ان دونوں شہروں کے لوگ ''توام شہر'' کہتے اور سمجھتے تھے۔ قریتین۔ نبوت کی ماہیت، وظائف اور عظمت سے بے خبر ان بڑے شہروں کے سردار، اہلِ ثروت اور مترفین نبوت کو بھی اپنا حق جانتے تھے۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے علوئے نسب، ذاتی کردار، امانت، صداقت اور دیانت کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ مال و دولتِ دُنیا کی بنا پر نبوت کو بھی ان دونوں شہروں کے کسی صاحبِ ثروت کا حق سمجھتے تھے۔ جب نبیٔ اکرم ﷺ پر قرآنِ حکیم کا نزول شروع ہوا تو دنیاوی جاہ و حشمت اور مال و متاع کے ان اسیروں نے اُسے جادو قرار دیا اور کہنے لگے:

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ○ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ○ (۲)

اور جب اُن کے پاس حق آیا تو کہنے لگے کہ یہ تو جادو ہے۔ ہم اس (کو ماننے) سے انکار کرتے ہیں اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں ہوا؟ کیا آپ (ﷺ) کے ربّ کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ ہم نے اس دُنیوی زندگی میں ان کے درمیان معیشت (اور متاعِ دُنیا) تقسیم کر دی اور (اسبابِ حیات میں) ایک کو دوسرے سے بلند تر کر دیا ہے تا کہ ایک دوسرے کو (اپنا) ماتحت بنالے۔ اور آپ (ﷺ) کے ربّ کی

۲۔ الزخرف: ۳۰ تا ۳۲

رحمت اُس سے بہتر ہے جسے یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں کفر کے ذہن کی ساخت، اُس کا اندازِ فکر سب کچھ آ گیا ہے اور اُس پر ربانی تبصرہ بھی۔ اس دھیمے لہجے میں ان کے استدلال کی جڑ کٹ گئی کہ کیا آپ کے ربّ کی رحمت کو یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ پھر اللہ جل جلالہٗ کا عدل اور اُس کی ربوبیتِ عامہ کو بھی نظر میں رکھیے کہ اُس نے متاعِ دُنیا اور اسبابِ معیشت اُن بندگانِ دُنیا کو خوب عطا کر دی جو اُسے سب کچھ سمجھتے تھے۔ پھر اللہ کی اُس رحمت میں اُن کا حصہ کیوں جس کا تعلق اس دُنیا کی متاع سے نہیں بلکہ آخرت اور ابدی زندگی سے ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں تمسخر اور ظلم کے سلسلوں سے مسلسل گزر رہے تھے۔ آپ کی قوت آپ کے ربّ کی رفاقت تھی اور اسی رفاقت کے پیشِ نظر آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ ﷺ طائف تشریف لے جائیں اور وہاں کے لوگوں کے سامنے دعوتِ حق اسلام پیش کریں۔ طائف اور اُس کے جوار سے آپ کے بچپن کی یادیں وابستہ تھیں۔ بی بی حلیمہ کا قبیلہ بنی سعد اسی علاقے کے نواح میں رہتا تھا۔

آپ ﷺ شوال ۱۰ نبوت میں حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ طائف کے تاریخی تبلیغی سفر پر روانہ ہوئے اور وہاں تقریباً بیس روز قیام فرمایا۔ یہ سفر فرائضِ نبوت کی ادائیگی کی ایک کڑی تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ کیا تم گواہی دو گے کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا؟ ہر صحابی نے کہا کہ آپ نے نصیحت، گواہی اور تبلیغ کا حق ادا کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کی اس شہادت پر انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کرتے ہوئے تین مرتبہ فرمایا ''اے اللہ! تو گواہ رہنا''۔

اس آنے والی شہادت کا تقاضا تھا کہ آپ طائف تشریف لے جاتے۔ الحمد للہ ہم بعد میں آنے والے مسلمانوں کی سعادت ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں پہلے پیش آنے والے واقعات کو بعد میں پیش آنے والے واقعات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں اور اُن کے ربط کی تفہیم کر سکتے ہیں۔

جب آنحضرت ﷺ طائف پہنچے تو آپ بنی ثقیف کے سرداروں عبد یالیل، مسعود

اور حبیب سے ملے اور اُنہیں اسلام کی دعوت پیش فرمائی۔ یہ تینوں انتہائی گستاخی اور تکبّر کے ساتھ آپ سے پیش آئے۔ ان کے جملے شمشیر سے زیادہ تیز اور تیر سے زیادہ دل میں پیوست ہوجانے والے تھے۔ کون سا حرفِ دشنام تھا جو ان بھائیوں کے منہ سے ادا نہ ہوا، کون سا عرفِ تحقیر تھا جو انہوں نے داعیٔ الی اللہ ﷺ کے لئے استعمال نہیں کیا۔ بات صرف رسول تک محدود نہ رہی بلکہ ان تینوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات، اُس کے انتخاب اور اُس کی دانش کا بھی مذاق اُڑایا۔ اُن کے استہزائی کلمات تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ کردار کی عظمت، بے غرضی، ضبطِ نفس اور اپنے پیغام کو اپنی ذات پر مقدم رکھنے کی مثال سفرِ طائف کا ایک ایک لمحہ ہے۔ افسوس کہ ہم اپنے قلم کو اُن گستاخانہ باتوں کی نقل سے معذور پاتے ہیں جنہیں نبیٔ اکرم ﷺ نے استقلال کے پہاڑ کی طرح برداشت کیا اور ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔

بنی ثقیف کے ان شقی القلب سرداروں نے اوباش اور بدنہاد آوارہ لڑکوں کو آپ ﷺ کے پیچھے لگا دیا کہ وہ آپ کا تعاقب کریں، جہاں آپ ﷺ کسی سے تبلیغ کرنے کی کوشش کریں، آپ کا مذاق اُڑائیں اور آپ ﷺ پر خشت باری کریں۔ ان اوباشوں نے آپ پر پتھر پھینکنے شروع کردیئے۔ ان بدبختوں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ حضور ﷺ جب قدم اُٹھاتے تو ان میں سے کچھ آپ کے ٹخنوں کو نشانہ بناتے اور کچھ آپ کے جسم کے دوسرے حصوں پر ضرب لگاتے۔ آپ ﷺ کا جسم لہولہان ہوگیا اور ٹخنوں سے بہنے والے لہو سے نعلینِ مبارک خون سے چپک گئے۔ حضرت زید بن حارثہؓ نے آپ کی سپر بننے کی کوشش کی اور اُن کا سر پھٹ گیا۔ یہ اُن چند موقعوں میں سے ایک تھا جب رحمتِ دوعالم ﷺ کے لبوں پر شکوے کے الفاظ آئے۔ آپ ﷺ نے اپنے ربّ سے عرض کیا:

> اے الٰہی! میں تجھ سے اپنی ناطاقتی، وسائل کی کمی اور لوگوں کی ناقدری کا شکوہ کرتا ہوں۔ اے ارحم الرحمین! تو بےکسوں اور کمزوروں کا ربّ ہے۔ تو میرا بھی ربّ ہے۔ تو مجھے کس کے حوالے کر رہا ہے، اُن کے حوالے، جو مجھ سے سختی سے پیش آئیں، یا تو کسی دشمن کو مجھ پر اختیار دے رہا ہے؟ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ تیری عافیت میرے لئے وسیع اور کافی ہے۔ میں تیرے چہرۂ کریم کی پناہ چاہتا ہوں جو ظلمات کو نور میں بدل دیتا ہے۔ مجھے صرف تیری رضا مطلوب ہے یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہوجائے اور تیرے سوا نہ کسی میں زور ہے اور نہ طاقت۔

ادھر سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لبوں سے یہ دُعا نکلی اور اُدھر ظلمات کو نور میں بدلنے والے ربّ نے دو تاریک دلوں کو رحم دلی کے نور سے جگمگا دیا۔ حضرت زید بن حارثہؓ آپ ﷺ کو اُٹھا کر شہر سے باہر لے گئے اور ایک باغ میں پناہ لی۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کا تھا جو مکۂ معظمہ کے رئیس زادے تھے۔ ان دونوں نے صادق و امین ﷺ کو اس حال میں دیکھا تو قرابت اور برادری کے سوئے ہوئے جذبے میں تحریک پیدا ہوئی۔ انہوں نے اپنے عیسائی غلام عداس کو انگور کا ایک خوشہ دے کر کہا کہ اُس زخمی کو دے آؤ۔ غلام نے خوشۂ انگور حضرت ختم المرسلین ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر تناول فرمانا شروع کیا۔ غلام نے حیرت سے کہا کہ ”یہ کلمات یہاں کے لوگ تو نہیں کہتے“۔ رسول اللہ ﷺ نے اُس سے دریافت کیا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ ”میں عیسائی ہوں اور نینوا کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام عداس ہے“۔ ”تو تم یونس بن متی کے علاقے کے باشندے ہو؟“۔ غلام نے حیرت سے پوچھا: ”آپ یونس بن متی کو کیسے جانتے ہیں؟“۔ ”یونس بن متی اللہ کے نبی تھے اور میں بھی اللہ کا نبی ہوں۔ یونس بن متی میرے بھائی تھے“۔ یہ سن کر عداس جھکا اور اُس نے رسول اللہ ﷺ کے سر پر بوسہ دیا، اور پھر آپ کے ہاتھ پاؤں عقیدت سے چومے۔ ربیعہ کے بیٹے دور سے دیکھ رہے تھے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے سے کہا ”لو، یہ غلام تو ہمارے ہاتھ سے گیا“۔ جب غلام لوٹ کر اپنے مالکوں کے پاس پہنچا تو اُنہوں نے ماجرا دریافت کیا۔ غلام نے کہا ”آقا! آج پوری دنیا میں اس سے بہتر کوئی آدمی نہیں۔ اس نے مجھے ایسی بات بتائی ہے جو ایک نبی کے سوا کوئی اور نہیں بتا سکتا“۔

قدرے باغِ ربیعہ میں آرام کر کے رسول اللہ ﷺ نے مکے کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ راستے میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ملے۔ روح الامین تنہا نہیں تھے بلکہ اُن کے ساتھ پہاڑوں کا فرشتہ بھی تھا۔ اُس نے خدمت حضرت رسالت مآب ﷺ میں یہ گزارش پیش

کی کہ آپ حکم عطا فرمائیں تو میں اہلِ طائف اور اہل مکہ کو پہاڑوں کے درمیان پیس کر ہلاک کردوں۔ (۳) رحمۃ للعالمین ﷺ کی نظروں کے سامنے وہ مشرک بھی تھے جنہیں ایمان لانا تھا اور مشرکوں کی وہ اگلی نسلیں بھی، جنہوں نے اسلام کی روشنی سے مشرق و مغرب کو روشن کرنا تھا۔

یقیناً اللہ تعالیٰ نے نافرمانی کے سبب پچھلی قوموں پر عذابِ عام نازل فرمایا اور اُس وقت جب اُن لوگوں میں کوئی رجل رشید (بھلا آدمی) نہیں تھا اور اُن کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ حضرت محمد ﷺ تو مرسلِ آخر تھے اور مکے میں اُن کی دس سال کی تبلیغ اور جدوجہد کے نتیجے میں ایسے لوگ بڑی تعداد میں مسلمان ہوگئے تھے جو اپنی اپنی جگہ ایک اُمت تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کہیں یہ بات تحریر فرمائی ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت محض ایک رسول کی بعثت نہیں تھی بلکہ رسول کے ساتھ ایک اُمت بھی مبعوث فرمائی گئی تھی:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ (۴)

تم بہترین اُمت ہو، جو انسانوں کے لئے نکالی گئی (پیدا کی گئی)۔ تم معروف (بھلائی) کا حکم دیتے ہو اور برائی (منکر) سے روکتے (اور منع) کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو۔

آلِ عمران مدنی سورت ہے، لیکن خیرِ اُمت کا وجود اور قیام تو مکۂ معظمہ میں ہو چکا تھا اور آلِ عمران کی اگلی ہی آیت میں فرمایا گیا ہے:

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ○ (۵)

یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، سوائے ستانے کے، اور اگر انہیں تم

۳۔ بخاری: ج ۲، ص ۱۴۶

☆ ابن ہشام: ج ۲، ص ۱۷۳

۴۔ آلِ عمران: ۱۱۰

۵۔ آلِ عمران: ۱۱۱

سے قتال کرنا پڑے تو یہ پیٹھ دکھا دیں گے اور ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

سورۂ آلِ عمران کی آیات نمبر ۱۱۰ اور ۱۱۱ میں اگرچہ تخاطب اہلِ کتاب سے ہے، لیکن عملاً اور تاریخی طور پر کفار بھی اس وعید اور پیش گوئی کے مخاطب ہیں۔

جیسا کہ ہم عرض کر رہے تھے کہ مکۂ معظمہ کے اس ابتدائی دور میں ہر ایمان لانے والا ایک اُمت کی طرح تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق، حضرت علی، حضرت عثمان بن عفان، حضرت حمزہ، حضرت عمر، حضرت زید بن حارثہ، حضرت مصعب، حضرت بلال، حضرت عمار بن یاسر، حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت خباب بن ارت، حضرت اُمِ عمیس، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ارقم، حضرت طلحہ بن عبیداللہ، حضرت زبیر بن عوام، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبیداللہ بن جراح، حضرت سعید بن زید، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ اجمعین، غرض کہ ناموں کی کہکشائیں ہیں جو ہمیشہ آسمانِ صبر و استقلال و جاں نثاری پر روشن رہیں گی اور ہر دورِ جبر میں انسانوں کو حوصلہ دیتی رہیں گی۔

ہم یہ بات پہلے عرض کر چکے ہیں کہ حضور ﷺ کے اخلاقی اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر ایک کُل اور ایک جہانِ اخلاق کی تعمیر کرتے ہیں۔ حضور ﷺ کا ایک رفیق کے ساتھ سفرِ طائف اللہ تعالیٰ پر توکل اور اعتماد کی بے مثال، مثال ہے۔ پھر طائف میں آپ پر ظلم اور خشت باری بھی سلسلۂ تبلیغ کو نہ روک سکی۔ اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ربیعہ برادران کے قلب کی تبدیلی ایک معجزہ تھی اور اُس گوشۂ عافیت میں عداس کی آمد آپ ﷺ کے سلسلۂ تبلیغ کے تسلسل کا سبب بنی۔ حضور نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صبر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ آپ کا شکوہ بھی حمد بن گیا۔ زبان پر قابو اور مصائب کے درمیان اللہ کا شکر بہترین اخلاقی وظائف ہیں اور آپ کا پہاڑوں کے فرشتے کی پیش کش کو قبول نہ فرمانا اولوالعزمی کی انتہائی بلندی ہے۔ ویسے بھی یہ سنتِ الٰہی ہے کہ جس بستی میں رسول موجود ہو اُس پر عذاب نازل نہیں کیا جاتا اور اہل حق کے لئے سفرِ طائف کا ابدی پیغام یہ ہے کہ نصرتِ الٰہی بے شک مومنوں کے لئے آتی ہے لیکن اس عالمِ اسباب میں حق و باطل کی جنگ اہلِ حق کو خود لڑنا پڑتی ہے۔

میدانِ بدر میں سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ کی دُعائے نصرت کے جواب میں آسمان سے فرشتے

نازل ہوئے۔ مگر مولانا ماہر القادری کے الفاظ میں رسول اللہ ﷺ کی دعا پر صحابہ کرامؓ کی تلواریں آمین کہہ رہی تھیں اور پھر جنگِ بدر اس حقیقت کی شہادت ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا و کار ساز

بدر میں رسول اللہ ﷺ نے جو مٹھی بھر خاک فوجِ کفار کی طرف پھینکی اور جس کا اثر ہر آنکھ پر ہوا، اُسے اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل قرار دیا ہے:

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ O (۷)

اور خاک کی مٹھی آپ نے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی اور (یہ اس لئے) مسلمانوں کو اپنی طرف سے اُن کی محنت کا خوب معاوضہ عطا کرے۔ بے شک اللہ سمیع وعلیم ہے۔

قرآنِ حکیم نے یہ بات واضح کردی کہ نصرتِ الٰہی مومنوں کی کوشش اور جدوجہد کا معاوضہ اور انعام ہے۔ سورۂ انفال کی محولۂ بالا آیت میں اسی اجرِ الٰہی کا ذکر ہے۔ اس انعام کی صورتیں اور نوعیتیں اتنی متنوع اور اتنی تسکین آور اور روح پرور ہیں کہ ان اجور وانعامات کے ملنے سے پہلے آدمی اُن کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ واقعۂ طائف کتنا شدید اور گراں بار تھا، اس کا اندازہ بخاری شریف کی ایک روایت سے ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک دن ہادیٔ اعظم اور صابرِ اعظم ﷺ سے دریافت فرمایا کہ آپ کی زندگی میں اُحُد کے دن سے زیادہ سخت کوئی دن گزرا ہے، تو زوجِ عائشہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کو سب سے سنگین مصیبت کا دن بتایا۔ (۸) ان سنگین حالات میں حضرت روح الامینؑ کی آمد آپ ﷺ کے لئے ایک بڑا اجر تھی۔

سفرِ طائف کی مدت کے تعین میں اختلاف ہے۔ اربابِ سیر نے یہ مدت دس دن اور بعض نے بیس دن بتائی ہے۔ جب نبی اکرم ﷺ واپسی کے سفر میں وادیٔ نخلہ پہنچے تو وہاں

۷۔ انفال: ۱۷

۸۔ بخاری: ج ۲، ص ۱۴۶

کئی دن قیام فرمایا۔ اللہ غنی۔ شب و روز کا خالق اس طرح اپنے حبیب کی ذہنی کیفیت اور آپ ﷺ کے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔ یہیں جنات کی ایک جماعت کو خالقِ انس وجن نے اپنے رسول کی خدمت میں بھیج کر آپ ﷺ کو رسولِ جن و بشر کے مرتبۂ عالیہ پر فائز فرمادیا۔ جنوں کے اس وفد کی آمد کا سورۂ احقاف اور سورۂ جن میں ذکر کیا گیا ہے۔ سورۂ جن کی ابتدائی دو آیات ہی سے اس جماعتِ اجنہ کے مسلمان ہوجانے کی تصدیق ہوتی ہے:

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ أَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوا إِنَّا سَمِعْنَا قُرْآنًا عَجَبًا O يَهْدِي إِلَى الرُّشْدِ فَآمَنَّا بِهِ ۖ وَلَن نُّشْرِكَ بِرَبِّنَا أَحَدًا O (۹)

اے نبی! آپ (ﷺ) کہہ دیں کہ مجھے وحی کے ذریعے اطلاع دی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن سنا اور اُنہوں نے کہا کہ ہم نے عجیب (قدرت اور حکمت والا) قرآن سنا ہے جو رشد و ہدایت کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس کتاب پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ شرک نہیں کریں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اجنہ کی آمد کا احساس اور علم آپ ﷺ کو نہیں ہوسکا اور اللہ تعالیٰ عزوجل نے وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو اس کی اطلاع دی، اور یہ کہ یہ جماعتِ جنات ایمان لے آئی۔ یہ طائف کے شدائد کے بعد آپ کے عزمِ تبلیغ پر انعامِ الٰہی تھا۔ قولِ اجنہ قرانا عجبا میں قرآنِ حکیم کی عظمت، ہمہ گیری، وسعت، حقائق اور تاثیر یہ سب باتیں کس طرح سمٹ آئی ہیں۔ سفرِ طائف میں آپ کے استقلال اور صبر کا یہ انعام تھا کہ عالمِ بشریت کے ساتھ ساتھ عالمِ جنات بھی آپ کے زیرِ نگیں آگیا۔ نبوتِ محمدی علیٰ صاحبہا الف الف سلاما کا یہ عجب پہلو ہے کہ آپ ﷺ کی نبوت سے قبل اجنہ اکثر انسانی معاملات میں مداخلت کرتے تھے اور اثر انداز ہوتے تھے۔ آپ کی نبوت کے بعد یہ سلسلۂ دخل اندازی کم و بیش ختم ہوگیا، اور اجنہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ (۱۰)

۹۔ جن: ۱-۲

۱۰۔ ابن حجر العسقلانی / فتح الباری۔ کراچی، قدیمی کتب خانہ: ج ۸، ص ۸۶۸

اہلِ یثرب سے رابطہ

سفرِ طائف کے بعد تبلیغ کی راہیں آسان ہوئیں۔ یثرب محض ایک شہر نہ تھا بلکہ ایک الگ دُنیا تھا، جہاں اہلِ کتاب اور بالخصوص یہود آباد تھے۔ اہلِ یثرب کے کان ایک آنے والے نبی کا مژدہ سن چکے تھے اور یہود اپنی ''بالادستی'' کے لئے اُس نبی کے انتظار میں تھے۔

حج کے ایام میں نبیِ اکرم ﷺ اطراف و جوانب سے آئے ہوئے قبیلوں کی قیام گاہوں پر جا کر توحید اور آخرت واعمالِ صالحہ کا پیغام پیش کرتے۔ کوئی قابلِ ذکر قبیلہ ایسا نہیں تھا جس تک رسول اللہ نے اپنے ربّ کے دین کی دعوت نہیں پہنچائی ہو، مگر ان لوگوں کے دل تو پتھر سے زیادہ سخت تھے۔

ایک دن سرورِ کائنات ﷺ نے چھ آدمیوں کو دیکھا جو اُس وقت کے مروّجہ مناسکِ حج کے بارے میں سنجیدہ تھے۔ آپ کے دریافت کرنے پر اُنہوں نے بتایا کہ وہ یثرب سے آئے ہیں اور بنی خزرج سے تعلق رکھتے ہیں۔ سرکارِ عالی مقام ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے پاس میری کچھ باتیں سننے کا وقت ہے، اُنہوں نے کہا کہ ضرور ضرور آپ فرمائیں، ہم سنیں گے۔ یہ یثربی دوسرے قبیلے والوں سے مختلف تھے۔ حضور ﷺ نے قرآنِ حکیم کی چند آیات کی تلاوت فرمائی۔ یثربی کلماتِ ربانی بھی سن رہے تھے اور چہرۂ مبارک پر ان آیتوں کے نور کا پرتو بھی دیکھ رہے تھے۔ ربیوں نے ایک دوسرے سے بات کی اور کہا کہ یقیناً یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد سے یہود ہمیں ڈراتے رہتے ہیں۔ آؤ ہم یہود سے پہلے ان کا دامن تھام لیں۔ ہم بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی عداوت ہمارا شعار ہے۔ شاید اللہ ان کے ذریعے ہمیں متحد کردے۔ ان یثربیوں نے

کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم آپ پر ایمان لاتے ہیں۔ واپس جا کر آپ کی دعوت اپنے قبیلے والوں کو پہنچائیں گے۔ ہم اگلے سال پھر آئیں گے اور اگر حالات ہمارے موافق ہوئے تو ہم آپ ﷺ کو یثرب لے جائیں گے۔ آپ اپنے اللہ سے دُعا فرمائیں۔ یثرب کے یہ ''سابقین الاوّلین'' حضرت عوف بن حارث، حضرت رافع بن مالک، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابو امامہ اسعد، حضرت قطبہ بن عامر اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم تھے۔ ان ناموں میں کچھ اختلاف بھی ملتے ہیں، اور بعضوں نے چھ کی جگہ آٹھ کی تعداد لکھی ہے۔

ان چھ آدمیوں نے توحید، آخرت، اعمالِ صالحہ اور حضرت محمد مجتبیٰ ﷺ کی رسالت کا اپنے قبیلے میں خوب چرچا کیا۔ اور نتیجتاً اگلے موسمِ حج میں بارہ یثربی آلِ اسماعیل کے نبی کی زیارت کے لئے مکۂ معظمہ آئے۔ اُن میں پانچ افراد وہی تھے جن سے سالِ گزشتہ آپ ﷺ کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ازلی سعادت نصیب ایمان لائے او۔ اُنہوں نے آپ ﷺ کے دستِ حق نما پر بیعت کی۔ یہ بیعتِ عقبۂ اولیٰ ہے۔ ان حق پرستوں نے عہد کیا کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے، زنا کے قریب بھی نہیں پھٹکیں گے، کسی پر بہتان نہیں باندھیں گے اور امر بالمعروف میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں گے اور فراغت ہو یا تنگی اپنے عہد و پیمان کو پورا کریں گے۔

بیعت کی ان دفعات سے اسلام کے اطراف و جوانب اور حدود و وسعت اور انسان سازی کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان چند باتوں میں اسلام کی روح سمٹ آئی ہے اور ہر دور کے لئے اُسوۂ حسنہ اور اسلام کی نوعیت واضح ہوجاتی ہے۔ اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے۔ مسلمان سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدت کا اقرار کرتا ہے، اور اس حقیقت پر ایمان لاتا ہے، اسی کے ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لاتا ہے۔ اس بیعت میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔ اس کے بعد اس بیعت میں قتلِ اولاد سے باز رہنے کا عہد ہے۔ یہ عہد معاشرے کی تعمیر اور اُس کی ترتیب کا عہد ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر ایمان کا اعلان ہے۔ زنا نہ کرنے کا عہد معاشرے میں ہمواری اور اعتماد علی النسب کی دفعہ ہے۔ یہ حقوق العباد اور معاشرے میں اعتماد کی فضا قائم رکھنے کا پیمان ہے۔ نبی کریم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ

فرد اور معاشرے کے ہر پہلو کا احاطہ کر لیتا ہے اور انسانی زندگی اور معاشرے میں فساد کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ بہتان باندھنے سے دور رہنے کا عہد ایک اہم حق العباد کی بجا آوری کی طرف قدم ہے۔ معاشرے میں ہر آدمی تہمت، الزام اور ہتکِ عزت سے محفوظ رہے۔ یہ بنیادی انسانی حق ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے مسلمان کی شخصیت، ذات اور کردار کی تعمیر اس طرح کی کہ انسانی ذات بھی نشوونما پائے اور معاشرے میں بھی کردار کا بحران پیدا نہ ہو۔ آج ہمارے معاشرے کو جتنے مسائل کا سامنا ہے معاشی ناہمواری، ظلم، دوسروں کی حق تلفی، لوگوں کا اپنے فرائض منصبی کو انجام نہ دینا، رشوت، بلند و بالا عمارتوں کی ایسی ناقص تعمیر کہ زلزلے کا ایک جھٹکا اُنہیں زمیں بوس کر دے، پلوں اور فلائی اوورز میں ناقص سامانِ تعمیر اور لاپروائی سے انسانی زندگیوں کو خطرہ، سیاست دانوں کے جھوٹ اور فریب کا سلسلہ، باہمی عدم اعتماد، معاشرے میں جرائم کی کثرت، خواتین پر زیادتی۔ ان میں سے ہر جرم کا رشتہ کردار کے بحران سے ہے۔

بیعتِ عقبہ اولیٰ کے بعد ان یثربی مسلمانوں کی درخواست پر حضرت مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یثرب بھیجے گئے۔ (۱) اُن کی ذات، اندازِ کلام، آیاتِ ربانی کے اثر اور اسلام قبول کرنے والے ساتھیوں کے اندازِ زیست میں تبدیلی۔ یہ سب باتیں تبلیغ بن گئیں۔ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ اگلے سال بیعتِ عقبہ کبیرہ منعقد ہوئی اور یثرب کے مسلمانوں کی تعداد ستر سے تجاوز کر گئی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عرب و عجم کی مخالفت کی ''قیمت'' پر رسول اللہ ﷺ کی ''رفاقت'' کا انتخاب کیا۔

یثرب کے مسلمانوں سے دونوں بیعتوں کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا ساتھ مختصر وقت کے لئے ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ''آیتِ الٰہی'' تھی جو دلوں کی دنیا کو یکسر منقلب کر دیتی تھی اور آپ ﷺ ایک ایسا آئینہ تھے جس میں سعید روحوں کی سعادت چمک کر سامنے آ جاتی تھی اور شقی و فاسد ارواح کی شقاوت اور خسران دوچند ہو جاتا۔ اصغر گونڈوی نے اس بڑی صداقت کو کس طرح دو مصرعوں میں سمیٹ لیا ہے:

۱۔ بخاری: ج ۲، ص ۲۳۱

فروغ حسن سے تیرے چمک اُٹھی ہر شے
ادا و رسمِ بلالی و رسمِ بولہبی

حضور ﷺ کا دیدار، آپ کی صحبت، آپ کی رفاقت کا کوئی بدل نہیں ہے اسی لئے ''صحابیت'' کا درجہ اہلِ ایمان میں سب سے افضل ہے۔ اُس جیسی جماعت پر اُس سے پہلے سورج نہیں چمکا، اور یہ شرف و کرامت قیامت تک کسی اور فرد یا جماعت کو نصیب نہیں ہوگی۔ اس نکتے سے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کا یہ پہلو ہمارے سامنے آتا ہے کہ آپ کے اخلاق کے مشاہدے سے صحابہؓ اخلاقی درجاتِ عالیہ پر فائز ہو جاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ معلمِ اعظم بھی تھے اور آپ معلم بنا کر مبعوث فرمائے گئے: ''انما بعثت معلماً'' اور یہ ایسا معلم تھا جو تلامذہ کا ساتھی بھی تھا۔ اسلام کے دورِ اوّل میں صبر و ایثار، پامردی کے علاوہ آپ کے اخلاق کے یہ دونوں پہلو بھی مجسم ہو کر سامنے آئے۔ آپ کا تعلیم دینا آپ کے اخلاقِ عالیہ سے جڑا ہوا تھا اور معلم و متعلم میں رفاقت اتنی مضبوط تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رفقا کے ''صاحب'' اور رفیق تھے۔ قرآنِ حکیم نے آپ کی ذات اور اخلاق کے اس پہلو کا ذکر فرمایا ہے:

مَابِصَاحِبِکُمْ مِّنْ جِنَّۃٍ ط اِنْ ھُوَ اِلَّا نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍO (۲)

تمہارے اس رفیق (محمد ﷺ) کو کوئی جنون نہیں ہے، بلکہ وہ تو نذیر ہیں جو تمہیں ایک شدید عذاب سے ڈراتے ہیں۔

داعی اور جماعت، نبی اور اُمت، معلم اور متعلم کا ایسا تعلق اور قربت، دعوت اور اخلاق کی دُنیا میں نہ تو اس سے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد۔ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی رفاقت ہر مرحلے میں آپ کے اخلاق میں شامل رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ہمیشہ رفیق اور صاحب رہے۔ بیتِ ارقم میں سرکارِ دو عالم ﷺ اُنہیں تعلیم دیتے ہوئے، صبر کی تلقین کرتے ہوئے، اُن کے زخموں کو اپنے دستِ مبارک کی شفا بخشی سے مندمل کرتے ہوئے اور اپنی دُعاؤں سے اُن کے دکھ کا مداوا کرتے ہوئے نظر

۲۔ سبا: ۴۶

آتے ہیں۔ مدینۂ منورہ میں آپ ﷺ اُن کے ساتھ مسجدِ قبا اور مسجدِ نبوی کی تعمیر میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے پتھر اُٹھاتے ہیں، صحابۂ کرامؓ آپ ﷺ کو روکتے اور کہتے اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان، آپ آرام فرمائیں۔ مگر آپ مسکرا کر اپنے کام میں مصروف رہتے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر اپنے پیٹ پر پتھر باندھ کر آپ خندق کھودنے میں لگے رہتے اور جو چٹان کسی کی کدال سے نہ ٹوٹتی وہ ضربِ محمد ﷺ سے پاش پاش ہو جاتی۔ عام دنوں میں آپ اپنے صحابہؓ کے ساتھ مسجدِ نبوی میں گفتگو کرنے اور اُنہیں تعلیم دینے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ زندگی کی تلخیاں آپ ﷺ کی شیریں محفل میں آسان ہو جاتیں۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوتا تو آپ اپنے صحابہؓ کو ادبی تنقید کے نکات سے آگاہ فرماتے، کبھی صحابہؓ کے مسائل کو حل فرماتے اور اگر کسی محفل میں صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی آپ ﷺ سے آپ کی کوئی پسندیدہ چیز طلب کرتا تو آپ بلا تامل اُس کے حوالے کر دیتے، بالخصوص رمضان المبارک میں آپ ﷺ کی فیاضی نسیمِ بہار کی طرح نظر آتی۔ یہ باتیں اور ان سے متعلق تفاصیل اپنے اپنے مقام پر بیان کی جائیں گی، ان شاء اللہ۔

معراج

طائف کے سفر کے بعد حالات جس طرح بدلنے لگے اُن کا بیان اختصار کے ساتھ کیا جا چکا ہے۔ عام الحزن (غم کا سال)، شعب ابی طالب میں محصوری، تمسخر اور مظالم کے طغیان اور سفرِ طائف کے شدائد کے بعد رحمتِ الٰہی نے ہوا کا رخ بدل دیا، اجنہ کا مسلمان ہونا، اہلِ یثرب میں اسلام کی اشاعت۔ یہ تو زمین کی باتیں ہیں، لیکن ربّ العالمین کے پاس رحمۃ للعالمین کے لئے ورائے زمین بھی ایک بڑا انعام تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے کردار، اپنے عمل، اپنے صبر، اپنی بے غرضی سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ انسانوں کے لئے بہترین نمونہ ہیں اور اس کا اجر معراجِ انسانیت ﷺ کو معراج کی صورت میں عطا ہوا۔ خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ ساتھ یہ اُن کی اُمت کی بھی معراج تھی۔ صوفیائے کرام کے تجربات تو شخصی ہو سکتے ہیں لیکن انبیائے عظام کے تجربات اور علوئے مرتبہ کا تعلق اُن کی اُمت سے بھی ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ تو ختم الرسل تھے اس لئے اُن کے ہر روحانی تجربے اور خاص طور پر معراج کا تعلق اُن کی اُمت اور آنے والے زمانوں کے سارے انسانوں سے تھا۔ نمازِ پنج وقتہ اسی سفرِ معراج میں اللہ ربّ العزت کی طرف سے حضور ﷺ کی اُمت کو تحفہ اور عطا کے طور پر ملی۔ نماز زمین والوں کے لئے وہ عطائے ربّ تھی جو اُنہیں اپنے خالق سے ملاتی ہے۔ نماز اللہ تعالیٰ کے ساتھ مومن کی سرگوشی ہے اور نماز کی ماہیت اور اہمیت حضور ﷺ کے اس ارشاد میں سمٹ آئی ہے:

الصلوٰۃ عماد الدین (۱)

۱۔ علی متقی الہندی / کنز العمال: رقم ۱۳۷۲

نماز مسلمان کی معراج ہے۔

یہ واقعہ نبوت کے بارہویں سال میں پیش آیا۔ عام روایات کے مطابق وہ رجب المرجب کی ۲۷ ویں شب تھی۔ (۲) توقیتِ نبوی ہمارا شعبہ نہیں اور ہمارے اس مطالعے میں توقیت کو بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے، اہمیت تو اس حقیقت کو حاصل ہے:

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ﷺ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

معراج، اسلام کے پھیلاؤ اور زمیں گیری کا دیباچہ تھی، اور کئی اعتبار سے یہ ہجرت کا اشارہ نما اور پیش خیمہ تھی۔ حضور ﷺ نے تو آسمانوں اور کئی زمانوں کی سیر کی اور انفس و آفاق میں اللہ تعالیٰ کی آیات کا مشاہدہ کیا۔ یہ اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اُن کے دین کی زمیں گیری اور آفاق نوردی کا دور شروع ہونے جا رہا ہے۔

۲۔ فتح الباری: ج ۷، ص ۲۵۷

معراج، ہجرت اور عالم گیریت

سورۂ بنی اسرائیل میں واقعۂ معراج اور دعائے ہجرت دونوں یکجا ہوگئی ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ بھی جو فتحِ مکہ کے موقع پر اس وقت نبی کریم ﷺ کے لبوں پر تھے جب آپ اپنی چھڑی سے اُن بتوں کو ضرب لگا رہے تھے جو کعبے میں براجمان تھے اور چھڑی کی یہ ضرب ان کی معزولی کا اعلان تھی۔

سورۂ بنی اسرائیل کو سورۃ الاسراء بھی کہتے ہیں کہ اس کا آغاز نبی اکرم ﷺ کے اس سفر سے ہوتا ہے جس کے پہلے مرحلے میں آپ مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تشریف لے گئے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا ط اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ O (۱)

پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی، جس کے ماحول اور آس پاس کو ہم نے برکت عطا کی ہے تاکہ ہم اُسے (اپنی قدرت کی) آیات دکھائیں، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

واقعۂ معراج سرورِ کائنات ﷺ کے مرتبہ عالی کا اعلان ہی نہیں بلکہ اسلام کی عالمگیریت کا اظہار بھی ہے، شبِ معراج اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے وقت اور فاصلوں کو اپنے

۱۔ الاسراء: ۱

رسول ﷺ کے لئے مُسخر فرما دیا، آج ہم عالمگیریت (Globalization) کے عہد میں قدم رکھ رہے ہیں، جس کا نقطۂ آغاز معراج مصطفیٰ ﷺ تھی۔ اس لئے عالمگیریت اور دنیا کا ایک عالمی بستی میں بدل جانا ہمارے لئے تردد کی بات نہیں بلکہ وہ بشارت ہے جو معراج کے واقعے سے پیدا ہوئی جو ہم سے کہہ رہی ہے کہ مومن ایام کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔ وقت کی یہ تیز رفتاری اور یہ تیز تر ذرائع ابلاغ واقعۂ معراج کے منطقی نتائج ہیں۔

واقعۂ معراج کے تقریباً ایک سال کے بعد ہی رسولِ پاک ﷺ کی ہجرت پیش آئی۔ معراج اگر رسول اللہ ﷺ کی تکریم کی تحریر جلی تھی تو ہجرت اسلام کی زمیں گیری کا آغاز تھی کیونکہ محمد ﷺ کو خاتم الانبیاء، مرسلین بنا کر بھیجنے والے نے یہ اعلان بھی تو فرما دیا تھا کہ محمد عالمِ انسانیت کے لئے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں اور اعلان کو مستحکم تر بنانے کے لئے رب العزت جل جلالہ نے یہ اعلان سرکارِ ختمی مرتبت کی زبان سے کرایا۔

قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا ۨالَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ كَلِمٰتِهٖ وَ اتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (۲)

آپ کہہ دیجئے کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں جس کی سلطنت تمام آسمانوں اور زمین پر (قائم) ہے۔ اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے، وہی حیات عطا کرتا ہے اور وہ ہی (تمہیں) موت دیتا ہے، پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی اُمی پر (ایمان لاؤ) جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اُس کے احکام پر، اور ان کا اتباع کرو تا کہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔

اس سے پہلے کی آیت میں بھی رسول اللہ ﷺ کے اتباع کے ثمرات کی بات ہو رہی تھی اور واضح ترین الفاظ میں یہ حقیقت بیان کی گئی تھی:

۲۔ الاعراف: ۱۵۸

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ ۙ اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۳)

اور جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور (قرآن) کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ نازل کیا گیا، وہ ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

معراج کے سفر کی تفاصیل ہمیں سیرتِ مبارکہ کی بیشتر کتابوں میں ملتی ہیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انبیائے کرام کی جماعتِ نماز کی امامت فرمائی اور نماز کے بعد کس کس آسمان پر کس کس نبی سے آپ کی ملاقات ہوئی اور سدرۃ المنتہیٰ کی داستان بہت سی باتوں کے بیان کے باوجود اسرار و رموز کے پردوں میں نہاں ہے۔ آپ کے علوئے مرتبہ کی اس روئداد میں ان آیات کا ذکر بھی ملتا ہے جو آپ کے سامنے پیش کی گئیں، اس میں برزخ کے وہ احوال بھی ہیں جن کا حضور ختمی مرتبت ﷺ نے مشاہدہ فرمایا، صاحب مقام محمود اخلاق حمیدہ کے مالک تھے، اور آپ کے فضائل اخلاق سے انسانیت کے شرف کا اندازہ ہوتا ہے۔ برزخ کے احوال سے آپ کو تاریخ کے مختلف ادوار میں رذائل اخلاق سے روشناس کرایا۔ وہ قومیں جنہوں نے ربانی تعلیمات کو قبول نہ کیا، اپنی سرکشی کے سبب حدود کو توڑا اور معصیتوں کو اختیار کیا ان کے تذکروں میں ہماری اخلاقی اصلاح کے کتنے ہی باب موجود ہیں۔ ہادئ اعظم حصہ اول میں سید فضل الرحمٰن نے احوالِ برزخ کے عنوان کے تحت فتح الباری، شامی، تفسیر ابن کثیر، زرقانی، ابن ہشام، عیون الاثر، حلبی، مسند احمد وغیرہ کے حوالوں سے یہ احوال پیش کئے ہیں۔ (۴) آپ ﷺ نے دیکھا کہ "کچھ لوگوں کی زبانوں اور ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے کاٹا جا رہا تھا۔ جبریل نے بتایا کہ یہ آپ کی امت کے خطیب و واعظ ہیں جو لوگوں کو گمراہی میں ڈالتے ہیں"۔ (۵) آپ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو ظلم سے یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں۔ آپ نے

۳۔ الاعراف: ۱۵۷

۴۔ سید فضل الرحمٰن / ہادئ اعظم ﷺ۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۱، ۲۴۶

۵۔ حوالہ بالا، ص ۲۴۱

مشاہدہ فرمایا کہ ان کے ''ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کے مشابہ ہیں، ان کے ہاتھوں میں آگ کے ٹکڑے ہیں جو پتھر کی مانند ہیں اور وہ ان کے منہ میں ڈالے جاتے ہیں اور ان کی پشت سے نکل جاتے ہیں''۔(۶) آپ نے ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے سامنے پاکیزہ اور فربہ گوشت ہے اور ان کے ایک طرف لاغر اور بدبودار گوشت ہے، وہ پاکیزہ اور فربہ گوشت کو چھوڑ کر لاغر اور بدبودار گوشت کھاتے ہیں۔ آپ کے استفسار پر حضرت جبریل نے بتایا کہ ''یہ وہ لوگ ہیں جو ان عورتوں کو چھوڑ کر جو اللہ نے ان کے لئے حلال کی ہیں، ان عورتوں کی طرف جاتے ہیں جو اللہ نے ان کے لئے حرام کی ہیں''۔(۷)

اپنے مشاہدات برزخ کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں ایک ایسی قوم پر گزرا جن کے پیٹ کوٹھریوں کی مانند تھے اور ان میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو باہر سے نظر آ رہے تھے، میں نے کہا کہ اے جبریل یہ کون لوگ ہیں، جبرئیل امین نے کہا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو سود کھاتے ہیں''۔(۸)

اس سلسلے میں نماز سے روگردانی کرنے والوں، حقوق وامانت ادا نہ کرنے والوں کا انجام اور عذاب بھی پیش کیا گیا ہے اس میں ہمیں اسلام میں اخلاق کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ شب معراج کے مشاہدوں میں اخلاق کی جو آیات سامنے آتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی ہی ہمیں عذاب برزخ اور دائمی عذاب جہنم سے نجات دلا سکتی ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی دعائے ہجرت اور اذنِ ہجرت ہمیں اس آیت میں ملتی ہے:

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّ اَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّ اجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا (۹)

۶۔ ہادیٔ اعظم ﷺ: ج ۱، ص ۲۴۲

۷۔ ایضاً: ص ۲۴۲

۸۔ ایضاً: ص ۲۴۳

۹۔ بنی اسرائیل: ۸۰

اور (اے رسول) دعا کیا کیجئے کہ اے رب مجھے جس جگہ لے جایئے اچھی طرح لے جایئے اور جہاں سے نکالئے اچھی طرح نکالئے اور اپنی جناب سے میرے لئے غلبہ، اقتدار اور نصرت عطا فرمایئے۔

اس آیت کو مفسرین قرآن حکیم نے ہجرت کے پس منظر کو سمجھا اور سمجھایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معراج کے بعد اپنے رسول کو ہجرت کی خبر اور اس کے نتیجے میں اسلامی ریاست کے قیام کی نوید سے نوازا اور اس دعا سے یہ بات ہم پر واضح ہو جاتی ہے کہ دعا عبادت کا مغز اور خلاصہ ہے۔ دعا سے انسان اور اس کے رب کے درمیان رشتہ رفاقت میں بدل جاتا ہے اور یہی رفاقت اخلاق کی اساس بنتی ہے۔ یہ قربت صرف اللہ کا خوف ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ حُب الٰہی کی بنیاد بنتی ہے اور حُب الٰہی کا نسخہ قرآنِ حکیم کے مطابق اتباعِ رسول ہے:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O (۱۰)

کہہ دیجئے (اے مسلمانو!) اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری مغفرت فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بے حد مغفرت کرنے والا اور مہربان ہے۔

ہجرت نبوی کی توقیت ہمارا موضوع نہیں، ہمارا موضوع حیاتِ نبوی کے مختلف پہلوؤں سے اخلاق کا تعلق ہے، لیکن واقعے کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم ہجرت کی تاریخوں کا ذکر نظر انداز نہیں کر سکتے۔ پرانے اور نئے سیرت نگاروں کی بیان کردہ تاریخوں کا ذکر کرتے ہوئے سید فضل الرحمن نے جرح وتعدیل کے بعد ہجرت کی تاریخوں کا درج ذیل نقشہ مرتب کیا ہے

مکے سے غار کی طرف روانگی	یکم ربیع الاول
غار ثور میں آمد	یکم ربیع الاول
غار میں قیام	۴ ربیع الاول تک
غار سے روانگی	۵ ربیع الاول کی صبح

۱۰۔ آل عمران: ۳۱

قبا میں آمد	۱۲ ربیع الاول
قبا میں قیام	۱۵ ربیع الاول تک
مدینہ روانگی اور آمد	۱۶ ربیع الاول (۱۱)

و جعل لی من لدنک سُلطٰنًا نصیرا ، اور اللہ تعالیٰ نے ہجرت نبوی کو اقتدار، نصرت اور غلبے کا وسیلہ بنا دیا۔ یثرب میں اوس اور خزرج میں قبائلی رقابت تھی اور اس رقابت کو یثرب کے یہود بڑی عیاری کے ساتھ اپنی بالا دستی کے لئے استعمال کر رہے تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ زبور کی روشنی میں آخری نبی کے منتظر تھے، اور مشرکینِ یثرب سے یہی کہتے تھے کہ اس نبی کی آمد سے ہمارے غلبے اور نصرت کی تکمیل ہوگی، کیونکہ انہیں یقین تھا کہ یہ نبی اولادِ اسحاق میں ہوگا، لیکن رب العزت نے آخری نبی کی بعثت اولادِ اسماعیل میں فرمائی۔ یثرب کے یہود نے جب سرورِ کائنات کو دیکھا، ان کی باتیں سنیں، ان کے نبی ہونے کا ان کے قلب نے اعتراف کر لیا مگر عناد و حسد میں اس نبی کی نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے وہ اپنی اولاد سے زیادہ واقف تھے۔

۱۱۔ ہادی اعظم: ج ا ص ۳۱۸

مدینے میں میثاق

یہ ساری صورتِ حال نبوی بصیرت پر روشن تھی اور اس صورتِ حال سے معاہدوں کے ذریعے عہدہ برآ ہوا گیا۔ سب سے پہلے مسلمانوں کے درمیان مواخاۃ قائم کی گئی اور اسے ایک میثاق کی شکل دی گئی۔ مسلمانوں کے درمیان اس میثاق میں یہ بات واضح کی گئی کہ مسلمان، سارے انسانوں سے مختلف ایک امت ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان میثاق کی دوسری دفعات یہ تھیں کہ سارے مسلمان اس شخص یا جماعت کے خلاف متحد ہوں گے جو مسلمانوں کے درمیان ظلم، فساد اور گناہ کو رواج دینے میں کوشش کرے گی اور مسلمان کسی ذاتی رشتے کو ایسے افراد یا جماعت کے خلاف کاروائی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیں گے۔ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے خلاف کسی کافر کا ساتھ نہیں دے گا، عام مسلمان بھی اگر کسی سے کوئی عہد کرے گا تو اس عہد کی پاسداری ہر مسلمان پر لازم ہوگی، جو یہود مسلمانوں کی بالادستی قبول کر لیں گے ان کے ساتھ مسلمانوں جیسا سلوک کیا جائے گا اور ان کے خلاف کسی سے تعاون نہیں کیا جائے گا۔

معاشرتی اور اجتماعی زندگی سے متعلق مسلمانوں کے باہمی میثاق نے ایمان کو معاشرے کا دستور بنا دیا کیونکہ ہر دفعہ اسلام کی اقدار کے مطابق تھی۔ مسلمانوں کے باہمی میثاق کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے یہود مدینہ کے ساتھ بھی ایک میثاق مرتب فرمایا، اس میثاق کا یہ پہلو تو بہت واضح اور سامنے کا ہے کہ یہود نے اسلام اور مسلمانوں کی بالادستی کے سامنے چار و ناچار اپنا سر جھکا دیا، لیکن ہم اس میثاق کے اخلاقی پہلوؤں میں نبی کریم ﷺ کے اخلاقِ کاملہ کی

جامعیت اور پوری انسانی زندگی میں ہمدردی اور سلامتی پیدا کرنے کی قوت کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور یہ حیرانی چودہ صدیاں گزرنے کے بعد نئی معنویت کے ساتھ تاریخ کا ایک جلی اور عظیم عنوان بن گئی۔ اخلاقِ نبی ﷺ ہمارے لئے کامل اسوہ اسی لئے ہے کہ اس میں حیات انسانی کا ہر گوشہ اور پہلو سمٹ آیا ہے اور اس اخلاق کی عملیت اور ہمہ گیری کی کوئی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مہاجرین اور انصار کی سب سے بڑی دولت اور سرمایہ اسلام تھا، لیکن مدینے میں ان دونوں کی صورت حال (Situation) مختلف تھی اور اس کا لحاظ رکھتے ہوئے ان دونوں کے درمیان ایسا معاہدہ، دونوں کی نفسیاتی ضرورت تھا۔ یہود کا معاملہ مختلف تھا۔ ان کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لئے تحریری معاہدے کی ضرورت تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ معاہدہ مسلمانوں کی بالادستی اور غلبے کی دستاویز تھا جس پر یہود نے دستخط کر دیئے۔ ان پہلوؤں سے عظیم تر یہ پہلو ہے کہ یہ میثاق رسول اللہ ﷺ کے کردار میں صلح جوئی، امن پسندی اور بقائے باہمی کی خواہش کا اظہار ہے۔ یہود نے اپنی تاریخ اور اپنے مزاج کے مطابق بارہا اس میثاق کی خلاف ورزی کی اور انسانیت کو امن اور سلامتی کا پیغام دینے والا رسول ان خلاف ورزیوں اور معاہدہ شکنی کے باوجود بھی ان کو سزا دینے کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھا، یہاں تک کہ سورۃ توبہ میں ان کا معاملہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے کر دیا گیا اور مرکزِ اسلام ان بدبختانِ ازلی سے خالی کرا لیا گیا۔ عدل ہادی اعظم کے کردار کا بہت اہم اور نمایاں پہلو ہے۔ یہ کائنات بھی عدل اور حق کی بنیادوں پر قائم ہے اور یہ عدل قانون اور میثاق تک محدود نہیں بلکہ رسولِ اعظم ﷺ نے عدل کو ہر گھڑی پیش نظر رکھا اور اسی وجہ سے آپ کا کردار اور طرز عمل ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میزان حیات بن گیا۔ یہود مدینہ کے علاوہ چند ہی برسوں کے بعد فتح مکہ کے موقع پر مشرکین مکہ کے ساتھ بھی وہ سلوک کیا گیا جو تاریخ انسانی میں امن کے قیام اور فساد کو روکنے کی انتہائی مثال ہے اور جس حد کوئی انسانی معاہدہ نہیں پہنچ سکا ہے اور کوئی انسانی فاتح اس عالی حوصلگی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکا ہے جس کی مثال محمد عربی علیہ الصلوٰۃ و السلام نے پیش فرمائی اور جس کی ہدایت ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے:

وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۠ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ ۠ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ O (۱)

جن لوگوں نے تمہیں مسجد حرام میں (داخلے سے) روکا تھا ان کی دشمنی (اور عناد) تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم (سزا دینے میں) حد سے گزر جاؤ، اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں مددگار نہ بنو اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے اخلاق نے انسانوں اور خاص طور پر میدانِ جنگ میں فتح پا لینے والوں کو یہ سبق دیا ہے کہ زمین پر فروتنی کے ساتھ چلنا اور بے علم اور جاہلوں سے اعراض برتنا اور پہلو تہی کرنا اللہ کے سچے بندوں کی پہچان ہے:

وَ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا (۲)

رحمان کے حقیقی اور سچے بندے وہ ہی ہیں جو زمین پر فروتنی (اور عاجزی) کے ساتھ قدم رکھتے ہیں اور جب جاہل اور بے علم اُن سے الجھنے لگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں (تم پر) سلام ہو (اور یوں فساد کی جڑ کاٹ دیتے ہیں)۔

یہود کے ساتھ جو معاہدہ ہوا اس کی نہج وہی تھی جو مسلمانوں کے باہمی معاہدے کی تھی، اس معاہدے کی اہم شقیں آنے والی سطور میں پیش کی جا رہی ہیں:

۱۔ بنی عوف کے یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک (سیاسی) قوم کی تشکیل کریں گے، دونوں اپنے اپنے دین پر عمل کریں گے، بنو عوف کے علاوہ دوسرے یہودیوں کو بھی مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی، یہود کے متعلقین کو بھی یہی آزادی حاصل ہوگی۔

۲۔ اس معاہدے کے ایک فریق کے خلاف جنگ دوسرے فریق کے خلاف بھی

۱۔ المائدہ: ۲

۲۔ الفرقان: ۶۳

جنگ سمجھی جائے گی اور دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔

۳۔ مظلوم کی مدد کی جائے گی اور اُسے ظلم سے بچایا جائے گا۔

۴۔ اس معاہدے پر عمل درآمد کے سلسلے میں جو اخراجات ہوں گے یہود اپنے اخراجات کے ذمے دار ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات کے۔

۵۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی، ایک دوسرے کے مفاد کی نگہ داری فریقین کا فرض ہوگا (اس دفعہ سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ کسی معاہدے پر عمل خیر خواہی کے جذبے کے بغیر نہیں ہوسکتا، معاہدے کے الفاظ سے زیادہ اس کی روح اہم تر ہے۔ عہد حاضر کی ابلیسی سیاست اور سفارت کاری اس عنصر سے تہی دامن ہے، اسی لئے معاہدات پر "قائم" رہتے ہوئے ان سے گریز ہمارے عہد کا خاصہ ہے۔ اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی سیاسی حکمت عملی سیاست دانوں اور سفارت کاروں کے پیش نظر ہوتی تو سیاست حسنات میں داخل ہوتی اور دنیا میں امن کے حصول کا وسیلہ ہوتی)۔

۶۔ اگر کسی کے خلاف جنگ کی نوبت آئی تو دونوں فریق (یہود اور مسلمان) اخراجاتِ جنگ برداشت کریں گے۔

۷۔ قریش اور اُن کے حامیوں کے ساتھ کوئی ایسا تعلق نہیں رکھا جائے گا جس سے مدینے کی سلامتی خطرے میں پڑے اور قریش کے مددگاروں کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کیا جائے گا۔

۸۔ یہ معاہدہ کسی ظالم اور مجرم کے لئے ظلم اور جرم کا جواز مہیا نہیں کرے گا۔ (۳)

اس معاہدے کی اہم ترین شق یہ تھی کہ کسی جھگڑے، اختلاف اور کسی نئے مسئلے کے پیدا ہونے کی صورت میں فیصلہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی روشنی میں محمد ﷺ کریں گے۔ معاہدے کی اس شق نے عملی طور پر سرورِ کائنات ﷺ کو مدینے کی ریاست کا مسلم سربراہ بنا دیا۔

یہ معاہدہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عالیہ کا پرتو ہے۔ دونوں فریقوں کے حقوق کی پوری حفاظت، ریاست میں یہود اور مسلمانوں کی حیثیت میں برابری اور اجتماعی

۳۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ/ الوثائق السیاسیہ۔ بیروت، دار النفائس، ۱۹۸۵ء

زندگی میں اخلاقی اقدار کی پاس داری، کوئی کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ کسی ظالم کا ساتھ نہیں دیا جائے گا۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

رسول اللہ ﷺ کی قیادت میں مسلمانوں کے اجتماعی اخلاق کو قوت ملی اور آپ نے معاشرے کو توازن، انصاف اور اعتدال کی خصوصیات عطا فرمائیں اور انسانیت سے آپ ﷺ کی خیر خواہی کا یہ عالم کہ آپ نے مغضوب قوم یعنی یہود کو بار آفرینی اور اصلاح کا موقع عطا فرمایا۔

مدینہ میں اسلامی معاشرے کا قیام

ریاست معاشرے کی منظم ترین صورت اور ادارے کا نام ہے، ہر ریاست کے خصائص اس کے شہریوں کے مزاج، اجتماعی اخلاق اور ضروریات کے مطابق ہوتے ہیں۔ عہد حاضر کی ریاستوں پر ایک نظر ڈالئے، مغرب میں جمہوریت کا سکہ رواں ہے اور اس جمہوریت کے نام پر دوسرے ممالک پر لشکر کشی کی جاتی ہے کیونکہ یہ جمہوریت اخلاقی اقدار سے محروم ہے اور یہ دہرے معیار رکھتی ہے۔ برطانیہ عظمٰی جب ایک عالمی اور نوآبادیاتی طاقت تھا تو انگلستان کے لوگوں کے لئے انصاف اور جمہوری قوانین تھے اور نوآبادیوں کے لئے تازیانے تھے، ہاں ان مظالم اور تازیانوں کو بھی ''قانون'' کا نام دیا جاتا تھا۔ فرانس جس نے مغرب کو پہلے پہل آزادی کا درس دیا اور امریکہ کو مجسمۂ آزادی کا تحفہ، اس نے الجزائر کے مظلوموں پر کون سا ستم نہیں کیا۔ دوسرے جمہوری ممالک کی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ امریکہ جو جمہوریت کے نام پر خدائی فوج دار Police man of the World بن گیا ہے اس نے کس طرح ہوائی پر قبضہ کیا، کس طرح فلپائن کو اپنی ''کالونی'' بنایا، کس طرح کوریا اور ویت نام میں وحشت و بربریت کی تاریخ رقم کی، اور آج کس طرح افغانستان اور عراق کو عالمی قبرستان بنایا جارہا ہے، یہ کہانی تو اس ''روشن'' دور کی کہانی ہے، آج کی جمہوریت کی تصویر اقبال کا یہ مصرع ہے:

چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

اور یہ حقیقت اس شعر میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اخلاقی اقدار کے بغیر انسان کا ہر ادارہ انسانیت کے لئے زہر ہلاہل ہے۔

محمد رسول اللہ کے ساتھ آپ کے جو صحابہ ہجرت کر کے یثرب کو مدینۂ رسول بنانے کے لئے گئے تھے ان کے دل انسانوں کی خیر خواہی کے خزینے تھے۔ یہ وہ تھے جنہوں نے غلاموں کو اپنے سینوں سے لگایا اور انسان کی تکریم کو اس درجے پر پہنچا دیا جہاں معاشرتی طور پر کچلے ہوئے انسانوں کو عالی مرتبت انسانوں کے برابر یا ان سے زیادہ عزت حاصل ہوئی، کیونکہ ان کے ہاں عزت کا پیمانہ تقویٰ، کردار اور اخلاق تھا۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں امیر المؤمنین عمر فاروقؓ، بلال حبشی کو سیدی کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور انصارِ مدینہ نے تو ساری دنیا کی دشمنی کی قیمت پر اپنے رسول کو حاصل کر لیا تھا۔

مدینہ میں رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ایک میثاق منعقد کیا اور ان کے درمیان مؤاخاۃ قائم فرمائی اور اسی کے ساتھ ان کے اجتماعی ادارے قائم فرمائے، دین و دنیا کی ثنویت کا کوئی تصور اسلام میں نہیں تھا، اسی لئے مسجد ان کا مرکزی ادارہ بنی۔ نماز تو دین کا ستون تھی۔ مسجد نے نماز کو ان کی زندگی کا مرکزی ادارہ بنا دیا، یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس کی عبادات بھی ادارہ ہیں اور مقامِ عبادت بھی ادارہ ہیں۔ ادارے ہی کسی معاشرے کو استحکام عطا کرتے ہیں۔ آج مسلمان معاشروں کا المیہ ہے کہ ہمارا مقام عبادت یعنی مسجد ایک ادارہ نہیں رہی، جو لوگ ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مسائل اور حالات کا انہیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح بیشتر مساجد میں آج تعلیم و تعلم کا کوئی بندوبست نہیں۔

مکہ معظمہ میں جو لوگ اسلام لائے ان میں سے ہر ایک تقوے کی تجسیم تھا۔ تقویٰ اللہ کی محبت اور اس کی خشیت کا حاصل جمع ہے۔ تقوے کے مفہوم کو حضرت اُبی بن کعبؓ نے ایک مثال کے ذریعے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے پیش کیا تھا: انہوں نے فرمایا تھا کہ امیر المؤمنین اگر آدمی ایک ناہموار اور بہت تنگ پگڈنڈی سے گزر رہا ہو جس کے دونوں

طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں اور اس کے جسم پر بیش قیمت لباس ہو اور وہ اس راستے کو اس طرح طے کرلے کہ نہ جسم پر خراش آئے اور نہ کپڑے کہیں سے پھٹیں تو اس طرح راستے سے گزرنا تقویٰ ہے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس مثال کو بہت پسند فرمایا۔

زندگی ایک ایسی ہی پگڈنڈی ہے جس کے دونوں طرح ترغیبات کی جھاڑیاں ہیں، گناہ کی دعوتیں ہیں، اس کو ذات کی پاکیزگی اور قلب ونظر کی طہارت کے ساتھ صرف اللہ کی محبت اور خوف کی بنا پر ہی طے کیا جاسکتا ہے۔ صحابہ کرام حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کے ذریعے اس تقوے کو حاصل کر چکے تھے اور اب مدینہ منورہ میں ان کے سامنے یہ مرحلہ تھا کہ وہ ذاتی تقوے کو معاشرے کا مزاج اور اس کی شناخت بنا دیں۔ اس کے لئے اداروں کا قیام لازم تھا تاکہ یہ اجتماعی تقویٰ اسلامی ریاست کے دستور کی بنیاد بن سکے۔

اپنے مختصر قیام قبا کے دوران سرورِ کائنات ﷺ نے مسجد قبا کی تعمیر فرمائی۔ مسجد قبا مدینۂ منورہ سے تین میل پہلے اس آبادی میں تعمیر کی جو بلندی پر ہے اور عالیہ کہلاتی ہے۔ اس نام کو اشارۂ الٰہی سمجھیے۔ عالیہ میں نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت کلثوم بن الہدم رضی اللہ عنہ کے مکان پر قیام فرما کر اس مکان اور اس کے مالک کے نام کو ہماری تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ حضرت کلثوم کی سعادت اور خوش بختی یہیں تک محدود نہیں رہی بلکہ مسجد قبا کی تعمیر اسی زمین پر کی گئی جو حضرت کلثوم کی ملکیت تھی۔ اس مسجد کے معمار اعظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور آپ کے مددگار اور مزدور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تھے۔ تعمیر کے لئے اہلِ قبا نے آپ ﷺ کے فرمان پر پتھر اکٹھے کئے، آپ نے سمتِ قبلہ ایک لکیر کھینچی اور ایک پتھر رکھ کر مسجد کی تعمیر کا آغاز فرمایا۔ آپ کے حکم پر اس کے برابر دوسرا پتھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رکھا، تیسرا پتھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے، چوتھا پتھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور پانچواں پتھر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے۔ بعد میں حضرت علیؓ خود تشریف لا کر مسجد قبا کی تعمیر میں شریک ہوگئے تھے۔ مسجدِ قبا کی تعمیر میں پہلے پانچ پتھروں کی ترتیب کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب خلافت کا جیسے تعین فرما دیا اور مسجد اور ریاست کے رشتے کی وضاحت بھی فرما دی گئی۔

صحابۂ کرام مسجد قبا کی تعمیر کرتے جاتے، پتھروں کو ان کی جگہوں پر لگاتے جاتے، کھجور کے تنوں سے ستون قائم کرتے جاتے اور چٹائی اور کھجور کے پتوں سے چھت ڈالتے جاتے اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے اشعار کو مل کر دہراتے جاتے۔ یہ الفاظ فضا میں نغمۂ جاوید کی طرح دائرے بنا رہے تھے۔

افلح من يعالج المساجد
و يقرء القرآن قائما و قاعدا
و لا يبيت الليل عنه راقدا

اس نے فلاح پائی جس نے مسجد بنائی، جس نے بیٹھے ہوئے اور کھڑے رہ کر قرآن کی تلاوت کی، اور جس نے رات جاگ کر گزاری۔

عربی مصرعوں میں زمانہ مضارع کا استعمال کیا گیا ہے، حال اور مستقبل۔ ہم نے اردو میں صوتی آہنگ کو اجاگر کرنے کے لئے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ مصرعے ہمیشہ کے لئے مسلم معاشرے میں مسجد کی تعمیر کی اہمیت کو پیش کرتے رہیں گے۔ اور یہ حقیقت سامنے آتی رہے گی کہ مسجد کے معمار ہر حال میں قرآن کو اپنے ہونٹوں، دل اور عمل میں سجائے رکھتے ہیں اور ان کی راتیں احکامِ الٰہی کو یاد کرنے میں گزر جاتی ہیں۔ تعمیر مسجد ان کی زندگی اور شب و روز کا ایک استعارہ ہے۔ اسی مسجد کے لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ O (۱)

البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقوے پر پہلے دن سے رکھی گئی ہے، اس بات کا حق رکھتی ہے کہ آپ اس میں (عبادت اور نماز کے لئے) کھڑے ہوں، اس میں ایسے لوگ ہیں جو طہارت اور پاکی سے محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پاک اور طاہر لوگوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ قرآنی آیت مسجدِ قبا کے ساتھ ساتھ مسجد نبوی الشریف کا بھی معنویؑ طور پر احاطہ کر

۱۔ التوبہ: ۱۰۸

لیتی ہے اور ان کے لئے واحد (مسجد) کا استعمال مقصد کے اعتبار سے ان کے ایک ہونے پر دلالت کرتا ہے، جیسے قرآن مجید میں کتبِ ساوی کے لئے لفظ کتاب استعمال کیا گیا ہے۔

''مسجد تقویٰ'' کے ساتھ ''مسجد ضرار'' کا بھی ذکر ہے جس کی تعمیر کا مقصد ہی مسلمانوں میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا تھا۔ بظاہر دونوں عمل یکساں تھے مگر مقصدِ تعمیر نے ایک کو ڈھائے جانے کا مستحق بنایا اور دوسری مسجد (مسجد تقویٰ) مقصود و مطلوبِ مومن قرار پائی۔ مسجد کی مثال سے ہمیشہ کے لئے یہ بات روشن اور واضح ہوگئی کہ اسلامی ریاست مسلمان معاشرے کو پاکی اور تقویٰ عنایت کرے گی اور اگر کوئی اسلامی ریاست کو نعرے اور سیاست کی بنیاد بنائے گا تو کامیابی اس سے دور رہے گی۔

میثاق بین المسلمین، میثاقِ مدینہ (یہود سے معاہدہ) اور مسجد قبا اور مسجد النبوی الشریف کی تعمیر مدینہ کی اسلامی ریاست کے سنگِ بنیاد ہیں۔

مدینہ منورہ کا اسلامی معاشرہ

اسلامی ریاست کے قیام اور مدنی زندگی کی اولین سرگرمیوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد نبی اکرم ﷺ نے ان نفوسِ قدسیہ کے ساتھ مل کر رکھی جو اسلامی اخلاق اور صفات کے مالک تھے۔ وہ اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ساتھ اپنی محبت کے ثبوت دے چکے تھے۔ صحابۂ کرام ؓ استقلال، صبر اور پاکیزگیٔ قلب و نظر کے پیکر تھے۔ ایسے افراد کے بغیر اسلامی ریاست وجود میں نہیں آسکتی تھی اور دوسری طرف اس حقیقت کو سامنے رکھئے کہ اسلامی ریاست نئے مسلمان ہونے والوں کے لئے ایک مثالی معاشرہ تعمیر کرتی ہے۔ ایک طرف افراد کے ذریعے معاشرے کے خدوخال متعین ہو کر سامنے آتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی معاشرہ اسلام کو اپنانے والوں کی راہوں کو سہل بناتا ہے۔

مدینہ منورہ کا اسلامی معاشرہ رسول اللہ ﷺ نے قرآنی بنیادوں اور اپنے اخلاقِ عالیہ کی اساس پر تشکیل فرمایا۔ اس معاشرے کے مختلف پہلو مسجدوں، بازاروں اور گھروں میں کس طرح نظر آتے ہیں، اس کو ہم ان شاء اللہ مناسب مقام پر بیان کریں گے، لیکن اس کی بنیادوں، عناصر اور اجزائے ترکیبی کو مختصراً یہاں بیان کرنا مناسب ہوگا۔

کسی بھی معاشرے کی بنیاد تعاون پر رکھی جاتی ہے، صحت مند اور انسان ساز معاشرے میں خیر، عدل اور مساوات کے قیام کے لئے تعاون کیا جاتا ہے اور ناہموار معاشرے میں لوگ ظلم اور عدوان پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ مدینہ میں وہ معاشرہ وجود میں آیا جس کے بارے میں ارشاد ہوا کہ یہ معاشرہ انسانیت اور انسانی اقدار کے فروغ کے لئے تشکیل پایا ہے اور یہ بات

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے حوالے سے پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نبوت صرف ایک نبی کی بعثت نہیں تھی بلکہ آپ کے ساتھ ایک امت بھی مبعوث فرمائی گئی تھی:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۱)

تم بہترین امت ہو جو انسانوں کے لئے وجود میں لائی گئی، کہ تم معروف اور اچھی باتوں کا حکم دیتے ہو (اور بھلائی کی طرف دعوت دیتے ہو) اور منکرات (اور بری باتوں) سے روکتے ہو اور اللہ جل جلالہٗ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور خیر امم کے ہر طبقے نے اپنا کردار ایسے مثالی معاشرے کے قیام کے لئے ادا کیا۔ کسی بھی معاشرے میں افراد کے مراتب میں فرق ہوتا ہے لیکن معاشرے کی تعمیر میں ہر ایک کی ذمہ داری اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں کسی مصنوعی اور غیر حقیقی مساوات کو اپنا آدرش اور نصیب العین قرار نہیں دیا، لیکن ہر فرد کے حقوق کی ضمانت دی اور اس باب میں کسی کو کسی دوسرے پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ مدینہ منورہ کے معاشرے کے خدوخال کو ابھارنے میں ایک مسلمان غلام نے بھی جو حصہ لیا وہ بھی اتنا ہی اہم ہے جو ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم کا حصہ ہے۔ ایک اخلاقی معاشرے کی یہ ایک بنیادی خصوصیت ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَ اِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (۲)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا (اور اقتدار عطا کیا) اور ایک کا رُتبہ دوسرے سے بڑھایا تا کہ تم کو ان چیزوں میں آزمائے جو اس نے تمہیں دی ہیں۔ بے شک آپ کا رب جلد حساب لینے والا

۱۔ آل عمران: ۱۱۰

۲۔ الانعام: ۱۶۵

ہے اور بے شک وہ مغفرت کرنے والا رحیم ہے۔

اس آیت شریفہ کا مفہوم بہت وسیع ہے اور سیاق و سباق کے ساتھ اس کے معانی میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلا مفہوم تو یہی ہے کہ انسان کو خلافتِ ارضی عطا کی گئی۔ دوسرے معانی یہ ہیں کہ اللہ نے تمہیں سلطنت عطا کی اور اختیارات عطا کر کے تمہاری آزمائش کی اور وہ اللہ ہی ہے جو مختلف حیثیتوں اور صلاحیتوں کے لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق آزماتا ہے اور اس سلسلے میں محاسبہ بھی کرتا ہے اور معاف بھی کرتا ہے۔ (واللہ اعلم)

مراتب، صلاحیتوں، پیشوں اور ذمے داریوں کے اختلافات کے باوجود اسلامی معاشرے کے افراد سلسلۂ اخوت میں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کے حقوق کا یکساں احترام کیا جاتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (۳)

بے شک سارے مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور اس سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

اس آیت میں ایک اصولی بات فرمائی گئی ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ۔ اس سے پہلے کی آیت میں مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان اختلاف اور جھگڑے کا ذکر اور اس بارے میں معاشرے کے طرزِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے کہ ان دونوں گروہوں میں عدل کے ساتھ صلح کرا دی جائے اور اگر زیادتی کرنے والی جماعت اپنے رویہ کی اصلاح نہ کرے تو اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے یہاں تک کہ وہ ظلم اور زیادتی سے باز آ جائے۔ مدینۂ منورہ میں اسلامی معاشرے میں ایسے وقتی اختلافات پیدا ہوئے، لیکن چونکہ اس معاشرے میں قوت کے ساتھ ساتھ انصاف کی قدر، قوتِ نافذہ کا درجہ رکھتی تھی، اس لئے اختلافات اور جھگڑے حسن و خوبی کے ساتھ فیصل کرا دیئے جاتے تھے اور اخوت میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا تھا۔ اس معاشرے

۳۔ الحجرات: ۱۰

کے ہر فرد کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اس لئے عدل کے ساتھ فریقین میں صلح کرادی جاتی تھی۔ کیونکہ جماعتِ مومنین کو رب العالمین نے حکم دیا تھا:

فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَہُمَا بِالۡعَدۡلِ وَ اَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ○ (۴)

پس ان کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرادو اور عدل کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

جس معاشرے میں عدل ہوگا وہ ظلم سے پاک ہوگا خواہ وہ معاشرتی اور قانونی ظلم ہو یا اس ظلم کا عقائد کی دنیا سے تعلق ہو۔ قرآن حکیم نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے۔ ظلم ایک کثیر الجہاتی اور وسیع المفہوم لفظ ہے۔ کسی کی ملکیت، حدود اور اختیار میں ناجائز تصرف ظلم ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی اور کو رب اور معبود قرار دینا اسی اعتبار سے ظلم ہے۔ جب آپ کسی کے حدود میں بے جا تصرف کریں گے تو کسی کی جگہ کسی اور کو دے دیں گے، اس طرح توازن بگڑ جائے گا اور یہ ہر ایک کے ساتھ ظلم ہوگا۔ ظلم کے معانی میں ظلمت کا پہلو بھی موجود ہے، کسی کی جگہ کسی کو دے دینا، اس سے بڑھ کر تاریکی اور کیا ہوگی جب عدل کی روشنی معدوم ہوتی ہے تو ظلم کی ظلمت اس خلا کو پر کرتی ہے۔ ظلم کی مختلف شکلیں پچھلی امتوں کی تاریخ میں ملتی ہیں۔ عقیدے کے ظلم یعنی شرک کے علاوہ مترفین نے اہل ایمان کے لئے زندگی کو ہمیشہ مشکل بنایا اور ان کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا، آخر عذاب الٰہی نے ان بستیوں کو پکڑ لیا اور وہ نشانِ عبرت بن کر رہ گئیں:

وَ کَاَیِّنۡ مِّنۡ قَرۡیَۃٍ اَمۡلَیۡتُ لَہَا وَ ہِیَ ظَالِمَۃٌ ثُمَّ اَخَذۡتُہَا ۚ وَ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ ○ (۵)

بہت سی ظلم کرنے والی بستیوں کو میں نے ڈھیل دی، پھر آخر انہیں (اس ظلم کی پاداش میں) پکڑ لیا اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔

۴۔ الحجرات: ۹

۵۔ الحج: ۴۸

پوری انسانی تاریخ کے پس منظر میں مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست میں ہر نوعیت اور ہر سطح کے ظلم کی بیخ کنی کی گئی اور عدل معاشرے کے اجتماعی خیر کا حصہ بن گیا۔ اس حد تک کہ آج کی روشن اور عدل کی مدعی دنیا میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب ایک یہودی نے قرض کی کھجوروں کی ادائی کے سلسلے میں ریاست کے سربراہ اور اللہ کے عظیم ترین رسول کے ساتھ گستاخی کے ساتھ بات کی تو صحابہ کرام کو شدید غصہ آیا لیکن نبی برحق ﷺ نے نہایت نرمی کے ساتھ اپنے اصحاب سے فرمایا کہ یہودی حق پر ہے اور تمہیں اس سے ناراض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔

مدینے کے معاشرے میں ہر نوع کی تجارت ہو رہی تھی، کاشت کاری میں بھی لوگ مصروف تھے، دوسرے پیشہ ور بھی روٹی کما رہے تھے، ریاست بازاروں کے نظم و نسق کی درستی کے لئے اپنا کردار ادا کر رہی تھی (۶) تمام اقتصادی سرگرمیوں کے باوجود اہلِ مدینہ کو پیٹ بھر کر روٹی فتحِ خیبر کے بعد مل سکی۔ ان حالات میں مدینے کے معاشرے میں ایک دوسرے کی خیر خواہی اور ایثار کے جذبے ہی سے اتحاد اور معاشرتی ہم آہنگی قائم رہی۔ انصار و مہاجرین کے باہمی تعلقات اور ان کی اخوت بھی اسی خیر خواہی اور ایثار کی بنیادوں پر قائم تھی۔ ایثار کے اس پہلو پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے مہاجروں کو غنیمت میں زیادہ حصہ دیا لیکن انصار نے اس پر دل میں تنگی اور گھٹن اور حسد محسوس نہیں کیا۔ غزوہ حنین کے بعد غنیمت کی تقسیم کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں اس صورت حال کو اس طرح پیش کیا گیا ہے:

وَ الَّذِیۡنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الۡاِیۡمَانَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ یُحِبُّوۡنَ مَنۡ ہَاجَرَ اِلَیۡہِمۡ وَ لَا یَجِدُوۡنَ فِیۡ صُدُوۡرِہِمۡ حَاجَۃً مِّمَّاۤ اُوۡتُوۡا وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ ؕ۟ وَ مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ (۷)

۶۔ یہ تفاصیل آگے چل کر پیش کی جائیں گی، اس وقت گفتگو مدنی معاشرے کے اخلاقی پہلو اور اس کے اجزائے ترکیبی کی ہو رہی ہے۔

۷۔ الحشر: ۹

اور ان کے لئے جنہوں نے اس گھر (مدینہ) میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنالی ہے اور ان سے محبت کرتے ہیں جنہوں نے ان کی طرف ہجرت کی اور جو کچھ ان مہاجروں کو دیا جائے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہیں کرتے بلکہ وہ انہیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں خواہ ان کو خود ہی کتنی سخت حاجت ہو۔ جس نے اپنے نفس کو بخل سے بچالیا وہ ہی فلاح پانے والوں میں سے ہے۔

یہ ہیں وہ اقدار اور اصول جن پر مدینے کے مسلم معاشرے کی بنیاد رکھی گئی۔ معاشرے کے اس تشکیلی دور میں مسلمانوں کو یہود کی سازشوں سے بھی واسطہ پڑا اور قریش مکہ نے اسلام کے خلاف حالتِ جنگ کو برقرار رکھا۔ وہ مدینہ کے یہودیوں سے مسلسل رابطے میں رہے کہ کس طرح مسلمانوں میں انتشار پھیلایا جائے اور کس طرح مسلمان مدینۃ النبی سے نکالے جاسکیں۔

انسانی زندگی کی غیر معمولی صورت حال۔ جنگ

اس وقت تک یہ جنگ یک طرفہ تھی، یعنی قریش نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر حربہ استعمال کرلیا۔ مکہ معظمہ میں اسلام افراد کے دلوں میں گھر کررہا تھا اور ان مسلموں کو عقائد اور اسلوبِ حیات کی تعلیم دی جارہی تھی۔ یہ صبر، استقلال اور ثابت قدمی سے کفر کے ہر حملے کا جواب دے رہے تھے اور ویسے بھی وہ جس دین کے راستے پر سفر کررہے تھے اس نے فساد کو قتل سے زیادہ سخت قرار دیا تھا۔ اسلام حیاتِ انسانی میں ہمہ جہتی ہمدردی اور سکون وامن کی طرف دعوت دے رہا تھا۔ اسلام امن کا راستہ ہے اور اس کا ثبوت یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہجرت کے بعد یہودیوں اور مدینہ کے گرد ونواح کے دوسرے قبائل کے ساتھ امن اور بقائے باہمی کے معاہدے کیے، لیکن کفر وشرک کی سازشیں جاری رہیں، اور آخر مسلمانوں کو کافروں کے خلاف جنگ کی اجازت دی گئی اور یوں جہاد ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگیا۔ قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ۔ جہاد تو پہلے ہی دن سے آئین اسلام میں داخل تھا۔ مسلمانوں نے اپنے دین کی خاطر ہر امکانی جدوجہد ہر مرحلے میں کی۔ قتال کا پہلا حکم ہمیں سورۃ الحج کی آیات ۳۹ اور ۴۰ میں ملتا ہے:

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۝ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ

وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ○(۱)

ان کو جن سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں اور جن پر ظلم کیا جا رہا ہے، مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے، بے شک اللہ تعالیٰ ان کی نصرت پر قادر ہے۔ یہ وہ (مظلوم) ہیں جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکالا گیا، صرف اس لئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا تو عبادت گاہیں، گرجے، یہودیوں کے معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے ڈھادی جاتیں۔ جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا اور اللہ بڑی قوتوں والا اور بڑے غلبے والا ہے۔

اس فرمان اجازتِ قتال میں اس اجازت کے اسباب اور حدود بھی بیان فرمادی گئی ہیں۔ نبیٔ اکرم ﷺ کے اخلاق اور دین کے قیام کے لئے آپ کی پامردی اور استقلال نے انسانی زندگی کی اس خلافِ معمول سرگرمی کو جسے جنگ کہا جاتا ہے، اخلاقی ضابطے، حدود و قیود اور مقصد عطا کر دیا ہے۔ جنگ ظالموں کی سرکوبی اور مظلوموں کی مظلومیت کو ختم کرنے کا وسیلہ قرار دی گئی ہے اور جنگ کا مقصد اور واحد مقصد اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ زمیں گیری اور اپنی ''شہنشاہیت'' کے قیام کے لئے جنگ حرام ہے اور ایسی جنگ کا نبی اکرم ﷺ کے دین میں کوئی تصور نہیں۔

گرجوں، عبادت گاہوں اور یہودیوں کے معابد کا ذکر کتنا برمحل ہے اور کس طرح جنگ کے حدود کا تعین کرتا ہے۔ اللہ کی عبادت کے طریقوں اور مختلف ادیان کے ماننے والوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت بھی اس اذنِ قرآنی کا جزو ہے۔

اسلام کا جہاد اور قتال فی سبیل اللہ انسانیت کے لئے کیسی برکت ہے، اس کا انداز ان جنگوں سے ہوسکتا ہے جو آج قیامِ جمہوریت کے نام پر مغربی سامراج نے مسلمان ملکوں اور تیسری دنیا کے ممالک پر مسلط کر رکھی ہیں، اور سیاست و تاویل کے ہزار پردوں کے باوجود یہ

۱۔ الحج: ۳۹، ۴۰

حقیقت آج کے ہر باشعور آدمی پر بے نقاب ہے کہ آزادی، جمہوریت کے نعروں کے پیچھے ان ظالموں کے اصل مقاصد چھپے ہوئے ہیں اور یہ مقاصد ہیں ان ملکوں کے تیل، معدنیات اور قدرتی ذخائر پر قبضہ۔ پھر یہ بے غیرتی تو دیکھئے کہ اپنے لئے دوسرے اخلاقی معیار ہیں اور مخالفوں کے لئے دوسرے۔ اپنے جوہری اسلحہ خانے میں اضافہ ان کا حق ہے اور دوسرے جوہری توانائی کے حصول سے محروم رکھے جائیں گے۔

لمحہ حاضر سے گزرتے ہوئے ماضی کا سفر کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ بیسویں صدی عیسوی کی جنگوں میں فاتح اقوام نے مغلوب ملکوں اور قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ انسان نے انسان پر کیسے ظلم ڈھائے ہیں اور کس طرح اپنے بنائے ہوئے کنونشن اور معاہدوں کی دھجیاں اڑائی ہیں۔ کس طرح محکوم قوموں کے حصے بخرے کئے ہیں اور ان کی زمین کو آپس میں تقسیم کیا ہے۔ ترکی اور جاپان کے ساتھ اتحادیوں نے کیسی بربریت روا رکھی۔ مغربی ممالک نے مفتوح قوموں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس نے مستقبل کی نئی جنگوں کو جنم دیا۔ پہلی جنگ عظیم، دوسری عالمی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور اقوامِ غالب نے اپنے حاشیہ نشینوں اور پروردہ ملکوں کی زیادتیوں، انصافیوں اور کمزوروں پر مظالم کی پشت پناہی کی۔ جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں اس وقت اسرائیل نے جنوبی لبنان کی بستیوں کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا ہے اور التوائے جنگ (سیز فائر) کی مسلسل خلاف ورزیاں کر رہا ہے اور امریکہ ہر ظلم میں اس کی تائید کر کے برابر کا شریک بن گیا ہے۔ اقوام متحدہ کو امریکہ نے ہمیشہ اپنی پیش دست کنیز بنانے کی کوشش کی ہے اور اگر فرانس اور مغرب کے چند ملک قدرے غیر جانب داری کا مظاہرہ نہ کرتے تو التوائے جنگ کا بھی مرحلہ نہ آتا۔ کون سا اسلامی ملک ایسا ہے جو امریکی دھمکیوں کا ہدف نہیں ہے، کچھ مسلمان ملک امریکہ کے حاشیہ برداروں میں شامل ہو کر راست دھمکیوں سے محفوظ ہیں، لیکن انہیں بھی امریکی ''جمہوریت'' کے نام پر سبق پڑھاتے رہے ہیں اور غیروں کو ان کی دوستی حاصل کرنے کے لئے اپنے ''حلیفوں'' پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہندوستان کو تو ہر قسم کی جوہری آسانیاں فراہم کی جارہی ہیں اور پاکستان کو ایف۔۱۶ طیاروں کے حصول میں رقم کی ادائیگی کے باوجود بھی اپنی شرطوں کا پابند بنایا جارہا ہے۔ آج کے اس منظر نامے سے جنگ کے

سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے اسوۂ حسنہ، اخلاق اور اسلام کے مؤقف کی اہمیت اور اُجاگر ہو جاتی ہے۔ اسلام جنگ کے دوران ثابت قدمی اور دشمن کو کچلنے کی تعلیم دیتا ہے اور اس لئے کہ ''جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے''۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں جارحانہ جنگ کا تصور نہیں ہے لیکن جب کفر آمادہ پے کار ہو تو:

فَاِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤی اِذَاۤ
اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً حَتّٰی
تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا (۲)

(اور) جب کافروں سے تمہاری مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مار دو، یہاں تک کہ ان کو اچھی طرح کچل ڈالو اور خوب مضبوطی سے گرفتار کر لو (پھر تمہیں اختیار ہے) کہ چاہے احسان رکھ کر چھوڑ دو اور چاہے فدیہ لے کر، یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔

کفر کے خلاف جنگ کی شدت اس آیت میں کتنی نمایاں ہے، کفر جب بھی حق کے مقابل آئے تو اس کی طاقت کو کچل دینا ضروری ہے تا کہ اور جنگوں کی گنجائش نہ رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک کے بارے میں مسلمانوں کو پابند بنا دیا گیا کہ انہیں احسان رکھ کر یا زیادہ سے زیادہ معاوضہ لے کر رہا کر دیا جائے۔ غزوات کے سلسلے میں ہماری گفتگو سے یہ نکتہ اُبھر کر سامنے آئے گا۔ ان شاءاللہ

ان بنیادی اور اصولی باتوں کے بعد ہم غزوات کے سلسلے پر نظر ڈالیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ جنگ کو اسلام نے کس طرح اخلاقی اور انسانی ہمدردی سے جوڑ دیا ہے۔ اسلامی غزوات اور جنگیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ

ہمارے دامنِ شمشیر سے مرہم نکلتا ہے
جہاں ہم آگ رکھ دیں چشمۂ زمزم اُبلتا ہے

۲۔ محمد: ۴

غزواُت۔ امن کا راستہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے مدینۂ منورہ (یثرب) ہجرت کے بعد کس طرح یہودیوں سے معاہدہ کیا مدینہ منورہ اور اس کے نواح میں یہودیوں کی بستیاں تھیں۔ میثاق کے باوجود یہود عہد شکنی میں مصروف رہے اور ان کی اسلام دشمنی نے سازشوں کا ایک جال بچھانے میں مصروف کر دیا اور قریش مکہ سے ان کے مسلسل رابطوں کا مقصد مدینہ منورہ سے مسلمانوں کا اخراج تھا۔ دوسری طرف قریش مکہ مسلمانوں کو طواف و زیارتِ کعبہ کی ''اجازت'' دینے کے لئے تیار نہ تھے، حالانکہ انہیں حرم کا راستہ کسی پر روکنے کا حق نہیں تھا۔ عہد جاہلیت میں بھی کعبہ کا اس درجہ احترام تھا کہ حرام مہینوں میں امن و امان قائم رکھا جاتا۔

ہجرت کے ابتدائی زمانے میں مدینۂ منورہ پر قریش کے حملے کے امکانات اتنے قوی تھے کہ رسول اللہ ﷺ خود راتوں کو مدینے کی حفاظت کے لئے جایا کرتے تھے اور صحابہ کی ٹولیاں شاہراہوں کا حفاظتی گشت لگایا کرتی تھیں۔ فراستِ نبوی نے وحی الٰہی کی روشنی میں قریش کی تجارتی شاہراہ پر چھوٹے چھوٹے دستے بھیجنے شروع کر دیئے۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مکہ معظمہ کے قریش لوٹ مار کے چھاپہ مار دستے مدینہ منورہ اور اس کے مضافات میں بھیج رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کی قوت اور چوکسی کا امتحان لینے کی ایک صورت تھی اور کسی جنگ کے لئے بہانہ تلاش کرنے کی کوشش تھی۔ قریش کا ایسا ہی ایک چھاپہ مار دستہ مدینہ کے قریب ایک چراگاہ پر حملہ آور ہوا اور رسول اللہ ﷺ کے مویشی پکڑ کر لے گیا۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جوابی کارروائیوں نے قریش کو احساس دلایا کہ اب ہوا کا رخ بدل چکا ہے اور اب

مسلمان ان کی تجارتی شہ رگ کو کاٹنے کی قوت رکھتے ہیں۔

ان حالات میں قریش نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کی طاقت کے اور بڑھنے سے پہلے ایک فیصلہ کن جنگ لڑی جائے، اس لئے انہوں نے ایک منتخب اور آزمودہ لشکر تیار کر کے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کو ان کے رب نے کفار کے ارادوں اور ان کی عسکری تیاریوں سے باخبر کیا۔ یہ سب تفاصیل آپ اس سلسلے کی پہلی کتاب ''حیاتِ محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں'' میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ان سب تفاصیل سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم غزوۂ بدر کے اخلاقی پہلو اور مسلمانوں کی تربیت پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں گے۔ غزوۂ بدر سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنے اصحاب کو شوریٰ بینھم کی تربیت دی۔ حضور ﷺ مسلم معاشرے کے دونوں عناصرِ ترکیبی کی رائے کو برابر کی اہمیت دیتے ہیں۔ اس سے یہ اصول ہمارے سامنے آتا ہے کہ مشورے میں معاشرے کے ہر طبقے اور ذیلی گروہ کو اہمیت دی جائے یوں ہی معاشرے میں استحکام پیدا ہو سکتا ہے۔ مہاجرین نے کہا کہ ''ہم ہر صورت میں آپ کے ساتھ ہیں'' اور انصار کی ترجمانی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذؓ نے کہا کہ ''ہم آپ کے ساتھ سمندر میں کودنے کے لئے بھی تیار ہیں''۔

غزوۂ بدر سے یہ نکتہ بھی سامنے آتا ہے کہ موقف کی صداقت ہی اصل قوت ہے اور اس قوت کی اساس اپنے رب پر کامل اعتماد اور یقین ہے۔ بیسویں صدی کے عظیم مؤرخ ٹوئین بی کے خیال کے مطابق رسول اللہ ﷺ اور اسلام کا ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ موت کا کانٹا قلبِ انسانی سے نکال دیا۔ سرورِ کائنات کے نظامِ اخلاق کے بنیادی نکات میں سے ایک نکتہ حیات بعد الممات کا عقیدہ ہے۔ اسی عقیدے نے شہادت کو مقصود و مطلوبِ مومن بنا دیا ہے اور بزدلی جیسے اخلاقی عیب کو مسلمان کی زندگی سے نکال دیا ہے اور غزواتِ نبوی اس کی شہادت ہیں۔

بدر میں رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے ایسی جگہ پڑاؤ ڈالا کہ پانی کے کنوئیں ان کے قبضے میں تھے۔ کفار کے لئے پینے کے پانی کا حصول بھی مشکل تھا۔ قریش مکہ کے کچھ لوگ نبی اکرم ﷺ کے اس حوض پر آئے جہاں کنوئیں کا پانی ذخیرہ کیا گیا تھا۔ صحابہ کرام نے قریش کو پانی پینے سے روکنا چاہا مگر اخلاقِ انسانی کے معلم اعظم ﷺ نے

فرمایا کہ ان پر پانی نہ روکو اور پینے دو۔ یہ حکم، جنگ کی اخلاقیات کا ایک عظیم درس ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے حوض سے پانی پیا وہ سب کے سب حکیم بن حزامؓ کے سوا غزوۂ بدر میں مارے گئے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ بعد میں دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے۔ انہیں جب کبھی قسم کھانے کی ضرورت پڑتی تو یوں قسم کھاتے ''اس رب کی قسم! جس نے مجھے غزوۂ بدر میں قتل ہونے سے بچایا''۔

غزوۂ بدر میں قریش کے ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی گرفتار ہوئے۔ یہ سب اسیرانِ جنگ مدینہ لائے گئے، مدینۂ منورہ میں کوئی قید خانہ نہیں تھا اور نہ قیدیوں کے رکھے جانے کا کوئی انتظام تھا۔ ان قیدیوں کو صحابۂ کرام کے درمیان تقسیم کر دیا گیا کہ وہ ان کی میزبانی اُس وقت تک کریں جب تک ان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو جاتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں کے بارے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے مشاورت کی۔ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیل، ہم مزاج اور مزاج شناس حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ یہ آپ ﷺ کے قرابت دار ہیں، انہیں معاف فرما دیجئے، شاید آپ کا سلوک ان کے دلوں کو اسلام کی طرف پھیر دے۔ اللہ کی شمشیر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کا مشورہ تھا کہ لکڑی جمع کر کے آگ بھڑکائی جائے اور کفر زادوں کو نذرِ آتش کر دیا جائے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرمایا۔ اس معاملہ میں وحی الٰہی نازل ہوئی:

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ (۱)

نبی کے لئے سزاوار نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں جب تک کہ ملک میں اچھی طرح جنگ نہ ہو جائے (اور ملک غلبہ حاصل نہ کر لے)،

۱۔ الانفال: ۶۷، ۶۸

(مسلمانو!) تم تو دنیا کا مال ومتاع چاہتے ہو اور اللہ تمہیں آخرت کا اجر عطا کرنا چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر (اس بارے میں) پہلے سے اللہ کا حکم نہ ہو گیا ہوتا تو تم نے جو (غزوہ بدر میں) مالِ غنیمت حاصل کیا ہے تو اس کے بارے میں ضرور تمہیں بڑا عذاب ہوتا۔

یوں وحی الٰہی نے یہ نکتہ واضح کر دیا کہ مالِ غنیمت سے اہم تر یہ بات ہے کہ جنگ کو فیصلہ کن بنایا جائے اور کفر کی وہ قوت توڑ دی جائے جو جنگ کا سبب بنتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور مسلمانوں کے فیصلے کو کتاب من اللہ قرار دے کر انہیں اپنے عفو کا مستحق بنا دیا اور غنیمت کو ان کے لئے حلال وطیب قرار دیا:

فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۲)

بہر حال جو مالِ غنیمت تمہیں حاصل ہوا ہے اُسے حلال وطیب سمجھ کر اپنے کام میں لاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ غفور ورحیم ہے۔

رسول اللہ ﷺ مکارم اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے مبعوث نہیں فرمائے گئے تھے بلکہ آپ مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے تشریف لائے تھے۔ آپ نے ہر اخلاقی وصف کو بدرجہ کمال عملی طور پر پیش کیا، فدیہ کے سلسلے میں بھی آپ نے قیدیوں کے حالات کو پیش نظر رکھا۔ فدیہ کی کوئی رقم قیدیوں پر جابرانہ طور پر نہیں تھوپی گئی بلکہ ان کے مالی حالات کے مطابق اس کا تعین کیا گیا۔ اگر کسی سے تین چار ہزار درہم لئے گئے تو کسی سے صرف ایک ہزار درہم، اور وہ قیدی جو کچھ ادا نہیں کر سکتے تھے ان کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا، مقرر کیا گیا۔ اور جن کے پاس نہ تو درہم تھے اور نہ تعلیم ان کو احسان کرتے ہوئے رہا کر دیا گیا۔ ابو عزہ کی لڑکیوں کے مفلس باپ کو کسی فدیے کے بغیر اس شرط پر رہا کیا گیا کہ وہ آئندہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف کسی کا ساتھ نہیں دے گا۔ اس نے اس شرط کی خلاف ورزی کی اور کسی معرکے میں پھر گرفتار ہوا تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت زبیرؓ نے اس کی گردن تن سے جدا کر دی۔

۲۔ الانفال: ۶۹

ان قیدیوں میں نبیِ اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس، اور آپ کے داماد، حضرت زینب کے شوہر ابو العاص بن ربیع بھی شامل تھے۔ حضرت عباس کی مشکیں بہت مضبوط باندھی گئی تھیں جس سے وہ سخت اذیت میں تھے اور ان کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ ان کی کراہ سن کر رحمت عالم بے تاب ہو گئے، آپ ﷺ کی بے تابی دیکھ کر انصار نے رسی کی گرہیں نرم کر دیں اور رسولِ رحمت ﷺ سے کہا کہ ہم ان کا فدیہ معاف کرتے ہیں۔ چچا کی محبت کے باوجود رسولِ عادل اس بات پر رضامند نہ ہوئے اور کہا کہ ان کے فدیے سے ایک درہم بھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ رحم اور عدل کا ایسا امتزاج رسول اللہ ﷺ کے سوا کس کے کردار میں مل سکتا ہے اور اس درجہ۔ خاندانِ رسالت کے اسیروں اور دوسرے قیدیوں میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔

نبی اکرم ﷺ کے عدل اور انصاف کے سلسلے میں کسی رشتے کی پرواہ نہ کرنے کا آپ کی شفقت اور نرم جذبات سے عجب ربط تھا، انسانوں کی محبت اور ان کا احترام آپ کے وجود میں اسی طرح رچا بسا تھا:

شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نام

ابو العاص کے فدیے کے طور پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے وہ ہار بھیجا جو ان کی والدہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی یادگار تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر محمد رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں ماضی کی کتنی ہی وہ یادیں زندہ ہو گئیں جن کا تعلق پہلی مومنہ اور اس رفیقہ نبوت سے تھا جس سے کم وبیش ۲۷ سال تک کاشانۂ مصطفوی روشن رہا۔ آپ نے مسلمانوں سے اس ہار کو واپس بھیجنے کی درخواست کی۔ رسول اللہ ﷺ کا ہر لفظ مسلمانوں کے لئے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ ایسا حکم جس سے ان کی دنیا اور آخرت کے سنورنے کا رشتہ تھا، لیکن آپ نے مشورت کے دامن کو اس درجہ پھیلا کر ہر دور کے مسلمان حاکموں اور سربراہانِ مملکت کے لئے روشن نظیر قائم فرما دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابو العاص کو یوں ہی رہائی نہیں دی گئی۔ بلکہ ایک شرط عائد کی گئی اور وہ یہ تھی کہ وہ مکۂ معظمہ واپسی کے بعد حضرت زینب کو مدینۂ منورہ آنے کی اجازت دیں گے۔ ابو العاص کو اپنی شریک حیات سے گہری محبت تھی اور انہوں نے اس رشتے کو بڑی محبت اور شرافت کے ساتھ نبھایا تھا، انہوں نے یہ شرط منظور کر لی۔ ابو العاص جب مکہ معظمہ کے لئے

روانہ ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے پیچھے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ایک دوسرے انصاری کو بھیجا۔ ابو العاص نے حضرت زینبؓ کو مکے کے باہر ایک مقررشدہ جگہ پر پہنچا دیا اور حضرت زینب اپنے والدِ ماجد کی خدمت میں پہنچ گئیں۔

فدیے میں مالِ دنیا کے ساتھ ساتھ بچوں کی تعلیم کو شامل کرنا اس رسول کی فراست سے ہی ممکن تھا، جس تک آنے والی پہلی وحی اقرا باسم ربک الذی خلق تھی۔ اس سے یہ نکتہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ جنگ کی غیر معمولی صورتِ حال میں بھی مسلم معاشرے کی تشکیل اور صحیح خطوط پر اسے استوار کرنے کا کام جاری رہا۔ یہ ہمہ گیریت کارنامۂ نبوت ہے۔ دنیا کے مفکر، مصلح اور رہنما کسی ایک یا چند باتوں کو اساسی اہمیت دیتے ہیں اور معاشرے کی تشکیل کی ہر جہت ان کی نظر میں نہیں ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ کی ربانی بصیرت ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھی۔ ان کے رب نے تو انہیں دنیا کو اپنے اسوہ اور اخلاق سے ان خطوط پر متشکل کرنے کے لئے بھیجا تھا جو تا قیامِ قیامت انسانیت کی رہنمائی کر سکیں۔

جیسا کہ سطورِ گزشتہ میں تحریر کیا گیا کہ ان قیدیوں کو مسلمانوں کے گھروں میں رکھا گیا، ان کی حیثیت جنگی قیدیوں کی بجائے مہمان کی سی تھی۔ اس وقت مدینۂ منورہ کے معاشرے میں عام مسلمانوں کو معاشی فارغ البالی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ان کے گھروں میں چولہا نہیں جلتا تھا۔ کھجوروں پر عموماً گزر بسر ہوتی اور یہ کھجور بھی بافراط نصیب نہیں ہوتے تھے۔ اصحابِ صفہ کے احوال میں ہمیں ان کے فقر و فاقہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ یہ حضرات جب کسی کھانے کی جستجو میں نبی اکرم ﷺ یا حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ جیسے ساتھیوں سے رجوع کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کی حالت بھی اصحابِ صفہ سے مختلف نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ان جلیل القدر انسانوں نے اپنے آپ کے لئے فاقے کو اختیار کیا اور اپنے مہمانوں کے لئے حتی الامکان اچھے سے اچھے کھانے کا بندوبست کیا۔ یہ ایثار اور حسنِ سلوک دیکھ کر ان قیدیوں کے دلوں میں اسلام کے لئے گنجائش پیدا ہوئی، انہیں اسلام کی دولت حاصل ہوئی اور مکہ معظمہ واپسی کے بعد وہ مسلمانوں کا اچھے الفاظ میں ذکر کرتے۔ (۳)

۳۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۰۸

غزوۂ بنو قینقاع

بنو قینقاع یہودِ مدینہ کا ایک قبیلہ تھا، مدینہ کے گرد و نواح میں یہود کی تین بستیوں میں سے ایک بستی۔ یہ اپنی بہادری پر بڑے نازاں تھے۔ ان یہودیوں نے کبھی مسلمانوں کے ساتھ اپنے میثاق کی پاس داری نہیں کی۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان پر اسلام کو پیش کیا اور میدانِ بدر میں قریش کے انجام سے سبق حاصل کرتے ہوئے انہیں اللہ سے ڈرنے کا پیغام دیا تو ان لوگوں نے بڑی رعونت سے جواب دیا کہ ہم قریش نہیں۔ ہم جنگجو ہیں اور میدانِ جنگ میں اپنی تلواروں سے اپنی تقدیر لکھنا جانتے ہیں۔

ایسی گفتگو تک بات محدود نہیں رہی بلکہ یہ ایسی شرارتیں کرتے رہے جن سے مدینے کی فضا مکدر ہو جاتی اور امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ یہ مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست کے اختیار کے لئے ایک چیلنج تھا۔ ایک دن ایک مسلمان عورت بنو قینقاع کے ایک یہودی سنار کی دکان پر آئی اور اس نے شرارت سے اُسے بڑی حد تک بے لباس کر دیا۔ اس خاتون نے شور مچایا، اس پر سنار بے حیائی کے ساتھ ہنسنے لگا۔ ایک مسلمان جو اس علاقے سے گزر رہا تھا اس بات پر برداشت نہ کر سکا اور اس نے یہودی سنار کو قتل کر دیا، اس پر یہودیوں نے یلغار کر کے مسلمان کو شہید کر دیا۔ یہ ایک بڑے فتنے کا نقطہ آغاز تھا اور بعد کے واقعات نے یہودی فساد کے دائرے کو بڑھا دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس فتنے کو کچلنے کے لئے بنو قینقاع کا محاصرہ کر دیا، یہ محاصرہ وسطِ شوال سے ذی القعدہ کے آغاز تک جاری رہا۔ آخر یہودی مجبور ہو کر آپ ﷺ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ آئے کہ ان کی دولت اور مال و متاع کا

ایک حصہ آپ لے لیں اور ان کی اور ان کی بال بچوں کی جان بخشی کی جائے۔ نبیِ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کو سلامتی کے ساتھ جلاوطنی کا حکم دیا۔ جلاوطنی کے تمام مراحل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی نگرانی میں طے ہوئے اور بنی قینقاع کے یہود شام کی طرف کوچ کر گئے۔ اللہ کی حکمت بالغہ یہودیوں کی میثاق شکنی کے نتیجے میں مدینے اور اس کے گرد ونواح کو یہودیوں سے پاک کر رہی تھی اور ان کے فتنہ وفساد کے نتیجے میں یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے، اور انسانی زندگی کی حرمت اسلام میں ایک بنیادی قدر کا درجہ رکھتی ہے۔ غزوۂ بنو قینقاع کا ایک ذیلی نفع یہ تھا کہ اہلِ ایمان کا ایمان روشن تر اور مستحکم تر ہو گیا اور منافقین کا نفاق اور زیادہ ابھر کر سامنے آ گیا۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بنو قینقاع کے حلیف تھے، اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں وہ یہودیوں کی دوستی سے بیزار ہو گئے، اور انہوں نے اعلانِ برأت کر دیا، دوسری طرف اس واقعہ نے عبداللہ بن اُبی کی منافقت کو اسلامی معاشرے کے سامنے اور بھی نمایاں کر دیا۔ (۱) اس اور اس جیسے دوسرے واقعات کے ذریعہ صحابۂ کرام کی اخلاقی صفات معاشرے کے مزاج کا حصہ بنتی چلی گئیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرآنی احکام نے اسلام لانے والوں (مسلم) کو مومن بنایا اور یوں ایمان ان کے قلوب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت اور تربیت اور آپ کے اسوۂ حسنہ نے ان مومنوں کو محسنین کے درجے تک پہنچا دیا۔ محسن وہ ہے جو معاشرے کو توازن کے حسن سے جگمگا دے، جو دوسروں کی کمیوں کو پورا کر دے۔ احسان، عدل کے بعد کی منزل ہے اور احسان اُسی معاشرے میں نظر آ سکتا ہے جس میں عدل عام ہو اور قانوں کی سطح سے بلند تر ہو کر عام لوگوں کے مزاج میں رچ بس جائے۔

بنو قینقاع کی جلاوطنی کے پس منظر میں سورۃ المائدہ کی ان آیات کو سمجھا جا سکتا ہے جن میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کے طرزِ عمل کو متعین کیا گیا ہے۔ کفر سے دوستی رکھنے والوں کا شمار انہیں میں ہوگا، کیونکہ اس طرزِ عمل سے ان کے دلوں کی بیماری سامنے آ جاتی ہے۔ ان آیات میں آنے والے زمانے کے بارے میں بھی پیشین گوئی کی گئی ہے جب مرتدین کے

۱۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۳۷

خلاف اللہ سے محبت رکھنے والوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قیادت میں جہاد کیا اور مسلمانوں کو ایک مضبوط تر جماعت کے طور پر اپنی شیرازہ بندی کا موقع ملا۔ ان آیات میں یہود اور نصاریٰ کی اسلام دشمنی کے بنیادی سبب کو بھی پیش کر دیا۔ قرآن حکیم کی ان آیات میں مسلمانوں کے اخلاق کے بیان میں یہ اخلاقی وصف ہمارے سامنے آتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ سے محبت رکھتے ہیں، اہلِ ایمان کے لئے حریر و پرنیاں کی طرح نرم اور کفر کے لئے شدید ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، یہ اللہ اور رسول کی محبت اور ان کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے کسی کی ملامت اور طنز و تشنیع کی پرواہ نہیں رکھتے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ؔ م
بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ O فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ
فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَاۤ
اَسَرُّوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ O وَ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَهٰۤؤُلَآءِ
الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ؕ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ O يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ
مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ ۙ
اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ؗ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ
ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ O اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ هُمْ رٰكِعُوْنَ O
وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ
الْغٰلِبُوْنَ O يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ
هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ

اَوْلِیَآءَ ج وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O (۲)

اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں (ان کے مقاصد یکساں ہیں) تم میں سے جو بھی انہیں اپنا رفیق بنائے گا انہیں میں سے سمجھا جائے گا۔ اللہ ظالموں کو کبھی ہدایت نہیں دیتا۔ اے رسول آپ دیکھیں گے کہ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے انہیں کی طرف دوڑ رہے ہیں (اور انہیں میں گھس رہے ہیں) اور کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہمیں کوئی حادثہ نہ پیش آجائے (یعنی مسلمانوں کو شکست ہو اور ہم بھی ان کے ساتھ دینے کی وجہ سے افتاد میں پڑ جائیں) یا ممکن ہے کہ اللہ انہیں فتح دے دے، یا اس کی طرف سے غلبے کی کوئی اور صورت ظاہر ہو جائے اور اس وقت وہ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو انہوں نے چھپا رکھی ہے۔ اور اس وقت ایمان والے کہیں گے کہ کیا یہی لوگ ہیں کہ اللہ کی سخت سے سخت قسم کھا کر کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ان کے اعمال اکارت گئے اور یہ خاسروں اور نامرادوں میں ہو گئے۔ اے ایمان والو! جو تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو (میدان میں) لائے گا جو اللہ کو محبوب ہوگی، اور جو اللہ سے محبت رکھتی ہوگی، یہ لوگ مسلمانوں کے لئے نرم دل ہوں گے اور کافروں کے لئے شدید ہوں گے، اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جسے چاہے عطا کر دے اور اللہ بڑا صاحبِ وسعت ہے اور اس کا علم بہت وسیع ہے۔ اللہ اور اس کا رسول مسلمانوں کے دوست اور ولی ہیں اور وہ ایمان والے بھی ان کے دوست اور مددگار ہیں جو اقامتِ صلوٰۃ پر قائم

۲۔ المائدہ: ۵۱ تا ۵۶

ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور مسلمانوں سے دوستی رکھے وہی لوگ اللہ کی جماعت (حزب اللہ) ہیں اور وہی غالب آکر رہیں گے۔ اے ایمان والو! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جو تمہارے دین کو ہنسی کھیل اور باعثِ تمسخر سمجھتے ہیں خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا کافر۔ اگر تم مومن ہو تو اللہ سے ڈرتے رہو اور اس کا تقویٰ اختیار کرو۔

یہ آیات بہت روشن ہیں، اہلِ ایمان کی صفات کے باب میں اور کفر و ایمان کی جنگ میں فریقین کے طرزِ عمل کے بارے میں۔ مسلمان اسباب و وسائل میں بھی کم تھے اور انہیں عددی غلبہ اور کثرت بھی حاصل نہیں تھی، لیکن رب العزت اور غلبہ و نصرت کے مالک نے انہیں کفر کی طاقت کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ نسخہ عطا کر دیا جس نے انہیں وہ طاقت عطا کر دی کہ کفر کی موجیں ان سے ٹکرا کر پسپا ہو گئیں اور وہ نسخہ تھا تقویٰ۔ تقویٰ ہی جہادِ زندگی میں مسلمان کی وہ شمشیر ہے جو فتح کی نوید ہے۔

غزوۂ اُحد، اس کے سبق

غزوۂ بدر کے ایک سال کے بعد غزوۂ اُحد برپا ہوا جس کے دامن میں ہمارے لئے کئی اخلاقی سبق ہیں۔ زندگی کا کوئی معاملہ ہو، کوئی معرکہ ہو، کوئی واقعہ ہو اس کا اخلاقی پہلو ہمارے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ زندگی کا ہر پہلو ہمارے اخلاق کے کسی نہ کسی گوشے کو ابھار کر سامنے لاتا ہے اور ہر پہلو میں رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

غزوۂ اُحد کا سب سے اہم اخلاقی، دینی اور اجتماعی پیغام اطاعتِ رسول ﷺ کی اہمیت ہے۔ اسلام اللہ جل جلالہ اور اس کے احکام کی اطاعت کا نام ہے اور ان احکام کی اطاعت قرآنِ حکیم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی کا دوسرا نام ہے۔ اللہ کی محبت سرورِ کائنات ﷺ کی اتباع کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ رسولِ برحق کی پیروی اور آپ کے احکام کے آگے سر جھکانے کا نام اسلام ہے۔ اطاعت کا مادہ ط و ع ہے، اس میں کسی کام کے برضا و رغبت، کسی جبر کے بغیر اور دل و نظر کی کشادگی کے ساتھ انجام دینے کا مفہوم موجود ہے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہم حکم دینے والے کے ساتھ وابستہ ہوں۔ اللہ ہمیں اس عالمِ امکان میں نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی کتاب اور اپنے رسول کے اسوۂ حسنہ کے آئینے میں اپنی جلوہ گری کرتا ہے، اسی لئے رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ دونوں کی اطاعت کا ذکر قرآن مجید میں ہمیں ایک ساتھ نظر آتا ہے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت مسلمان کو انبیاء، صدیقین، شہدا اور صالحین کی رفاقت کی دولت عطا کرتی ہے اور اس سے بہتر رفاقت اور کون سی ہو سکتی ہے۔ اس رفاقت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس دنیا سے لے کر اگلی دنیا تک۔

ہر فلاح اور کامیابی اس اطاعت سے وابستہ ہے، حُبِ رسول کے خالی خولی اور کھوکھلے نعروں کا کوئی اعتبار نہیں۔ اگر اعتبار حاصل ہے تو ان کی سنت کی پیروی اور ان کی اطاعت کو۔ سلام ان ﷺ پر اور ان کی اطاعت کرنے والوں پر، صلی اللہ علیہ وسلم۔

غزوۂ اُحد میں نبیٔ اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں اخلاق کے کیا سبق ملتے ہیں اس کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب ہو گا کہ ہم پہلے اطاعتِ رسول ﷺ کی اہمیت، نوعیت اور اس کی وسعت کا جائزہ قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں لیں۔

سورۃ النساء احکام کے بیان کے اعتبار سے سورۃ البقرہ کے بعد قرآن مجید کی نہایت مفصل اور محکم سورت ہے اس میں اطاعتِ رسول کے گوشوں کو طرح طرح سے رب العزت نے بیان فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے وصیت اور میراث کی تقسیم کے بارے میں ورثا کے حصوں کے تعین کے بعد فرمایا:

> تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ ؕ وَ مَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْہَا ؕ وَذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ (۱)
>
> یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا اللہ اسے ان جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

اس آیت مبارکہ سے معلوم ہوا کہ سب سے اہم اطاعت حدودِ شرعیہ کی ہے، ضمناً یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بعض حدود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعے عطا کی ہیں اور ان کا ذکر قرآنِ مجید میں نہیں ہے بلکہ وہ آپ کی سنت سے قائم اور ابدی حیثیت رکھتی ہیں، جیسے زانی مرد و عورت کے لئے رجم کی سزا۔ پھر یہ بات بھی سامنے آئی کہ جنت کا حصول ان حدود کی پاسداری اور پاسبانی سے وابستہ ہے، جنت اس دنیا کی کھیتی ہے۔

۱۔ النساء: ۱۳

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اسلامی قانون کی بنیادی شق ہے جس کا سلسلہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے جاملتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا O (۲)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں (ارباب حکومت) پھر اگر کسی بات میں اختلاف پیدا ہو تو اُسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو یہ (تمہارے لئے) بہت بہتر ہے اور اعتبار کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔

اس آیت مبارکہ سے اسلامی قانون اور آئین کو تسلسل عطا ہوتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۳) حکم تو صرف اللہ کا ہے لیکن اللہ کا حکم محمد ﷺ اس دنیا میں نافذ کرنے کے لئے تشریف لائے تھے اور اس طرح کہ حکم اخلاق بن جائے۔ یہی وہ صورت ہے کہ حکم مسلط نہیں کیا جاتا بلکہ اخلاق اور کردار بن کر روح کی گہرائیوں میں پھول کی طرح اگتا ہے، اور پھر خارجی ماحول اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا ہے۔ یہ بات بھی اہل ایمان پر روشن ہوگی کہ آخری حکم، سند اور اختیار اللہ اور رسول کا ہے اور مسلم حکمرانوں اور ان کی رعایا میں اسی "اتھارٹی" کی بنیاد پر نہ ٹوٹنے والی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے اور یوں ہی ایک ہمہ گیر اجتماعی اخلاق معاشرے کو امن و سکون کا گہوارہ بنا سکتا ہے، جب بھی مسلمان نے رسول کی اطاعت سے منہ موڑا جیسے غزوۂ احد میں، انہیں پسپائی نصیب ہوئی کہ رسول کے حکم سے سرتابی، رب العزت سے انحراف اور بغاوت ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَ مَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

۲۔ النساء: ۵۹

۳۔ یوسف: ۴۰

عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا O (۴)

جو رسول (ﷺ) کی اطاعت کرے (کرتا ہے) اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے روگردانی کی تو (اے رسول) ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔

اس آیت کو مدینۂ منورہ کے معاشرتی حالات کے پس منظر سے سمجھا جا سکتا ہے، جب یہودی سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اطاعت کا دم بھرتے تھے اور آپ کی محفل سے اٹھ کر ان کا دوسرا چہرہ طغیان اور تاریکی سے فضا کو آلودہ کرتا تھا اور ان کی راتیں حضور نبی کریم ﷺ، مسلمانوں اور اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو کر اندھیروں کو اور بڑھا دیتیں۔ ان کے نفوس کی ظلمت رات کو سیاہ تر بنا دیتی۔ اس آیت (۵) کے بعد اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان کی پرواہ نہ کریں

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا O (۶)

ان سے منہ پھیر لیجئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے کہ وہ ہی آپ کا وکیل اور کارساز ہے۔

غزوۂ احد اپنے نتائج اور ثمرات کی بنا پر غزوۂ بدر کی سی اہمیت رکھتا ہے اور اسی لئے جس طرح قرآن مجید میں سورۃ الانفال میں بدر کا احوال پیش کیا گیا ہے اسی طرح سورہ آل عمران میں غزوۂ احد کے نتائج، اس کے اخلاقی اثرات اور مسلم معاشرے پر اس کے مرتب ہونے والے نتائج کی روداد اپنے دامن میں رکھتا ہے۔

اگرچہ یہود سے معاہدہ تھا کہ مدینے پر حملے کی صورت میں وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مل کر شہر کا دفاع کریں گے لیکن غزوۂ احد کے موقع پر جب صحابہ کرام نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم اپنے حلیف یہودیوں کو بھی شریک جنگ کریں گے تو آپ

۴۔ النساء: ۸۰

۵۔ النساء: ۷۹

۶۔ النساء: ۸۱

ﷺ نے اپنی نبوی فراست کی بنا پر اس بات کو قبول نہیں کیا۔ دو دِلے رفیق زندگی کے ہر میدان میں نقصان دہ ہوتے ہیں اور میدانِ جنگ میں تو ان پر بالکل اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس سے اہم تر نکتہ یہ ہے کہ غزوۂ احد صرف شہر مدینہ کی حفاظت کے لئے نہیں تھا بلکہ اسلام کے تحفظ کے لئے تھا اس لئے نبی اکرم ﷺ اسلام کے دشمنوں کا احسان کیسے قبول کر سکتے تھے۔

اس معرکے سے مسلمانوں میں تنظیم کی کمی اور اپنے عقائد میں قدرے ناپختگی ابھر کر سامنے آ گئی۔ اس معرکے میں اسلامی لشکر میں سات سو افراد تھے اور دشمن کی فوج میں تین ہزار آزمودہ کار اور سر سے پیر تک لوہے میں غرق جنگجو سپاہی تھے، بدر کی فتح پر ابھی ایک سال ہی گزرا تھا لیکن مسلمانوں کے دو قبیلوں کے دل دشمن کی تعداد کو دیکھ کر لرزاں تھے۔ کارزار کی صبح حضور ﷺ نے اسلامی فوج کو ترتیب دیتے ہوئے پچاس تیر اندازوں کو ایک درّے پر متعین فرمایا جو انتہائی جنگی اہمیت کا حامل تھا اور آپ ﷺ نے ان سے فرما دیا کہ کسی حالت میں یہاں سے نہ ہٹنا چاہے تم دیکھو کہ پرندے مسلمانوں کو اچکے لئے جا رہے ہیں۔ یہ اظہار محاورۂ عرب کے مطابق انتہائی سنگین حالات کی عکاسی کر رہا تھا، لیکن جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور مسلمانوں کو فتح ہونے لگی تو تیر اندازوں کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیل رضی اللہ عنہ اور ایک دو ساتھیوں کے علاوہ سب نے بھاگتے ہوئے دشمن کے مال غنیمت کو حاصل کرنے کے لئے درہ چھوڑ دیا۔ یہ عمل اولاً تو حکم رسول ﷺ کے خلاف تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مال و دولت، دنیا فتح سے عزیز تر تھی۔ اور اس میں یہ گمان بھی شامل تھا کہ خدانہ کرے بہ صورت دیگر انہیں مالِ غنیمت سے حصہ نہ ملے، یہ رسول امین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک انداز کی بے اعتمادی کا اظہار تھا۔ وہ رسول اللہ ﷺ جسے ہر مسلمان کا حق عزیز تھا جس کے عمل سے کسی کے لئے ادنیٰ ترین انصاف کی کمی کا اظہار نہ ہوا تھا اور جو مالِ غنیمت میں ملنے والے جوتے کے ایک فیتے کو شمار میں رکھتا تھا اور رنگین دھاگے کی ادنیٰ ترین مقدار کا چھپانا بھی جس کے نزدیک دوزخ کا راستہ تھا۔ اس سے یہ بات سامنے آئی کہ مسلمانوں میں تنظیم کی کمی کے ساتھ ساتھ رسول ﷺ برحق پر یقین اور اعتماد پر لمحاتی کمزوری غالب آ گئی تھی۔

جب مسلمانوں کے قدم میدان سے اکھڑ رہے تھے تو اس وقت ابوسفیان نے آواز

لگائی کیا تم میں محمد (ﷺ) ہیں۔ حضور نے مسلمانوں سے فرمایا جواب نہ دو، پھر ابوسفیان کی آواز گونجی کیا تم میں ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہیں، حضور ﷺ کے اشارے پر مسلمان خاموش رہے، پھر ابوسفیان کی آواز گونجی کیا تم میں عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) ہیں، مسلمان مرضیٔ رسول ﷺ کے مطابق خاموش رہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کے بعد شیخین ہی کفر کے سینے میں تیر کی طرح پیوست تھے۔ اس خاموشی کے بعد ابوسفیان نے نعرہ لگایا اعلی ھبل یعنی برتری ہو ہبل کے لئے۔ تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے کہا نعرہ بلند کرو

اللہ اعلی و اجل

ابوسفیان نے اس کے جواب میں کہا ہمارے لئے عزیٰ ہے اور تم عزیٰ سے محروم ہو۔ سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ نے اس نعرے کے جواب میں یہ نعرہ لگانے کی ہدایت کی

اللہ مولانا و لا مولیٰ لکم

اللہ ہمارا کارساز ہے اور تمہارا کوئی مولا نہیں۔

امہات المومنین کے حجرات ہوں یا مسجد نبوی کے ستون و منبر، مدینے کے باغات میں چہل قدمی ہو یا کوئی محفل یاراں، کوئی سائل آیا ہو یا حضور ﷺ کسی بازار سے گزر رہے ہوں یا اُحد کا وہ سخت دن ہو جب آپ کے دندان مبارک شہید ہوئے اور خود کی کڑیاں آپ کے رخسار مبارک میں گڑ گئیں، کسی عالم اور کسی حال میں آپ صحابۂ کرام کی اخلاقی تربیت سے ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہ ہوئے، آپ ﷺ کے علاوہ اور کون معلم اعظم کہلانے کا مستحق ہے؟ حضور ﷺ اخلاق کی تعلیم دینے کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ اخلاق کریمانہ کی تکمیل کے لئے آئے تھے، حضور ﷺ کا ہر سانس درسِ اخلاق تھا، آپ کی ہر جنبش کتاب اخلاق تھی، آپ کا کلام اور آپ کا سکوت دبستان اخلاق تھا، اخلاق کی اس وسعت کو سمیٹنے کے لئے انسانوں کے بنائے ہوئے پیمانے اور معیار کام نہیں آ سکتے۔ اخلاق محمدی ﷺ کو صرف قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ کی مدد سے سمجھا جا سکتا ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کے معنی، مفاہیم اور امکانات سب کو بدل دیا اور اخلاق کے نئے آفاق آپ کے عمل، آپ کے کلام، آپ کے سکوت سے وجود میں آئے۔

سلام ان پر، درود ان پر، انسانیت تاقیامِ قیامت زندگی کے ہر شعبے کی طرح اخلاقیات کے باب میں رسولِ آخرالزماں ﷺ کے احسانات سے سرنہیں اٹھا سکتی۔

قرآن حکیم نے غزوۂ احد کا تذکرہ محض واقعات، فتح وشکست اور پھر فتح تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں مسلمانوں کے کردار، وقتی خامی اور کمی کے ساتھ ساتھ نفوس کا تجزیہ بھی فرمایا ہے اور اس بات کو بھی واضح کر دیا ہے کہ فتح وظفر کا تعلق بھی اللہ کی اعانت اور نصرت سے ہے اور یہ کہ اہل ایمان کو صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیے:

وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ O (۷)

اور یہ اللہ کا حق ہے کہ مومن اس پر توکل کریں۔

اس اخلاقی سبق اور غزوۂ احد سے یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ صبر اور استقامت جہاد سے اہم تر ہے، سچ تو یہ ہے کہ جہاد صبر اور استقامت کی اعلیٰ ترین شکل ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ O وَ لَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ ص فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ O (۸)

کیا تم نے یہ خیال کر رکھا تھا کہ تم جنت میں یونہی داخل کیے جاؤ گے۔ حالانکہ اللہ نے ابھی ان لوگوں کو جانچا نہیں جنہوں نے تم میں سے جہاد کیا اور اس نے تم میں سے ثابت قدم رہنے والوں کی آزمائش نہیں کی اور تم تو موت سے دوچار ہونے سے پہلے موت کی تمنا کر رہے تھے اور اب تو تم نے موت کو دیکھ لیا۔

یہ اسلوبِ قرآن کس قدر فصیح اور انسانی نفسیات کے مطابق ہے۔ اللہ تو کائنات اور نفسِ انسانی کی ہر کیفیت سے باخبر ہے اور اس کا علم تو ماضی حال اور مستقبل پر محیط ہے، یہاں علم کا مفہوم جانچ ہے اور اس علم کا تعلق انسانی گروہ سے ہے یعنی اہل ایمان دیکھ لیں کہ کس نے

۷۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۱۷۱

۸۔ آل عمران: ۱۴۲، ۱۴۳

جہاد کیا اور کون ثابت قدم رہا۔

جیسے کہ پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ اصل مسئلہ فتح ونصرت کا نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی تربیت کا تھا تاکہ وہ اقوام عالم کی قیادت کے قابل بن سکیں اور یہ ہی ''تحویل قبلہ'' کا مقصود تھا، غزوۂ احد کے ان اخلاقی پہلوؤں کو سید قطب شہید نے اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

غزوۂ احزاب

غزوۂ احد کے بعد مشرکین مکہ اور خیبر کے یہود اور دوسرے مشرک قبائل کے درمیان روابط اور بڑھ گئے، یہودیوں کے نمائندوں نے مکۂ معظمہ جا کر مشرکین قریش کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کے منصوبے تیار کرنے شروع کئے۔ کافروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ انہیں ایک بڑا اتحاد قائم کرنا ہوگا تا کہ اسلام کی بیخ کنی کی جاسکے۔ یہود نے قبیلۂ غطفان کو خیبر کے آدھے محاصل کی پیش کش کی، غطفان والوں نے اپنے حلیف بنو اسد کو اس اتحاد میں شرکت کی دعوت دی۔ یوں مختلف قبائل جمع ہو کر مدینے پر لشکر کشی کے لئے آمادہ ہوئے۔ یہ اتحاد بنیادی طور پر منفی جذبات کی بنیادوں پر قائم ہوا، پھر اتحادیوں کو دنیاوی مال و متاع کا لالچ دیا گیا۔

ان متحدہ افواج کی تشکیل کی خبر نبی اکرم ﷺ کو ہوئی تو آپ نے اپنے اصحاب کرام سے مشورہ کیا، مشاورت اسلام کے اجتماعی اخلاقی نظام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ مدینۂ منورہ کے شامی رخ پر خندق کھودی جائے۔ جنگ کا یہ طریقہ اہل عرب کے لئے نیا اور اجنبی تھا۔ مدینۂ منورہ میں تین طرف نخلستان اور مکانات تھے جو شہر پناہ کا درجہ رکھتے تھے۔ تین ہزار صحابیوں نے نبی اکرم ﷺ کے زیر قیادت شامی رخ پر خندق کھودنے کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ نے دس دس آدمیوں کے درمیان دس دس گز زمین تقسیم کی، خندق کی گہرائی پندرہ فٹ رکھی گئی اور چوڑائی میں یہ خیال رکھا گیا کہ گھوڑا چھلانگ کر پار نہ کر سکے۔ صحابۂ کرام خندق کھودتے جاتے اور ترانہ الاپتے جاتے۔

نحن الذین بایعوا محمدا

علی الاسلام ما یقینا ابدا

ہم وہ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، اسلام پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

خود نبی اکرم ﷺ اس مشقت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ یہ اخلاق کا عظیم رخ ہے کہ مسلمانوں کا قائد، ان کا رسول، دین و دنیا میں ان کا وسیلہ خندق کی کھودائی میں ان کا شریک ہی نہیں بلکہ شریکِ غالب تھا۔ اس کے رخِ انور پر مٹی جم جاتی مگر اس طرح کہ جیسے چاند پر ہلکے سے بادل کا نقاب پڑ جائے۔

وہ مسلمانوں کی اجتماعی عسرت کا زمانہ تھا۔ وہ یہ شدید مشقت کرتے اور اس عالم میں کہ انہیں پیٹ بھر روٹی نہ ملتی۔ صحابۂ کرام آخر انسان تھے اور پھر ان کا مشفق سرپرست ان کے ساتھ تھا، ایک دن کچھ صحابہ نے اپنا کپڑا اٹھا کر سرورِ دین ﷺ کو اپنا پیٹ دکھایا جس پر پتھر بندھا ہوا تھا، یہ بھوک پر غالب آنے کی ایک تدبیر تھی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا دیا تو جانثار ساتھیوں نے دیکھا کہ شکم مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے، یوں آپ نے قیادت کا اعلیٰ ترین معیار قائم فرمایا۔ محنت بھی دوسروں سے زیادہ اور لینے میں دوسرے سے کم۔ حقوق و فرائض ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ فرض کی ادائی حق حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اللہ کے آخری رسول نے عملی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ ادائے فرض میں دوسرے کے آگے رہو اور حصولِ حق کو دوسروں کو ترجیح دو۔

رسول اللہ ﷺ خندق کھودتے جاتے اور رجز کے کلمات کے ساتھ ساتھ یہ دعائیہ کلمات آپ کی زبان مبارک سے ادا ہوتے جاتے:

اللھم لا خیر الا خیر الآخرۃ

فبارک فی الانصار و المھاجرۃ

اے اللہ! کوئی خیر نہیں، آخرت کے خیر کے علاوہ۔ اے اللہ! انصار و مہاجرین کو برکت عطا فرما۔

یہ خیر خواہی ، یہ عمومی طلب برکت ، راس الاخلاق ہے، اخلاق کا سرمایہ اور اصل ۔ حضور ﷺ کی زندگی کا ہر سانس مسلمانوں اور انسانوں کی خیر خواہی سے عبارت تھا اور آپ نے اس بات کو دین قرار دیا۔

الدین النصیحة (۱)

خندق کی کھدائی کے دوران معتبر روایات کے مطابق دو دو صحابیوں کے درمیان گیارہ گیارہ کھجوریں ''رسد'' کے طور پر تقسیم کی جاتی تھیں ۔ دو آدمیوں کے درمیان طاق عدد ۔ یہ کوئی اتفاق نہ تھا بلکہ ان میں ایثار کا جذبہ پیدا کرنے کی تدبیر تھی ۔ یہ صحابی ایک دوسرے سے کہتے کہ میرے بھائی مجھے زیادہ خواہش نہیں ہے ۔ یہ زائد (گیارہویں) کھجور تم لے لو ۔ قرآنِ حکیم نے ایسی ایثار کو مسلمانوں کی شناخت قرار دیا ہے:

وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۲)

اور وہ (دوسروں کو) اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں ، خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی شدید ہو۔

یوں نبیٔ اکرم ﷺ نے اقتصادیات اور زندگی کے ہر شعبے کو اخلاقیات کی بنیادوں پر استوار کیا۔

نبیٔ اکرم ﷺ اپنے اسوۂ حسنہ کے ذریعے اخلاق کو عقائد اور ایمانیات سے ہم آہنگ فرمادیا ۔ غزوۂ خندق نے ایک بار پھر اس حقیقت کو مسلمانوں کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا کہ استقامت اور پامردی ایمان کی کسوٹی ہے ۔ اُحد کی طرح غزوۂ خندق میں بھی اہلِ ایمان ہلا ہلا دیئے گئے ۔ اگرچہ دو بدو جنگ کی نوبت نہیں آئی بلکہ چوبیس ہزار کے لشکر نے مدینے کا محاصرہ کر رکھا تھا ۔ ان کے گھوڑوں اور راونٹوں کی آوازیں ، اور اسلحۂ جنگ کی جھنکاریں مدینے کی فضاؤں کو مرتعش کر رہی تھیں اور خندق کے پار سے پتھروں اور تیروں کی بارش جاری تھی ۔ ایک جگہ سے جہاں خندق کی چوڑائی کم تھی دو چار سردارانِ کفر کے گھوڑوں

۱ ۔ بخاری: ج ۲۱، ص ۳۰، رقم ۵۶

۲ ۔ الحشر: ۹

نے جست لگا کر خندق کو پار کر لیا، ان میں عمرو بن عبدود بھی تھا، جسے مشرکین ہزار سواروں کے برابر تسلیم کرتے تھے، وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ہاتھوں مارا گیا، خندق کے پار سے پتھروں اور تیروں کی مسلسل بارش کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ غزوۂ خندق کے دوران ایک دن ایسا بھی آیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کی متصل چار نمازیں قضا ہوئیں کیونکہ تیروں اور پتھروں کی مسلسل بارش میں اپنی جگہ سے ہٹنا اور کہیں جماعت یا نماز قائم کرنا ممکن نہیں تھا۔

غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ مدینۂ منورہ کی آبادی کے تمام گروہ واضح طور پر سامنے آگئے ۔ نفاق کے تمام پردے چاک ہو گئے ۔ منافقوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے گھروں کے عدم تحفظ کا عذر تراش کر واپسی کی اجازت چاہی، محاصرے کی شدت اور افواجِ کفر کی تعداد دیکھ کر ان کے دل کی یہ بات زبانوں پر بھی آگئی کہ معاذ اللہ، اللہ اور رسول نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا اور دوسری طرف اہل ایمان کا ایمان آزمائش کی بھٹی میں پگھل کر زر خالص بن گیا اور انہوں نے اس گھڑی کو اپنے ایمان کی جانچ کے لئے اللہ تعالیٰ کا انعام قرار دیا، اور آخر کار اللہ کے لشکر، طوفانِ برق و باراں کی شکل میں آ پہنچے ۔ کافروں کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں، گھوڑوں اور اونٹوں نے اپنی رسیاں تڑالیں اور ان کی آوازوں سے وہ بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا کہ افواجِ کفر کی ہر تنظیم درہم برہم ہوگئی ۔ یہود نے ساتھ چھوڑ دیا، کھانے کی دیگیں اور برتن ، غلے کی بوریاں ادھر ادھر منتشر ہوگئیں اور بیس بائیس دن کے محاصرے کے بعد کفر کے عساکر، منتشر گروہوں کی صورت میں واپسی پر یوں مجبور ہوئے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی تعلق کبھی نہ تھا ۔ (۳) یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ مسلمانوں کی فکر، کردار اور اخلاق کا ایک بنیادی نکتہ یہ حقیقت ہے کہ فتح و نصرت اللہ کی جانب سے ہے، اسی یقین کی بنا پر وہ پامردی اور استقلال کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح میدانِ جنگ میں جم جاتے تھے، سورۂ احزاب، معرکۂ احزاب کی جاودانی تصویر ہے جس کا ہر نقش اور ہر رنگ جاودانی ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ

۳ ۔ ابن ہشام: ج ۳، ص ۲۶۲

الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا O هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا O وَ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا O وَ اِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَ يَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ وَ مَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا O (۴)

اور جب (تمہارے دشمن) تمہارے اوپر سے اور تمہارے نیچے سے تم پر چڑھ دوڑے اور جب تمہاری آنکھیں پتھرا گئیں اور تمہارے کلیجے منہ کو آ گئے اور جب اللہ تعالیٰ کے بارے میں تم طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے اور یوں اہلِ ایمان آزمائے گئے، اور پوری طرح سے ہلا ہلا دیئے گئے تو اس وقت منافق اور وہ جن کے دلوں میں بے یقینی اور نفاق کا روگ تھا کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدے کئے تھے وہ محض دھوکا اور فریب تھے اور انہیں میں سے ایک گروہ نے کہا اے یثرب والو! اب یہاں تمہارا ٹھکانہ نہیں، پس لوٹ چلو۔ اور ان کی ایک جماعت یہ کہہ کر رسول اللہ (ﷺ) سے واپسی کی اجازت مانگنے لگی کہ ہمارے مکان غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ مکان (اور گھر والے) غیر محفوظ نہیں تھے لیکن انہوں نے بھاگنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا۔

اس قرآنی بیان کو ملاحظہ کیجئے، پوری صورتِ حال کس طرح سامنے آ جاتی ہے، منافقوں اور شک میں مبتلا ہونے کے شک اور نفاق کے درجے اور فرق بھی اس بیانئے میں موجود ہیں، جو پکے منافق تھے انہوں نے اللہ اور رسول کے وعدے کو فریب قرار دیا اور اپنے ساتھیوں کو لوٹ چلنے کا مشورہ دیا اور مدینۃ النبی کو یثرب کہہ کر اپنی اس تمنا کا اظہار کیا کہ تاریخ الٹا سفر شروع کر دے، جن کا نفاق ہلکا تھا وہ رسول اللہ ﷺ سے واپسی کی اجازت طلب کرنے لگے۔

۴۔ الاحزاب: ۱۰ تا ۱۳

ان منافقوں کے مخالف اہلِ ایمان کے کردار، شخصیت اور اخلاق کی تصویر ملاحظہ ہو:

وَ لَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ صَدَقَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ ۫ وَ مَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا O (۵)

اور جب اہلِ ایمان نے (کفر کے) لشکروں کو دیکھا تو (پورے یقین کے ساتھ) پکار اٹھے کہ یہ وہی ہیں جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور اس (لشکر کشی) نے ان کے ایمان اور فرماں برداری میں اور اضافہ کر دیا۔

یہ غزوہ ذی قعدہ ۵ ہجری میں پیش آیا جو مسلمانوں کی اخلاقی تربیت اور تشکیل کی تاریخ میں ایک موڑ اور سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔

۵۔ الاحزاب: ۲۲

کفر کی نئی حکمت عملی

مسلمانوں کے اجتماعی اخلاق کے مسلسل عظیم امتحان اور مسلم معاشرے کی سرخ روئی۔

غزوۂ احزاب کے بعد یہ بات مشرک اور کافر قیادت اور سازش کرنے والے منافقوں اور یہود پر واضح ہوگئی کہ اسلام کو تلوار اور عسکری قوت سے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ غزوۂ احزاب کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں سے فرمادیا تھا کہ اب قریش تم پر چڑھائی نہیں کریں گے بلکہ تم ان کے خلاف پیش قدمی کروگے، آپ ﷺ کا فرمان اس حقیقت پر شاہد تھا کہ یہ دین، طرز حیات اور نظام اس مرحلے میں داخل ہوگیا ہے کہ اب مخالف قوتوں کے خلاف اپنا دفاع نہیں کرے گا بلکہ آگے بڑھ کر ان کی پیش قدمی کے امکانات کو ختم کردے گا۔

منافقوں اور یہودیوں نے مدینے کے مسلم معاشرے اور ریاست کو اندرونی طور پر کمزور کرنے اور بالآخر مٹا دینے کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات، اہل بیت اور نمایاں ترین اصحاب کے خلاف افواہوں، کردارکشی اور قبائلی عصبیتوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے نہایت مستحکم منصوبے تیار کئے۔

ایک کے بعد دوسرا حملہ

معاشروں کی اجتماعی قوت کا اندازہ، بحرانوں اور آزمائشوں پر ان کی آبرومندانہ فتح سے ہوتا ہے، غزوۂ احزاب کے بعد غزوۂ بنوقریظہ کے موقع پر حضرت زینب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح نے منافقوں کو رسول اعظم علیہ الصلوٰۃ السلام کی عزت و ناموس پر حملے کرنے کا موقع فراہم کیا۔ مسلم معاشرے اور اس کے میر کارواں اور رسولِ برحق کے خلاف مکۂ معظمہ کے مشرکوں، مدینۂ منورہ کے منافقوں، اور مدینہ منورہ اور خیبر کے یہودیوں کا اتحادِ ثلاثہ اپنی سرگرمیوں میں مسلسل مصروف تھا۔ منافق، مسلمان معاشرے میں دخیل ہو کر افواہ سازی کے ذریعے اسلامی اخلاق کو اپنا ہدف بنا رہے تھے۔

غزوۂ احزاب کے معابعد غزوۂ بنوقریظہ پیش آیا۔

بنوقریظہ کے محاصرے کے دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت زینب کا نکاح فرمان الٰہی کی بجا آوری کے لئے تھا، ورنہ ان حالات میں اس نکاح کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

نکاحِ حضرت زینب رضی اللہ عنہا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے رضائے حضرت باری کا استعارہ تھا، اس وقت اسلام چاروں طرف خطرات میں گھرا ہوا تھا، غزوۂ احد کے دو ماہ کے بعد ہی بنی اسد نے مدینہ منورہ پر حملہ کی تیاریاں کیں۔ مگر ان کی پیش قدمی سے پہلے ہی مسلمانوں نے انہیں جا لیا۔ ادھر منافقوں کی سازشیں اور افواہ سازی کی مہم جاری رہی۔ اس دوران مدنی آیاتِ قرآنیہ میں مسلمانوں کے قوانین نکاح، طلاق، اور وراثت نازل ہو چکے تھے

اور تبنیت (گود لینا، کسی کو بیٹا بیٹی بنانا) کی پرانی مقدس رسم ان قوانین سے ٹکرا رہی تھی۔ (۱) مزید برآں دلوں کے ہر بھید سے باخبر رب جلیل کا منشا یہ تھا کہ حرمتِ زنا کے قانون اور تصور کی تکمیل کے لئے مصنوعی رشتوں کو حقیقی رشتوں سے الگ کر دیا جائے۔ منہ بولی بیٹی یا بیٹا یا منہ بولے بیٹے کی بیوی حقیقی بیٹے یا بہو کا مرتبہ نفسیاتی طور پر حاصل ہی نہیں کر سکتی۔ دوسری طرف اس جھوٹے رشتے کا احترام ذہنوں میں اس حد تک رچ چکا تھا کہ اگر حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ اپنے منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کا حکم نہ دیتا اور محض قرآن کی ایک آیت کے ذریعے ایسے رشتوں کی نفی کر دی جاتی تو بھی ذہنوں میں ایسے رشتے کے بارے میں کراہت باقی رہتی۔ حضرت زینب سے حضور ﷺ کے نکاح نے مصنوعی رشتے کے اس انسان ساز تقدس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ (۲)

نبی اکرم ﷺ نے انتہائی کوشش فرمائی تھی کہ حضرت زید حضرت زینب کو طلاق نہ دیں تاکہ آپ ﷺ اس بڑی آزمائش سے بچ سکیں جس سے اس صورت میں آپ کو گزرنا تھا۔ مگر ربِ جلیل جل جلالہ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ متبنیٰ بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنا عام مسلمان کے لئے جائز قرار دیا گیا، مگر یہ بات آپ کے لئے فرض ٹھہری۔ اس کے علاوہ ربِ محمد ﷺ کو یہ بھی منظور ٹھہرا کہ ''ایمان والوں کے ایمان اور حُبِ رسول کو آزما لیا جائے اور یہ دیکھ لیا جائے کہ حضور ﷺ کا عمل اور اللہ تعالیٰ کی وحی، تمام قدیم اور باطل عقائد و رسوم کو مسلمان کی نظر میں ہیچ اور بے مایہ قرار دیتی ہے یا ابھی ماضی کے اثرات باقی ہیں''۔

سورہ احزاب میں نبی اکرم ﷺ کے حضرت زینب سے نکاح کے واقعے کو نہایت جامعیت اور اختصار کے ساتھ اس مکمل پس منظر میں پیش کر دیا گیا:

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْهِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَ تُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰهُ مُبْدِیْهِ وَ تَخْشَی النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا

۱۔ واقعاتی ترتیب اور تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ''حیات محمد، قرآن حکیم کے آئینے میں'' کے ابواب ''غزوۂ احزاب'' اور ''غزوۂ بنی قریظہ'' سے واقعہ افک تک۔ شائع کردہ دارالاشاعت، کراچی

۲۔ حیات محمد، قرآن حکیم کے آئینے میں: ص ۱۴۷

زَوَّجْنٰکَهَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝ مَا کَانَ عَلَی النَّبِیِّ مِنْ حَرَجٍ فِیْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ؕ وَکَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَا ۝ الَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۝ (۳)

اور جب آپ اس شخص سے جس پر اللہ نے اور آپ نے بھی انعام فرمایا، فرما رہے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنی زوجیت میں باقی رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تو آپ اپنے دل میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ تعالیٰ آخر میں ظاہر کرنے والا تھا اور آپ ﷺ لوگوں (کے طعن) سے اندیشہ کرتے تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہی زیادہ سزاوار ہے۔ پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) سے تمہارا نکاح کر دیا تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے جب کہ وہ ان سے اپنی حاجت پوری کر چکے ہوں اور اللہ کے حکم پر تو عمل ہونا ہی تھا۔ اور نبی پر کسی ایسے کام میں روکاٹ اور تنگی نہیں ہے جسے اللہ نے اس کے لئے فرض قرار دیا ہے اور اللہ کی یہی سنت ان نبیوں کے معاملے میں رہی ہے جو پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ کا حکم تو مقدر اور طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔ اور اللہ کی سنت ان لوگوں کے لئے ہے جو (انسانوں تک) اللہ کے پیغام پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں۔ اور اللہ کے سوا کسی

۳۔ الاحزاب: ۳۷ تا ۴۰

سے نہیں ڈرتے اور ان کے محاسبے کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

ان قرآنی آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت زینب سے حضور ﷺ کا نکاح اللہ تعالیٰ کے فرمان کی بجا آوری تھا، اور یہ نکتہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اسلامی اخلاق لوگوں کے گمان اور ان کے قائم کردہ معیاروں سے بلند تر ہوتا ہے اور یہ باتیں مسلمان کے طرز عمل کو متاثر نہیں کرتیں۔ وہ لوگوں کے طعن، تبصروں اور افواہوں کو پرکاہ سے بھی زیادہ کم وزن سمجھتا ہے۔ انسان ساز اخلاق اور اخلاقیات کی پوری تاریخ کارل مارکس کے اس خیال کی تائید کرتی ہے کہ اخلاقی اصول اور ضابطے ماحول اور اقتصادی نظام کے تابع ہوتے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن اخلاقی فضائل کی تکمیل کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے وہ ماحول اور معاشرے کے مروجہ اخلاقی بنیادوں کو ڈھانے والے تھے اور وہ اخلاقی فضائل وقت کی گرفت سے بالاتر تھے۔ اسلامی اخلاق اور اسلامی کردار کی بنیاد لازمانی اور لامکانی ہے، کیونکہ اس کا منبع اور سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہے:

نہ ہے زماں، نہ مکان لا الہ الا اللہ

یہ لازمانی اور لامکانی اخلاقی اصول اور ضابطے ہر زماں اور مکاں کے لئے ہیں، کیونکہ مادی ترقیاں، تسخیر مکاں، انسانوں کی تکنیکی اور سائنسی فتوحات بنیادی طور پر نفس انسانی کو نہیں بدل سکتیں، وحی الٰہی سے دوری کے سبب اس نام نہاد عالم گیریت کے دور میں انسان کی تنگ دلی، کم نظری اور اخلاقی بے راہ روی کی سب سے نمایاں مثالیں دنیا کی واحد سپر پاور کے سربراہ بش اور کیتھولک عیسائیت کے رہنما موجودہ پوپ کی شخصیتیں ہیں جو انسان کی آفاقیت اور انسانیت کی عالمگیریت سے منہ موڑ کر صلیبی جنگوں اور قرون وسطیٰ کی مسیحی تنگ دلی کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ یہ صرف اسلام ہے جو انسان کو اخلاق الٰہی کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا اخلاق، اسوہ حسنہ نبوی ﷺ کی تقلید اور اتباع میں اس خاک دان تیرہ کو روشن کرتا ہے اور اس زمینی زندگی کو جنت کی زندگی کا ہلکا سا نمونہ بنا دیتا ہے۔

غزوۂ مریسیع، منافقوں کے جارحانہ رویے، اور عظیم ترین برأت

غزوۂ مریسیع (غزوۂ بنی المصطلق) عسکری اعتبار سے کوئی بڑا معرکہ نہیں ہے لیکن اسے تاریخ اسلام میں اور حیات نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مطالعے میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس معرکے نے منافقوں کے نفاق کے پردے چاک کر دیئے، مومنوں کا ایمان تابندہ تر اور درخشندہ تر ہو گیا۔ اسلامی اجتماعی اخلاق ہر سازش اور افواہ طرازیوں کی ہر کوشش پر غالب آ گیا اور نفاق کی ان آندھیوں اور جھکڑوں کے بعد رحمت باری کی بارش نے مطلع کو روشن تر اور بے غبار بنا دیا۔ ایک اور بات واضح ہو گئی کہ اگرچہ اخلاق کا تعلق ایمان اور مومنوں کے قلوب سے ہے، لیکن معاشرے کی تطہیر کے لئے قوانین بھی ضروری ہیں۔ منافقوں کی منافقت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے وہ معاشرتی اور تعزیری ضابطے اور قانون عطا کئے جو تا قیام قیامت مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرتے رہیں گے اور ان کے معاشرے کو ہر تہمت، ہر افواہ اور ہر سازش کا مقابلہ کرنے کی قدرت عطا کرتے رہیں گے۔

غزوۂ مریسیع کے سال وقوع میں اختلاف پایا جاتا ہے، یہ غزوہ ۵ ھ میں پیش آیا یا ۶ ھ میں۔ ہمارا رجحان ۶ ھ کے شعبان کی طرف ہے، بہرحال ہم توقیت کی اہمیت کے بے حد معترف ہونے کے باوجود یہ عرض کریں گے کہ اخلاق محمدی ﷺ کے مطالعے میں سن کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ بس اتنا یقین کافی ہے کہ یہ غزوہ سرورکائنات ﷺ کے حضرت زینب سے نکاح کے بعد پیش

آیا اور یہ شادی ذی قعدہ یا ذی الحجہ ۵ھ میں ہوئی۔

غزوۂ بنی المصطلق (غزوۂ مریسیع) میں منافق اپنے ناپاک منصوبوں اور ارادوں کے ساتھ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ ان کا سربراہ اور دماغ عبداللہ بن ابی تھا۔ ان منافقوں نے یہ طے کر دیا تھا کہ مسلمانوں میں انتشار اور تفریق پھیلانے کے لئے ہر موقع اور واقعے کو استعمال کریں گے اور ایسے واقعات پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ عبداللہ بن ابی نے غزوۂ بدر کے بعد اپنے اسلام کا اعلان کیا تھا مگر وہ اس سے پہلے اور بعد میں بھی اپنے نفاق کے اظہار میں کبھی نہیں شرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کی یثرب آمد اس کے لئے ایسا ناسور بن گئی تھی جو مندمل ہونے کی جگہ بڑھتا ہی رہا۔ وہ جس یثرب کا بادشاہ بننے جا رہا تھا وہ یثرب مدینۃ النبی بن گیا اور اس کی ہوس تاجوری داغ نامرادی بن گئی، اور وہ اپنے بغض و عناد کا اظہار ہر موقع پر کرنے لگا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ حضرت سعد بن عبادہؓ کی عیادت کے لئے اپنے گدھے پر سوار ایک مجلس سے گزرے جس میں عبداللہ بن اُبی شریک تھا اس نے اپنی ناک پر کپڑا رکھ کر نہایت ناشائستہ لہجے میں کہا کہ ہم پر اپنے گدھے کے ذریعے غبار نہ اڑاؤ۔ جب رسول آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس مجمع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے فریضۂ تبلیغ کی بجا آوری کے لئے قرآن حکیم کی تلاوت شروع فرمائی تو رئیس المنافقین نے کہا ''ہماری مجلس میں قرآن سنا کر ہمیں تنگ نہ کیجئے''۔ غزوۂ بدر کے بعد ناچار ہو کر اس نے اسلام کا لبادہ اوڑھ لیا تو ہر جمعہ کو خطبۂ جمعہ سے پہلے اٹھ کر کہتا ''مسلمانو! اللہ کے رسول کی بات کا احترام کرو اور دل کے کان سے پوری توجہ سے سنو''۔ جب غزوۂ احد کے بعد اس نے یہی حرکت کی تو مسلمانوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا کہ تو نقیب رسالت کیوں بن رہا ہے، وہ غصے میں لوگ کو پھلانگتا ہوا مسجد سے باہر نکلنے لگا تو مسجد کے بیرونی دروازے کے باہر ایک انصاری نے اسے روکتے ہوئے کہا کہ واپس چل، رسول اللہ ﷺ تیری مغفرت کے لئے اپنے رب سے دعا کریں گے۔ اس بدبخت ازلی نے کہا کہ رب جلیل کی قسم! میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے لئے دعا کریں۔

ان دو مثالوں سے عبداللہ بن ابی کی ذہنی کیفیت، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے عناد اور مدینے میں اسلام کی سربلندی پر اس کی جلن اور کڑھن کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مریسیع کے چشمے پر قیام پذیر تھے، حضرت عمر بن خطابؓ کا ایک ملازم پانی لینے کے لئے چشمے پر آیا، جہجاہ غفاری، پانی لیتے ہوئے اس کا دھکا ایک انصاری جہنی کو لگ گیا، دونوں ایک دوسرے سے لڑنے لگے، جہنی نے نعرہ لگایا یا معشر الانصار، جواباً جہجاہ نے مہاجرین کو آواز دی یا معشر المہاجرین، چھ برس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسلمان معاشرے کی تشکیل فرمائی تھی اس میں منافقوں کی سازش سے جاہلی عصبیت کے رخنے اور دراڑیں پڑنے لگیں۔ ابھی دلوں سے ماضی پوری طرح نہیں محو ہوا تھا۔ وہ براہیمی نظر ابھی مسلم معاشرے کی مکمل شناخت نہیں بنی تھی جو یکسو ہو کر اللہ کی توحید اور ملت کی وحدت کے علاوہ ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موقع نزاع پر تشریف لائے اور آپ نے اہل ایمان کو آواز دی یا معشر الاسلام۔ میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور تم عہد جاہلیت کے نعرے لگا رہے ہو، یہ نعرے کفر کی بد بو لئے ہوئے ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ اس واقعے پر عبداللہ بن ابی نے کہا کہ لوگو! خدا کی قسم مدینہ واپس پہنچتے ہی ہمارا معزز ترین آدمی، ذلیل ترین آدمی (معاذ اللہ) کو باہر نکال دے گا۔ حضرت زیدؓ بن ارقم، عبداللہ بن ابی کی اس مجلس میں موجود تھے، انہوں نے یہ بات آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ اس منافق کے قتل کا حکم دے دیں۔ وہ رسول جس کی راہ میں مکۂ معظمہ میں کانٹے بچھائے گئے، جس پر گندگی پھینکی گئی، جس کو اس طرح حرم کعبہ میں مارا گیا کہ موت، زندگی سے قریب تر معلوم ہوتی تھی، وہ اپنی توہین کو اجرِ رسالت سمجھ کر مطمئن تھا اور اس کی نظر میں اہم تر اجتماعی مصالح تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں عمر نہیں، منافق اور اسلام کے دشمن کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے۔ یہ غیر معمولی تحمل اور اپنی ذات سے بلند ہو کر مسلم معاشرے کی مصلحتوں کو سامنے رکھنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا ایک اور پہلو ہے۔

جب حضرت زیدؓ بن ارقم نے عبداللہ بن ابی کی ہفوات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی تھیں تو دوسرے معمر صحابیوں نے بھی یہی کہا کہ اس کم عمر نوجوان نے پوری بات نہ سمجھی ہو، عبداللہ بن اُبی یا کسی کی یہ ہمت نہیں کہ وہ انصار کو ہم پر دولت خرچ کرنے اور

پناہ دینے کا طعنہ دے سکے۔ زید بن ارقم اس واقعے کے بعد گھر بیٹھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقین میں ان کی روایت کی تصدیق فرما دی:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ط وَ لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ O يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ O (۱)

یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ان (لوگوں) پر کچھ نہ خرچ کرو جو رسول اللہ (ﷺ) کے پاس (اور ساتھ) ہیں، یہاں تک کہ وہ ادھر ادھر ہو جائیں اور آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن یہ منافق اس حقیقت کو نہیں سمجھتے (اور) یہ منافق کہتے ہیں کہ ہم جب مدینے واپس جائیں گے تو وہاں سے عزت والا ذلت والے کو نکال دے گا اور (سچ تو یہ ہے کہ) ہر عزت اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے لیکن یہ منافق نہیں جانتے (اور اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری باتوں کی تصدیق کر دی ہے۔ خوش ہو جاؤ کہ تمہارا رب تمہاری صداقت کی گواہی دے رہا ہے۔

اور مدینہ منورہ واپسی کے موقع پر تاریخ کی براق آنکھوں نے دیکھا کہ عبداللہ بن اُبی کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ تلوار کو بے نیام کر کے مدینہ منورہ میں داخلے کے راستے پر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ مدینے کا ذلیل ترین آدمی مدینے کے بہترین آدمی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر مدینے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ہر عزت اللہ اور اس

۱۔ المنافقون: ۷،۸

کے رسول ﷺ کے لئے ہے۔ نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس جگہ تشریف لائے اور آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اپنے باپ کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ اخلاق محمد ﷺ کا یہ اثر اس واقعے کو زندہ کر گیا جب حضرت زید بن حارثہؓ نے اپنے مربی اور آقا ﷺ کو چھوڑ کر اپنے باپ اور چچا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ نے کتنے ہی معجزے عطا فرمائے۔ معجزہ وہ ہے جس کی کوئی دلیل اور عقلی توجیہ نہ پیش کی جا سکے، انبیائے ماسبق کو بھی معجزے دیئے گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے نو معجزات کا ذکر قرآن میں ہے۔ ید بیضا اور عصائے موسیٰ کے معجزے تو زبان اور ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ معجزے کوئی نبی اپنی قوم کے مطالبے پر نہیں پیش کر سکتا تھا بلکہ یہ معجزے اللہ تعالیٰ جب چاہتا کسی نبی کے ذریعے پیش فرما دیتا۔ جیسا کہ ہم مناسب موقعوں پر عرض کر چکے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا دامن دامانِ قیامت کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور اسی لئے حسی معجزوں کے علاوہ آپ کو دو ابدی معجزے عطا کئے گئے۔

قرآن حکیم اور آپ ﷺ کی زندگی جس کی قسم اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں کھائی ہے، اخلاقِ حسنہ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔ مسلمانوں کے انفرادی اخلاق اور مسلم معاشرے کے اجتماعی اخلاق کی بنیاد اسوہ حسنہ ہے۔ اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے کی تعمیر اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں کوئی معجزاتی پہلو نہیں ہے۔ جنگ بدر اور دوسرے معرکوں میں نصرتِ الٰہی نے مسلمانوں پر اپنا سایہ کیا، لیکن جنگ و جہاد میں مسلمان ہر آزمائش سے گزرے۔ سرکارِ ختمی مرتبت ﷺ نے مسلمانوں کو ہر آزمائش کے لئے تدابیر اختیار کرنے اور سامان مہیا کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی مسائل میں بھی رسول اللہ ﷺ اور مسلمان ہر آزمائش سے گزرے اور یوں وہ اخلاقی نظام اور ماحول وجود میں آیا جو آج بھی زرِ خالص کی طرح چمک رہا ہے اور یہ تابندگی ہمیشہ قائم رہے گی۔

عبداللہ بن اُبی کو مدینہ منورہ میں داخلے کی اجازت حضرت سید البشر ﷺ نے عنایت فرمائی اور رئیس المنافقین کے ساتھ سازشوں، افواہوں اور بہتان کا ایک سیل بے پایاں

مدینہ منورہ کے ساحلِ عافیت سے ٹکرانے لگا۔

واقعۂ افک نے پورے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ ایک دو بڑے صحابہ بھی اس سے متاثر ہوئے، واقعۂ افک کے واقعاتی پہلو سے ہم صرف نظر کرتے ہیں کیونکہ جب قرآن عظیم نے اسے بہتانِ عظیم قرار دے دیا تو بات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے طے ہوگئی۔

وَلَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا ۗ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ○ (۲)

تم نے اسے سنتے ہی کیوں نہ کہہ دیا کہ ایسی بات کہنا ہمیں زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ یہ تو بہتان عظیم ہے۔

سبحان اللہ، کبریائی اللہ تعالیٰ کے لئے ہے اور مومن معاشرے کو اسی پاکی اور پاکیزگی کا عکس ہونا چاہئے۔ جو منافق مدینہ منورہ کے مسلم معاشرے میں دخیل ہونے کی کوشش کر رہے تھے ان کا مقصد یہی تھا کہ اس معاشرے میں فحاشی، بے حیائی اور تہمت عام ہوں۔ ان منافقوں کا ذکر اس معاشرے کے افراد سے الگ کیا گیا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ فِى الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (۳)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فحاشی (اور بے حیائی) پھیلے ان کے لئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

جو لوگ مسلم معاشرے میں بے حیائی کو عام کرنے کی کوشش کریں وہ اس آیت مبارکہ کی روشنی میں منافق ہیں۔ آج ابلاغ عامہ کے اس دور میں یہ منافقت پاکستان کے برقی ذرائع ابلاغ میں عام ہے اور اب وبا کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ دولت کی محبت اور

۲۔ النور: ۱۶

۳۔ النور: ۱۹

فکر عقبیٰ سے بے خوفی ہے، ایک ہی شخص یا گروپ کے ایک سے زیادہ چینل انسانوں کے ہر جذبے اور لگاؤ کا استحصال کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ روپیہ بٹور رہے ہیں۔ ایک چینل مذہبی پروگراموں کے لئے وقف ہے تو دوسرا چینل فیشن کے لئے مختص ہے۔ مذہبی چینل بھی قرآن و حدیث کی تعلیمات سے زیادہ وقت استخارے، خوابوں کی تعبیر اور روحانی علاج اور قوالی و نعت خوانی کے نام پر موسیقی کے لئے وقف ہے۔ یوں معاشرے میں بے حیائی اور فحاشی کے ساتھ ساتھ بداعتقادی اور آرائشی مذہب کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

بے حیائی اور فحاشی کے جلو میں خواتین کے بارے میں تہمتیں اور افواہیں پھیلتی ہیں اور نیک و متقی مرد بھی محفوظ نہیں رہتے۔ اگر معاشرے کا اخلاقی توازن برقرار ہے تو کسی افواہ اور تہمت کے پھیلنے کے وقت لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ ایسی باتیں کہنا اور کرنا ہمیں زیب نہیں دیتا۔ یہ ہے مسلم معاشرے کا وہ اخلاقی معیار جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔ واقعۂ افک کے موقع پر اس اسلامی اخلاق اور کردار کا مظاہرہ حضرت ابوایوب انصاری اور ان کی زوجۂ محترمہ رضی اللہ عنہما نے کیا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے اپنی زوجہ سے پوچھا کہ ایوب کی ماں! اگر تم ام المؤمنین کی جگہ ہوتیں تو کیا ایسی بات کے ارتکاب کا تمہیں خیال آتا جس کی تہمت اس بی بی پر لگائی جا رہی ہے، جس کے حجرے میں بار بار وحی نازل ہوئی ہے، جو اللہ کے عظیم ترین اور آخری رسول کی شریک حیات ہے اور جو اس امت کے صدیق کی بیٹی ہے۔ ام ایوب نے جواب دیا کہ معاذ اللہ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ حضرت ابوایوب انصاری نے کہا کہ کسی ایسی صورت حال میں کسی بھی خاتون کے لئے یہ بات میرے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتی اور جس پر تہمت لگائی گئی ہے وہ مجھ سے بہتر مسلمان ہے۔

بیشتر مسلمان بھی حضرت ابوایوب انصاریؓ کی طرح اس واقعے کو بہتان ہی سمجھ رہے تھے لیکن ذہنوں میں شک کا غبار چھا گیا۔ یہی نہیں بلکہ بعض سچے مسلمان بھی اس تہمت کی مہم میں شریک ہوئے، مسطح بن اثاثہ، حمنہ بنت جحش اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہم اس موقع پر اس بشری کمزوری کے مرتکب ہوئے اور قذف کے اس جرم میں انہیں اسی اسی کوڑوں

۴۔ النور: ۱۱

کی سزا دی گئی۔ اس واقعے کے بارے میں قرآن مجید کا یہ ارشاد بھی ہے:

لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ ؕ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۴)

تم اسے اپنے لئے برا نہ سمجھو بلکہ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اور اس تہمت میں خیر کا باقی رہنے والا پہلو یہ تھا کہ رب العزت جل جلالہ نے ایسے معاشرتی اور اجتماعی ضابطے اور قانون نازل فرمائے جو معاشرے کی اخلاقی قدروں کے فروغ کے لئے ضروری تھے۔

۱۔ اس واقعے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کو ذوالفضل کے زمرے میں شامل فرمایا، اور ان صاحبانِ فضل و وسعت کے لئے یہ ضابطہ قائم ہوا کہ وہ اپنے عزیزوں، ضرورت مندوں اور مہاجروں کی جو مالی مدد کرتے ہیں اسے کسی ذاتی ناراضگی یا ان کی کسی غلطی کی بنا پر ختم کرنے کا ارادہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ اس بات پر عہد کر لینا چاہئے۔ ایسی صورت میں انہیں معاف کر دینا چاہئے تا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے قصور بھی معاف کر دے، بندگانِ خدا کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے کرم کو آواز دینے کے مرادف ہے:

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِى الْقُرْبٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا
وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ○ (۵)

اور جو تم میں سے صاحبِ فضل و بزرگی اور (مالی) وسعت والے ہوں انہیں اپنے اہلِ قرابت، مساکین اور مہاجرین کو فی سبیل اللہ امداد دینے سے (رکنے کی) قسم نہ کھانی چاہئے بلکہ چاہئے کہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے، اللہ مغفرت کرنے والا اور رحیم ہے۔

حضرت مسطح جو واقعہ افک کے تہمت پردازوں میں غلطی سے اور وقتی طور پر ایمان کی

۵۔ النور: ۲۲

کمزوری کی وجہ سے شامل ہو گئے تھے، رشتے میں حضرت صدیق اکبرؓ کے خالہ زاد بھائی تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کے اس طرزِ عمل سے آزردہ ہو کر یہ عہد کر لیا تھا کہ ان کو جو رقم پابندی سے دیتے تھے اب نہیں دیں گے۔ اس عہد میں کوئی اخلاقی قباحت بظاہر نظر نہیں آتی، لیکن اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں حُبِ الٰہی اور خوفِ الٰہی کی بنیادوں پر جو اخلاق پیدا کرنا چاہتا تھا اس کے منافی تھا۔ قرآنِ حکیم نے اس سلسلے میں واضح طور پر یہ اصول بھی عطا کیا ہے کہ کوئی کسی پر احسان کر کے اور حسنِ سلوک کر کے جتلائے نہیں اور اسے اپنا مرہونِ منت نہ بنائے اور نہ سمجھے۔ یہ ایک عام ضابطہ ہے عام مسلمانوں کے لئے، پھر اس امت کے صدیق کے لئے جناب باری کو یہ کمزوری کیسے گوارا ہو سکتی تھی، اسی لئے اس آیت میں انہیں اور آنے والے ادوار کے مسلمانوں کو یہ اخلاقی کلیہ عطا کیا گیا کہ اللہ کے عفو و درگزر کے حصول کے لئے اللہ کی مخلوق کے ساتھ حسنِ سلوک ہر حال میں جاری رہے اور کوئی شخص بلا وجہ اس سلسلے کو نہ توڑے۔ اس حکم میں صلۂ رحمی، انفاق فی سبیل اللہ اور امدادِ مہاجرین یہ سب باتیں بھی آ گئیں۔

۲۔ واقعہ افک کی وجہ سے پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے کے جرم کو حدود اللہ کی خلاف ورزی قرار دیا گیا اور اس جرم پر حد جاری کی گئی، یعنی اسی دُرّے۔

۳۔ جو دوسرے معاشرتی ضابطے اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کے بعد عطا فرمائے ان میں یہ بھی ہے کہ کسی دوست اور عزیز کے گھر میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں۔ اس حکم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تمہاری نگاہیں اس گھر میں داخل نہ ہوں اور اگر تم سے کہا جائے کہ اس وقت آپ سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو بغیر غم، غصے اور ناراضی کے واپس لوٹ جاؤ۔ اس بات کو قرآن نے ''ازکی'' یعنی پاکیزہ قرار دیا ہے۔ یہ دراصل وہ پیش بندی ہے جو پاک باز افراد کو تہمتوں سے بچائے گی، ہمارے دور میں شہری حقوق کا بہت چرچا اور غوغا ہے اور ان حقوق میں Right of privacy پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے تقریباً پندرہ سو سال پہلے اس حق کی اہمیت اور افادے کو اجاگر کیا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى
تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَذَكَّرُوْنَ O فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ O (۶)

اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں اُس وقت تک داخل نہ ہو جب تک کہ اجازت نہ لے لو، اور ان کے گھروں میں رہنے والوں کو سلام نہ کرلو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ اور اگر وہاں (اس گھر میں) تمہیں کوئی نہ ملے تو بغیر اجازت کے ان میں داخل نہ ہو، اور اگر تم سے لوٹ جانے کے لیے کہا جائے تو لوٹ جاؤ، یہی بات تمہارے لئے پاکیزگی کی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اللہ خوب آگاہ ہے۔

۴۔ اسلام میں ہر قانون اور ضابطے کی اخلاقی بنیاد ہوتی ہے۔ جن جرائم پر سزا ہوتی ہے وہاں یہ بات بھی بیشتر مواقع پر قرآن حکیم میں کہی گئی ہے کہ ''تاکہ تمہیں فلاح ہو''۔ قرآن میں سزا کے ساتھ فلاح اور مغفرت بھی وابستہ ہیں، اپنے جرم اور قصور کی سزا پانے کے بعد آدمی اپنے جرم سے بری ہو جاتا ہے اور اسے اس جرم کا طعنہ نہیں دیا جاسکتا، مجرموں کی ہمہ جہتی بحالی اسلام کے ضابطۂ اخلاق اور قانوں کا خاصہ ہے جس میں کوئی نظام اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

معاشرے کو فحش، تہمت، افواہوں اور بہتان سے بچانے کے لئے افراد کی اخلاقی ذمہ داری اور رویہ سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، سورۃ النور میں مسلمان مردوں کو اپنی نگاہوں اور شرم گاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا اور اس کے بعد مسلمان عورتوں کو یہی حکم دیا گیا۔ معاشرے کی اخلاقی فضا کا تحفظ مرد اور عورت دونوں کا فریضہ ہے اور اس کے اس کے ساتھ ساتھ عورت کو بڑی نزاکت سے یہ بات بھی یاد دلا دی گئی کہ اس کی زینت سے اپنی نگاہوں کو مسرت دینا صرف اس کے شوہر کا حق ہے۔ ایک پاکیزہ عورت کا کردار اور وجود پورے معاشرے کو اخلاقی طور پر مُزین کرتا ہے، اس کے اہل خانہ اس کے برتاؤ سے اطمینان اور سکون

۶۔ النور: ۲۷، ۲۸

حاصل کرتے ہیں، اس کی آغوش اس کے بچوں کی درس گاہ ہے، لیکن اس کا وجود غیر محرموں میں اشتعال پیدا کرنے کا سبب نہیں بنتا اور اس امکان کے ہر دریچے کو اسلامی ضابطے بند کر دیتے ہیں۔ اسلام ایسے معاشرے کی تخلیق نہیں کرتا جو عورت کو ایک رنگین وجود قرار دے کر اور آزادی کے فریب میں مبتلا کر کے اسے سینما کے بڑے پردے پر اور ٹی وی کے چھوٹے پردے پر تجارتی اشتہاروں میں استعمال کر کے نئے ''عالمی بازار عکاظ'' کی طرح ڈالی جائے، ہم اس نکتے پر صفحات ماسبق میں پہلے بھی گزارشات پیش کر چکے ہیں۔

اب وہ معاشرتی ضابطے اور احکام ملاحظہ فرمایئے جو واقعۂ افک کے پس منظر میں نازل کئے گئے اور جو ہر دور میں مسلمان معاشرے کے اخلاقی مزاج اور نہاد کی تعمیر میں شریک رہیں گے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ O وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O (۷)

مسلمان مردوں سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لئے پاکیزگی کا سبب ہے اور لوگ جو کچھ کریں گے اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھتا ہے۔ اور مسلمان عورتوں سے

۷۔ النور: ۳۰، ۳۱

کہہ دیجئے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے کہ جو ظاہر ہے اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں ڈالے رہیں اور اپنی آرائش کسی پر ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے شوہر، اپنے والد یا شوہر کے والد، یا اپنے بیٹوں یا اپنے شوہر کے بیٹوں، یا اپنے بھائیوں، یا اپنے بھتیجوں، یا اپنے بھانجوں کے، یا اپنی میل جول کی عورتوں کے، یا ایسے مرد خادموں سے جو عورت کی خواہش (فطری طور اور مستقل طور پر) نہ رکھتے ہوں یا ایسے بچوں سے جن پر عورتوں کے پردے کی باتیں آشکار نہ ہوں اور زور زور سے اس طرح پاؤں مار کر نہ چلیں کہ ان کی پوشیدہ زینت آشکار ہو جائیے، اے اہل ایمان! تم سب اللہ کی بارگاہ میں اجتماعی طور پر توبہ کرو تا کہ نجات پالو۔

۵۔ نکاح حفظ عصمت کا مضبوط قلعہ ہے۔ جس معاشرے میں بالغ مردوں اور عورتوں کی قابل ذکر تعداد بے نکاحوں پر مشتمل ہو اس پر جنسی جذبات کا شب خون آسانی سے مارا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر آج کی دنیا میں جہاں بہت سے افراد بہتر معیار زندگی کے نام اور فریب کی وجہ سے صحیح عمر میں نکاح نہیں کرتے۔ جس وقت سورۃ النور نازل ہوئی اس وقت خاص طور پر غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کا معاملہ بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ آج جب کہ غلامی کا ادارہ نظر بظاہر ختم ہو چکا ہے حقیقتاً زندہ ہے اور اس کے جلو میں بے راہ روی کے ساتھ انسانوں پر جبر و ستم کا ایک سلسلہ جاری ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ بردہ فروشی اور عورتوں کی خرید و فروخت ایک عالم گیر جرم بن چکا ہے، جس کی جڑیں ایشیا، بالخصوص جنوبی ایشیا اور مشرق بعید، یورپ اور افریقہ میں دور دور تک سرطان کی طرح پھیلی ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ نے نکاح کے مسئلے کا غلامی سے رشتہ جوڑ کر دو سماجی برائیوں کو ختم کرنے کا نسخہ عطا کیا ہے۔ غلاموں کو معاشی خوش حالی حاصل ہو، انہیں آزاد کیا جائے اور انہیں اپنی آزادی کو خریدنے کا موقع دیا جائے اور اس سلسلے میں ان کے ساتھ مالی تعاون کیا جائے، اُس عہد میں اسلامی احکام اور معاشرے کے قیام سے

پہلے عرب اپنی لونڈیوں کو عصمت فروشی پر مجبور کرتے تھے اور یہ ان کی حرام اور ناجائز کمائی کی ایک صورت تھی۔ اس صورت میں قرآنِ حکیم نے یہ وضاحت فرما دی کہ اس کا عذاب ان کے مالکوں پر پڑے گا اور اللہ کی مجبور بندیاں اس گناہ کے عذاب سے بری ہوں گی، سورۃ النور کی آیات میں ان سب صورتوں کا احاطہ کیا گیا ہے، عرب مشرک سرمایہ پرستوں کی ہوس ناکیوں سے لے کر آج کے عہد کی فحاشی اور قحبہ گردی کے سارے امکانات خدائے قادر و عادل نے پیش فرما دیئے ہیں:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ط اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ O وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا صلے وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ط وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ط وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (۸)

تم میں سے جو مرد بے نکاح کے ہوں ان کا نکاح کر دو اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے ان کا نکاح بھی کر دو جو صالح اور نیک چلن ہوں اور اگر وہ مفلس بھی ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنی اور صاحب استطاعت کر دے گا اور اللہ تعالیٰ علیم بھی ہے اور وسعتوں اور کشادگی والا ہے۔ اور جو نکاح کی سکت اور استطاعت نہیں رکھتے، وہ پاک دامنی اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے انہیں غنا اور دولت عطا کر دے اور تمہارے غلاموں میں سے جو تمہیں کچھ روپیہ دے کر آزادی کی تحریر حاصل کرنے کا خواہش مند ہو تو تم انہیں ایسی

۸۔ النور: ۳۲،۳۳

تحریر دے دیا کرو۔ اگر تم کو ان میں ایسی بھلائی نظر آتی ہو، اور اللہ نے جو مال تمہیں عطا کیا ہے اس میں سے انہیں بھی دو، تمہاری جو کنیزیں پاک دامن رہنا چاہتی ہیں، انہیں اس دنیا کی زندگی کے فائدے کے لئے بدکاری پر مجبور نہ کرو اور جو انہیں مجبور کرے تو اللہ تعالیٰ ان پر جبر کے بعد ان کی مغفرت کرنے والا رحیم ہے۔

ان ضابطوں اور معاشرتی احکام کے بیان کے بعد قرآن مجید کی وہ نہایت خوبصورت آیت آتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مثال چراغ والے طاق سے دی گئی ہے۔ وہ چراغ جو شیشے کی قندیل میں ہو اور وہ شیشہ روشن ستارے کی طرح ہو، اللہ ہی نور ہے اور وہ نور جس سے ارض وسماوات کی بزم روشن ہے۔ یہی وہ نور ہے جس سے انسان روشن ہے اور حضور سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو اس درجہ اس نور سے قربت ہے کہ ان کا وجود بھی نور بن گیا، اور یہ اس بے انسانوں کی دنیا کی ظلمات کو دور کرنے کے لئے ایک بشر ہی کو نور بنانا ہی مشیت الٰہی تھا۔ کیونکہ انسانوں کے لئے انسان ہی رہنما، مثال اور ذریعۂ ہدایت بن سکتا ہے، تمام اقوام اور دنیا کے ہر خطے کے انسانوں کی ہدایت انبیائے کرام کے ذریعے ہوئی اور ہر نبی اپنی قوم میں پیدا ہوا، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ پوری انسانیت کی طرف مبعوث فرمائے گئے۔

اس قرآنی مثال میں قلب مومن کے لئے چراغ کی تشبیہ استعمال کی گئی ہے، اس تشبیہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اپنے آپ کو اخلاقِ الٰہیہ سے مزین کرنے کا کیا مفہوم ہے اور یہ بات احکامِ الٰہی کے مکمل اتباع کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہ احکام پوری حیاتِ انسانی کا احاطہ کر لیتے ہیں، جنسی طہارت اور پاکیزگی زندگی ہی کا حصہ ہے اور اس کا تعلق رشتوں کے احترام، حرمتوں کے قیام اور بچوں سے لے کر بڑوں تک کی تربیت سے ہے، اس کا رشتہ صاحبانِ خاندان اور ان کے غلاموں اور کنیزوں کے باہمی تعلقات سے بھی ہے، عبادات ان معاملات اور رشتوں کو ایک روحانیت عطا کرتی ہے اور زمین پر حکومت اہل ایمان کو اس لئے عطا کی جاتی ہے کہ وہ کائنات میں ہر خوف اور فتنے کو امن وامان میں بدل دیں۔ (۹)

۹۔ النور: ۵۵

سورۃ النور کی آخری آیت میں باہمی کھانے، غیر مسکونہ مکانوں میں داخلے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان حقوق کا ذکر ہے جو مسلمانوں کے ذمے ہیں۔

سورۃ النور سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ اخلاق کا تعلق زندگی کے کسی ایک شعبے سے نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی ضابطے پوری زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں اور ایک پہلو کا تعلق دوسرے پہلو سے ہوتا ہے۔ جنسی اخلاق کا رشتہ رہن سہن، ایک دوسرے کے لحاظ، مختلف اوقات کے مناسب لباس اور خلوت کے احترام سے ہے۔

اسلامی نظام اخلاق، نظام معاشرت، نظام جرم وسزا، نظام معاملات کس طرح دین و دنیا کا احاطہ کرتے ہیں، یہ ایک مستقل موضوع مطالعہ ہے۔ زندگی کے تمام پہلوؤں اور جزئیات کو اس وحدت سے متعلق کر دینا بنیادی نکتہ ہے جسے اسلام کہتے ہیں۔

یہ ہے قرآن حکیم کے اس ارشاد کی مختصر سی تفہیم کہ واقعہ افک میں بھی مسلمانوں کے لئے خیر تھا، شر سے خیر کو یوں اُبھارنا اسی رب کائنات کا کام ہے جو راتوں کو پھاڑ کر صبح کے نور کی تخلیق کرتا ہے۔

صلح حدیبیہ۔ فتح مبین

صلح کے داعیِ اعظم نے جنگ کے امکان کو شکست دے دی

ہجرت کے چھٹے سال ہی سے عرب کی فضا اور ماحول میں اسلام کی نصرت کے تمام آثار پیدا ہو چلے تھے۔ مسجد الحرام اور خانہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ پہلے ہی قرار دیا جا چکا تھا۔ تبدیلیِ قبلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزوؤں کا بہت کچھ دخل تھا۔ ہر نماز کے وقت یہ تمنا آپ کے دل میں جاگ اٹھتی کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کا تعمیر کردہ بیت اللہ ان کا قبلہ ہو جائے۔ رسول کی ہر تمنا اور آرزو کا سبب غلبۂ دین ہی ہوتا ہے اور تحویلِ قبلہ سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی، کہ یہود اقوامِ عالم کی پیشوائی کے منصب سے معزول کئے جا چکے ہیں اور یہ پیشوائی اب بنو اسماعیل کے سپرد کی جا رہی ہے۔

اس پس منظر میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا کہ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیت اللہ کا طواف کر رہے ہیں اور عمرہ ادا کر رہے ہیں۔ نبی کا خواب بھی اس کی نبوت کا حصہ ہوتا ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے خواب سے اصحاب باصفا کو مطلع فرمایا۔ ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، یہ اپنے مرکزِ اول کی طرف اسلام کا سفر تھا، صحابۂ کرام نے اپنے آپ کو اس سفر کیلئے تیار کرنا شروع کر دیا۔ گرد و نواح کے علاقوں میں بھی اعلان کرا دیا گیا کہ جو چاہیں وہ اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں۔ پھر آپ یکم ذی قعدہ ۶ ھ کو عمرہ کے لئے مدینہ منورہ سے روانہ ہو گئے، اسلام میں ہر دن سعید اور مبارک ہے

لیکن یہ بات اتفاق سے کچھ زیادہ ہی ہے کہ حیاتِ نبوی میں دوشنبہ کے دن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یکم ذی قعدہ ۶ ھ کو بھی دوشنبہ کا دن تھا۔ اس قافلۂ سعادت آثار میں کم و بیش پندرہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم رسول قبلتین ﷺ کے ساتھ تھے، مقصد سفر ادائی عمرہ تھا اس لئے ان قدسی نفس انسانوں کے پاس تلوار کے سوا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سفر حضر میں تلوار ساتھ رکھنا عرب کا دستور بھی تھا اور طویل سفر کے لئے ضروری بھی تھا۔

مسلمانوں کا یہ سفر زیارت بیت اللہ اور عمرے کے لئے تھا۔ ان کے ساتھ قربانی کے جانور تھے۔ پھر عمرے کی ادائی کی خبر عام ہو چکی تھی اور اب قافلۂ اسلام، امن وسلام کے فروغ دینے کے لئے بیت السلام کی طرف رواں تھا، قریش بھی اس سفر سے باخبر تھے اور ان کی اسلام دشمنی کا پہلو یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانوں کو مسجد الحرام اور ام القریٰ تک پہنچنے سے ہر قیمت پر روکنا چاہتے تھے، قبیلہ کعب بن لوئی اور اس کے حلیف قبیلے اس کو روکنے کے لئے اور جنگ کے لئے جمع ہوئے۔ نبی سلام و رحمۃ نے ان سے بچ کر اور راہ بدل کر سفر جاری رکھا۔ قریش ذی طویٰ کے مقام پر اپنے لشکر کے ساتھ مسلمانوں کے منتظر تھے تا کہ انہیں قوت سے روکا جا سکے، خالد بن ولید مکہ جانے والی شاہراہ پر اپنے دستے کے ساتھ جنگ کے لئے موجود تھے، حضور ﷺ نے اس راستے کو چھوڑ کر پیچ پیچ پہاڑی دشوار گزار راستہ اختیار کیا اور یوں حدیبیہ تک پہنچ گئے، کائنات کے لئے امن وصلح اور سلامتی کا پیغام لانے والے رسول نے اپنی زندگی کے ہر مرحلے اور منزل میں جنگ اور خون ریزی سے بچنے کی ہر سعی کی اور آپ کی سیرت کا مطالعہ کرنے والا کوئی غیر مسلم مبصر یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے کسی مسئلے کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا، آپ مرتبۂ رسالت پر فائز کرنے والے اللہ نے غرض، مفاد اور انا کے عنصر سے آپ کی ذات کو پاک بنا دیا تھا۔

حدیبیہ میں بدیل بن ورقا (قبیلہ خزاعہ) اور حلیس بن علقمہ نے سفارت کاری کے ذریعے معاملے کو حل کرنا چاہا، پھر عروہ بن مسعود ثقفی آپ کے پاس آیا، اس نے صحابۂ کرام کے بارے میں نازیبا باتیں کہیں لیکن حضور ﷺ نے نفرت کی آگ پر محبت کی شبنم چھڑکی اور فرمایا کہ مقررہ مدت کے لئے جنگ کا ارادہ ختم کر دو، لیکن قریش کے عاقبت نااندیش نوجوانوں نے جنگ کی آگ بھڑکانے کے لئے ایک رات مسلمانوں کی خیمہ گاہ میں داخل ہونے کی کوشش کی

لیکن اسلامی خیمہ گاہ کے محافظوں کے کماندار محمد بن مسلمہ نے ان کو گرفتار کر لیا۔ جب ان قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا تو آپ نے انہیں معاف کرتے ہوئے آزاد فرما دیا کیونکہ ان جنگی مجرموں کے قتل سے آپ کے ارادۂ عمرہ اور صلح پسندی پر ضرب لگتی۔ قرآن حکیم میں اس واقعے کی طرف یوں اشارہ فرمایا گیا:

وَهُوَ الَّذِىْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا O (۱)

اور وہی (اللہ) ہے جس نے بطن مکہ (خاص مکہ) میں ان کے (کافروں کے) ہاتھوں کو تم اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے روک دیا، اس کے بعد کہ اس نے تم کو ان پر غلبہ عطا کر دیا تھا اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مصالحانہ کوششوں کا یہ نقطۂ آخر نہیں تھا۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قریش کے پاس اپنے سفیر کے طور پر بھیجا تا کہ قریش پر بات واضح ہو جائے کہ آپ محض عمرے کی ادائی کے لئے تشریف لائے ہیں، اس موقع پر سعید بن عاص نے آپؓ کو اپنی پناہ میں لیا اور حضرت عثمان نے بڑی قوت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موقف قریش تک پہنچا دیا۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنے فرضِ سفارت کو ادا کر چکے تو قریش نے آپ کو بیت اللہ کے طواف کی دعوت دی مگر آپ نے یہ کہتے ہوئے دعوت مسترد کر دی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اپنے نبی (ﷺ) سے پہلے طواف کر لوں اور یہ میرے مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بھی زیادتی ہو گی۔ وہ اخلاق اور بے غرضی جو رگ و پے میں سرایت کر چکی ہو اس کا اظہار لمبی چوڑی تقریروں سے نہیں بلکہ ایسے اعمال سے ہوتا ہے، مسلمان تو اپنے نبی کو اپنے نفس اور جانوں سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

مکہ معظمہ میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا قیام طویل ہو گیا، کیونکہ قریش چاہتے

۱۔ الفتح: ۲۴

تھے کہ باہمی مشورے کے بعد حضرت عثمانؓ کو ان کے پیغام کا حتمی جواب دے سکیں، اس تاخیر کی وجہ سے مسلمانوں تک یہ افواہ پہنچی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ ان اعصاب شکن حالات اور ماحول میں یہ افواہ ایک حقیقت معلوم ہوتی تھی، صحابۂ کرام کے پاس تلواروں کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا، نہ نیزے، نہ تیر کمان، اور دفاع کے لئے خود تھے، نہ زرہ بکتر۔ انتہا یہ ہے کہ ڈھالیں تک نہیں تھیں، لیکن یہ "بدلی ہوئی صورت حال" مسلمانوں کے لئے ایک امتحان تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں اپنے مقاصد کے مقابلے میں زندگی بہت حقیر چیز لگتی تھی۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب جنگ ہم پر واجب ہو گئی، پھر صحابۂ کرام نے ایک درخت کے نیچے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، آخری دم تک جہاد کرنے کی بیعت اور موت تک جہاد کرنے کی بیعت۔ یہی بیعت بیعتِ رضوان کہلاتی ہے۔ وہ بیعت جو اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کا سبب بنی۔ وہ صحابی جنہوں نے اس موقع پر بیعت کی انہیں اصحاب رضوان یا اصحاب بیعتِ رضوان کہا جاتا ہے، اور ان کو جماعتِ صحابہ میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی جان کی قیمت پر عہد کیا تھا، ادھر یہ بیعت پوری ہوئی اور ادھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بخیر و عافیت واپس آ گئے اس بیعت کا ذکر قرآن حکیم میں جس انداز سے کیا گیا ہے اس سے اس بیعت کی اہمیت اور بیعت کرنے والوں کے مرتبے کا اندازہ ہو سکتا ہے:

لَقَدْ رَضِىَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِىْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا O وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا O (۲)

یقیناً اللہ مومنوں سے راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے، ان کے دلوں میں جو کچھ تھا اللہ نے اسے معلوم کر لیا اور ان پر اس نے سکون اور اطمینان نازل فرمایا اور انہیں قریب کی فتح عنایت فرمائی اور بہت سی غنیمتیں جو وہ حاصل کریں گے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

۲۔ الفتح: ۱۸، ۱۹

ہم سورۃ الفتح کا حوالہ صلح نامۂ حدیبیہ کے بعد دینا چاہتے تھے لیکن سلسلۂ کلام میں وہ مرحلہ آ گیا کہ یہ حوالہ ناگزیر ہو گیا۔ یہ سورۂ حدیبیہ سے واپسی کے وقت نازل ہوئی اور اس سے صحابۂ کرام کے قلوب کو اطمینان حاصل ہوا جو صلح نامہ حدیبیہ کے امکانات کو سمجھ نہ پائے تھے اور اس صلح نامے میں انہیں قریش کی فتح نظر آئی تھی۔ رب جلیل نے انہیں بتایا کہ یہ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی فتح تھی اور وہ بھی فتح مبین۔ اسی کے ساتھ ساتھ سورۃ الفتح میں قریب کی فتح کا مژدہ سنایا گیا۔ اس سے مراد خیبر کی فتح تھی، فتح خیبر صلح حدیبیہ کا تتمہ ہے۔ اسی لئے خیبر کے معرکے میں صرف اصحاب بیعت رضوان کو شرکت کی اجازت دی گئی اور اس معرکے کی غنیمتوں میں ان کے سوا اور کوئی حق دار نہ ٹھہرا۔ مستقبل کا ذکر ماضی کے صیغے میں کیا گیا، یہ انتہائی قطعیت کے اظہار کی ایک صورت ہے۔ ہونے والے واقعے کو ماضی کے واقعے کے طور پر بیان کیا گیا۔

آیئے اب صلح نامہ حدیبیہ کی طرف مراجعت کریں، حضرت عثمانؓ کی سفارت کے نتیجے میں قریش نے سہیل بن عمرو کو معاملات صلح کی ترتیب و تکمیل کے لئے بھیجا۔ سہیل کو ایک بات کی تاکید کی گئی تھی کہ مسلمان اس سال عمرے کے بغیر واپس جائیں، اگلے سال آئیں، وہ چاہتے تھے کہ عرب کے دوسرے قبیلوں کے سامنے انہیں خفت نہ اٹھانی پڑے کہ مسلمان ان کی اجازت کے بغیر بلدِ امین میں داخل ہو گئے، صلح نامے کی شرائط یہ تھیں:

۱۔ مسلمان اس سال عمرے کے بغیر واپس جائیں، اگلے سال وہ عمرے کے لئے آئیں۔

۲۔ فریقین دس سال تک امن کے عالم میں رہیں، دس سال تک جنگ بندی کا پورا احترام کیا جائے۔

۳۔ عرب کے قبیلوں کو اس بات کی آزادی ہوگی کہ وہ مسلمانوں اور قریش میں جس کو چاہیں اس کے حلیف بن جائیں اور اگر حلیف قبیلوں میں سے کسی کے ساتھ زیادتی کی جائے تو وہ مسلمانوں یا قریش کے ساتھ زیادتی سمجھی جائے گی۔

۴۔ دس سال کے عرصے میں اگر کوئی مسلمان پناہ لینے کے لئے قریش کے پاس جائے گا تو قریش اسے واپس نہیں کریں گے، لیکن اگر قریش کا کوئی آدمی اپنے سرپرست کی اجازت

کے بغیر محمد ﷺ کے پاس آئے گا تو اسے مکہ واپس بھیج دیا جائے گا۔

اس صلح نامہ کی تحریر کے سلسلے میں سہیل نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور محمد رسول اللہ کے لکھنے پر اعتراض کیا، نبی آخر الزماں ﷺ نے صلح نامے میں قریش کے اعتراض کے مطابق ترمیم کر دی۔ اسی طرح ابو جندل کے معاملے میں بھی کمال تحمل سے کام لیا گیا۔

عمرے سے محرومی کے سبب مسلمان اس بات پر بھی غور نہ کر سکے کہ صلح نامے کے لئے تیار ہو کر قریش نے مسلمانوں کو برابر کی طاقت تسلیم کر لیا تھا، دس سال تک جنگ بندی کی دفعہ اور قبائلِ عرب کو محمد ﷺ اور قریش میں سے کسی ایک کا حلیف بن جانے کی اجازت فریقین کو مساوی الحیثیت کو تسلیم کرنے کے مرادف تھی۔ اس دفعہ سے یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ دوسرے قبیلوں کو مسلمانوں کے حلیف بننے میں دنیاوی مفادات حاصل ہو سکتے تھے۔ اب مسلمان ایسی قوت بن چکے تھے کہ وہ اپنے حلیفوں کے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ اس صلح نامے کے بعد بنو خزاعہ مسلمانوں کا حلیف بن گیا، یہ قبیلہ جناب عبد المطلب کے عہد سے بنو ہاشم کا حلیف تھا، یوں اس نے نئے حالات میں نبی اکرم ﷺ کو بنو ہاشم کا نمائندہ اور ترجمان مان لیا۔

صلح نامہ میں دس سال تک جنگ بندی کی دفعہ قریش کا اعترافِ شکست تھی، کیونکہ ہر بار جنگ کی ابتدا قریش کی طرف سے ہوئی تھی اور جنگ بندی کی دفعہ کے ذریعے انہوں نے اپنی شکست کا اعتراف کر لیا تھا اور یہ بات تسلیم کر لی تھی کہ وہ ایک طویل مدت تک جنگ کے قابل نہیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح میں مسلمانوں سے عمرے کا وعدہ کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی تصدیق کر دی۔ رسول کا خواب تو سچا تھا، حق تھا لیکن اس کے وقت کے تعین میں ان کا اندازہ صحیح نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کے عمرے کو اس کے دین کے غلبے کی علامت بنا کر دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا، سو اللہ کا کلمہ غالب آ کر رہا:

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ
الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ ۙ
لَا تَخَافُوْنَ ؕ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا

قَرِيبًا ○ هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا○ (۳)

یقیناً اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا کہ ان شاء اللہ تم امن وامان کے ساتھ مسجد الحرام میں داخل ہو گے، اپنے سر کے بال منڈواتے ہوئے اور کتراتے ہوئے، ہر خوف سے بے نیاز ہو کر اور تم جو نہیں جانتے وہ اللہ جانتا ہے، پس اس نے اس سے پہلے ایک قریب کی فتح عنایت کی۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا کہ وہ اسے ہر دین پر غالب کر دے اور اللہ (ان حقائق کی) شہادت کے لئے کافی ہے۔

اس فتح مبین، اس صلح نامے اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے غلبے، اور آنے والی فتوحات یعنی فتح خیبر اور فتح مکہ کا تعلق مسلمانوں کی اخلاقی تربیت، ان کے اخلاق اعلیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی رفاقت اور قربت سے ہے، سورۃ الفتح کا اختتام اسی نکتے پر ہوتا ہے۔ صلح نامۂ حدیبیہ کے مضمرات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمان جس ذہنی کیفیت سے گزرے تھے اس کا علاج رسول اللہ ﷺ کی رفاقت، ان کی معیت اور ان کے اتباع سے ہوا۔ یہ فتح اصحابِ محمد ﷺ کی ہو یہ فتح، ہر کامرانی ان کے تتبع کا نتیجہ تھی۔ حضور ﷺ کی اخلاقی تربیت نے انہیں اپنے اہل ایمان ساتھیوں کے لئے ریشم کی طرح نرم اور رزم حق و باطل میں کفر کے لئے فولاد بنا دیا تھا۔ ان کے رکوع و سجود نے اس زمین کو آسمان کی رفعتیں عطا کی تھیں۔ ان کے چہروں پر سجدوں کے چمکتے دمکتے نقوش میں ہر دور کے اہل ایمان کی عبادتوں کا حاصل نظر آتا تھا:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۫ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰةِ ۖۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ

۳۔ الفتح: ۲۷، ۲۸

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا○ (۴)

محمد رسول (ﷺ) اور ان کے ساتھی، کافروں پر (ان کے کفر کے سبب) سخت ہیں اور آپس میں رحیم ہیں، تم انہیں رکوع کرتے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے (اور عبادتوں کے ساتھ ساتھ) انہیں اللہ کے فضل کی جستجو میں مصروف پاؤ گے، سجدوں کے نشانات ان کے چہروں پر چمک رہے ہیں، جو ان کی شناخت ہیں ان کی یہ صفت تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی مثال یوں دی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل نکالی، پھر اس کو تقویت دی اور وہ گدرائی اور پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی، یہ کھیتی کاشت کرنے والے (اہل ایمان) کو خوش کرتی ہے اور کافر غصے میں جلنے بھننے لگتے ہیں، ان اہل ایمان اور نیک کام کرنے والوں کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔

صحابۂ کرام ایک دوسرے کے لئے جس طرح شفیق تھے اس شفقت کا تعلق بھی ان کے اس قلبی ملی اتحاد سے تھا جو ایمان کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا۔ چہروں پر آثار سجود سے مراد نیکی، حسنِ اخلاق اور نرمی ہے جو انسان کے باطن کی طرح اس کے چہرے کے نقوش کو بھی بدل دیتی ہے، اور ان اہل ایمان کو دیکھ کر آدمی کو خدا یاد آ جاتا ہے، کیونکہ ہمارا رب ہی ہر سعادت اور نیک بختی کا منبع ہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے یہ نشانات تورات وانجیل میں بیان کے جا چکے ہیں جو ان آسمانی کتابوں میں تحریف کرنے والوں نے گم کر دیئے۔ ایمان اور اہل ایمان کے لئے کھیتی کی مثال انجیل مقدس میں بھی موجود ہے۔ یہ ایمان میں اضافے کی بات ایک نامیاتی تمثیل ہے۔

۴۔ الفتح: ۲۹

فتح خیبر، حدیبیہ کی تکمیل

جیسا کہ سطورِ گزشتہ میں کہا گیا ہے کہ سورۃ الفتح میں جو "قریبی فتح" کی پیشین گوئی کی گئی ہے وہ خیبر کی فتح ہے اور اِس غزوے میں صرف اصحاب بیعتِ رضوان کو شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔

صلح حدیبیہ کے بعد قریش کی طرف سے پیش قدمی اور جارحیت کا کوئی امکان نہیں رہ گیا تھا، لیکن یہودیوں کی سازشوں کے امکانات حقیقی تھے اور ان کی گزشتہ تاریخ اس پر گواہ تھی۔ خیبر کی یہودی بستی مدینۂ منورہ سے بہت دور نہیں تھی۔ فاصلہ سو میل سے بھی کم۔ یہودیوں کے مخبر مدینہ اور مسلمانوں کی خبریں خیبر تک پہنچاتے رہتے تھے۔ یہی خیبر والے تھے جنہوں نے غزوۂ احزاب کے موقع پر مشرکوں کے گروہوں کو متحد کیا تھا اور انہیں مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ اب مدینے کی اسلامی ریاست کو ان کی سازشوں سے ہمیشہ کے لئے بچانے کا وقت آ گیا تھا۔ حدیبیہ سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی الحجہ کا مہینہ مدینۂ منورہ میں گزارا اور محرم کے ابتدائی دنوں کے بعد اپنے تقریباً پندرہ سو ساتھیوں کے ساتھ خیبر کا رخ کیا۔ یہ وہ ساتھی تھے جنہوں نے درخت کے نیچے اپنی زندگی کی قیمت پر راہِ حق میں جہاد کرنے پر بیعت کی تھی۔ جب نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ السلام خیبر کے لئے اپنے تقریباً پندرہ سو اصحاب کے ساتھ روانہ ہوئے تو وہ لوگ بھی شریک ہونے کے لئے بے تابی کا اظہار کرنے لگے جو عمرے کے لئے روانہ ہونے سے کنارہ کشی اختیار کر گئے تھے اور پیچھے رہ گئے تھے، کیونکہ اپنے تمام تر نفاق یا ایمان کی کمزوریوں کے باوجود وہ اس زبانی وعدے سے آگاہ تھے کہ وَعَدَکُمُ اللّٰہُ

مَغَانِمَ کَثِیرَۃً (۱) (اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ کیا ہے)۔ "پیچھے رہ جانے والے" ذوقِ جہاد سے سرشار ہو کر خیبر جانے کے لئے بے قرار نہ تھے بلکہ غنیمت میں حصہ دار بننے کے لیے، لیکن اسی سورۃ فتح میں ان لوگوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی دے دیا گیا تھا کہ ان لوگوں کو ساتھ نہ لینا۔

سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰی مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْکُمْ ج یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰہِ ط قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا کَذٰلِکُمْ قَالَ اللّٰہُ مِنْ قَبْلُ فَسَیَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ط بَلْ کَانُوْا لَا یَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا ○ (۲)

جب تم مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے جانے لگو گے تو یہ پیچھے رہ جانے والے تم سے کہیں گے کہ ہم کو بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کو بدل دیں۔ ان سے کہہ دینا کہ تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اللہ پہلے ہی یہ فرما چکا ہے۔ یہ (مخلفین) کہیں گے کہ تم لوگ ہم سے حسد کر رہے ہو۔ یہ لوگ حقیقت اور صحیح بات کو کم سمجھتے ہیں۔

زمانوں کا خالق یوں حقائق کو واضح کرنے کے لئے ماضی و حال کو ہم رشتہ فرما دیتا ہے۔ آنے والے واقعے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی حکم عطا کیا گیا۔ اور ان منافقوں کی ذہنیت کا اندازہ ان کے ردِعمل سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اجازت نہ ملنے پر کہا تو یہ کہا "تحسدوننا"۔ تم ہم سے حسد کرتے ہو، جلتے ہو۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے ساتھ ان کا یہ رویہ تو دوسری طرف وہ خیبر کے یہودیوں کو مدینہ کی ساری خبریں بھیج رہے تھے۔ عبداللہ بن اُبَی نے خیبر والوں کو پیغام بھیجا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ پندرہ سو ساتھی ہیں جو تمہاری طرف پیش قدمی کریں گے۔ ان کے پاس معمولی ہتھیار ہیں۔ تمہاری جمعیت ان سے کہیں زیادہ ہے۔ تمہارے ہتھیار بھی ان کے ہتھیاروں سے بہت بہتر ہیں۔ تم گھبرانا نہیں۔ شاید

۱۔ الفتح: ۲۰
۲۔ الفتح: ۱۵

مسلمانوں کی شامت ہی انہیں خیبر کی طرف بلا رہی ہے۔

یہودیوں نے اس اطلاع کے ملتے ہی بنی غطفان کے پاس اپنے ایلچی بھیج دیئے کہ وہ ان کے حلیف اور مسلمانوں کے دشمن تھے۔ انہیں یہ پیش کش بھی کی گئی کہ مسلمانوں پر غلبے کی صورت میں خیبر کی آدھی پیداوار ان کو دی جائے گی۔ بنی غطفان والے خیبر کے لئے نکل چکے تھے لیکن ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ ان کو اپنی بستی پر مسلمانوں کے حملے کا یقین ہو گیا اور وہ خیبر جانے سے رک گئے۔ بیشک اللہ کی تدبیر کافروں کی چال کو بے اثر بنا دیتی ہے۔

اہل ایمان کے سپہ سالار اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمان داری میں اسلامیوں کا لشکر رات کے وقت خیبر کے نواح میں پہنچ گیا۔ امن وصلح کا داعی اعظم کبھی رات کو کسی بستی کا رخ نہیں کرتا تھا، حملہ تو دور کی بات ہے۔ زندگی کا ہر پہلو اور معاملہ اخلاقیات کے تابع تھا۔ رات اللہ نے راحت اور سکون کے لئے بنائی ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقام پر مختلف سیاق وسباق میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳)

وہ صبح کو (اندھیرے سے) پھاڑ کر نکالنے والا ہے۔ اور اس نے رات کو آرام اور راحت کے لئے بنایا ہے اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے (اور حساب کے لئے بنایا ہے)۔ یہ قادر اور علم والے اللہ کی ٹھہرائی ہوئی بات ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۴)

وہی ہے جس نے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور دن تمہارے دیکھنے بھالنے (اور کام) کے لئے بنایا۔ بیشک اس بات میں سننے

۳۔ الانعام: ۹۶

۴۔ یونس: ۶۷

والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

جس ذات گرامی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ آیات نازل ہوئیں اس سے زیادہ اس حکمت الٰہی اور رات کے سکون کو اور کون جان سکتا تھا۔ پھر وہ رسول کس طرح رات کے سکون اور راحت کو جنگ کے ہنگامے میں بدل سکتا تھا۔ اور رات کے اس احترام کا رشتہ کائنات کے حساب سے جڑا ہوا ہے۔ رات کی راحت اور دن کی دیکھ بھال، ہماری اطاعت (سمع) سے ہم رشتہ ہے۔

اگلی صبح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی طرف پیش قدمی فرمائی اور خیبر کی بستی نظر آنے لگی تو آپ نے دعا فرمائی اور اس دعا میں یہ الفاظ بھی تھے

نسألك خير هذه القرية و خير اهلها و خير ما فيها (۴)

اے ہمارے رب! ہم تجھ سے اس بستی کی خیر اور اس بستی کے رہنے والوں کی خیر، اور جو کچھ اس بستی میں ہے اس کی خیر کا سوال کرتے ہیں۔

یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا عجب پہلو ہے جو جہاد کو ملک گیری سے ممیز کرتا ہے اور نبوت کی عظمت کا اشارہ ہے۔ یہ کیسا حملہ آور ہے جو اس بستی کے لئے دعائے خیر کر رہا ہے جس کو فتح کرنے آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کی کہکشاں دار ارقم اور شعب ابی طالب سے لے کر فتح مکہ اور طائف وحنین کے معرکوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے سالار کی قیادت میں ناعم، صعب، زبیر اور نزار کے قلعے فتح کر لیے۔ اس کے بعد مسلمانوں نے کتیبہ کے علاقے کا محاصرہ کر لیا۔ اس علاقے کے قلعوں کے یہود کے پاس رسد اور غلے کی کمی نہ تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر منجنیق نصب فرمانے کا ارادہ تھا۔ آپ کے اس ارادے نے یہود کو ہلا دیا اور انہیں اپنی مکمل تباہی اور شکست نظر آنے لگی تو انہوں نے صلح کے لئے سلسلہ جنبانی شروع کی۔ ابو الحقیق آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صلح کی شرائط طے ہوگئیں کہ یہودی فوجیوں کی جان بخشی کی جائے گی۔ ان کے بال بچوں کو لونڈی غلام نہیں بنایا جائے گا، یہود اپنے باغ، اپنی زمینیں، سونا چاندی، گھوڑے، زرہیں

۴۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۴۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کردیں گے اور صرف اتنا استعمالی اور گھریلو سامان اپنے ساتھ لے جائیں گے جو ان کی سواریوں پر آسکیں۔ یوں وہ خیبر سے جلاوطنی پر آمادہ ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرما دی کہ اگر یہود نے چھپ کر یا چوری سے سونا چاندی لے جانے کی کوشش کی تو اللہ اور رسول ان شرائطِ صلح سے بری الذمہ ہوں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شرائط صلح ماضی میں یہود کے برتاؤ، عہد شکنیوں اور سازشوں کے پیش نظر نہایت درجہ عادلانہ اور نرم تھیں۔ اللہ کے رسول نے ہر فتح کے موقعے پر انسانی زندگی کی حرمت کو اپنا آئین اور قانون بنا دیا، ہاں بدعہد اور فریب کرنے والوں کو سزا دی گئی اور اپنے اعمال کے نتیجے میں انہیں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔ صلحِ خیبر کے موقع پر ابوالحقیق کے دونوں بیٹے اپنی بدعہدی کی بھینٹ چڑھ گئے۔

خیبر کے یہود نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرتِ مدینہ کے بعد قریشِ مکہ کے پاس پہنچے تھے۔ انہیں لشکر کشی کے لئے مالی امداد فراہم کی اور حملے کی صورت میں دوسرے قبائل کے تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی انہوں نے سازشیں کیں اور مشرکین کے ساتھ شریکِ جنگ رہے اور غزوۂ خندق کے بعد بنوقریظہ کو جو سزا دی گئی تو ان کی اسی عہد شکنی کی وجہ سے۔ صلح حدیبیہ کے بعد صرف یہود ہی قیامِ امن کی راہ میں رکاوٹ تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کے ہمسایہ ملکوں میں اسلام کی تبلیغ کے لئے ضروری تھا کہ جنگ کے ہر امکان کو مٹا دیا جائے اور اس کے لئے عہد شکن یہود سے نجات حاصل کرنا لازم تھا۔

یہود کی سرکوبی صلح حدیبیہ کی تکمیل

اللہ پر توکل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی اساس تھا۔ خیبر والوں کے پاس دس ہزار فوجی جوان موجود تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں صرف اصحاب بیعتِ رضوان کو خیبر پر حملہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ لیا اور دشمن کی تعداد، اس کی طاقت اور اس کے قلعوں کے استحکام کو قابلِ توجہ نہ سمجھا کیونکہ اللہ تعالیٰ فتح اور ''مغانم کثیرۃ'' کا وعدہ فرما چکا تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں مسلمانوں نے دارِارقم اور شعب ابی طالب سے لے کر صلح حدیبیہ اور فتحِ خیبر تک کے سارے مراحل طے کرتے ہوئے اپنے دین کی بنیادوں کو سامنے رکھا اور یہ بنیادیں اللہ کی کبریائی کے اعلان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت تھیں، صحابۂ کرام کی زندگی کا ہر لمحہ لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی عملی شہادت سے عبارت تھا۔ یہ دونوں شہادتیں دراصل ایک ہی شہادت ہیں اور ان شہادتوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس درجے پر فائز کیا کہ وہ عالم انسانیت کو صلاۃ اور فلاح کی دعوت دے سکیں۔

حی علی الصلوۃ حی علی الفلاح

خیبر کی فتح کے بعد اب اس دعوت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ تاریخ کا دھارا اور فلاح و کامیابی کا ہر راستہ اسلام کے رخ پر مڑ چکا تھا۔ خیبر کی فتح کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی بڑی طاقتوں اور دوسری ریاستوں کے سربراہوں کو فلاح کے نظام

کو اپنانے کی دعوت دینے کا آغاز فرمایا۔ آپ کی رسالت اپنی تکمیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آپ کو مبعوث فرمانے والے نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کروایا تھا

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا مقصد وحدتِ آدم کو ایک بنیاد عطا کرنا تھا، اور یہ بنیاد اطاعتِ رب العالمین تھی۔ اس بنیاد کو زمین اور قوت کے ساتھ ساتھ اخلاقی اساس فراہم کرنا لازم تھا۔

خیبر کی فتح کے ساتھ ایک ایسا واقعہ بھی وابستہ ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی برتری اور عظمت اور آپ کی بے غرضی کی بے مثال مثال ہے۔ سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے آپ کی خدمتِ اقدس میں زہر آلود بکری بھیجی۔ اس کا منصوبہ نہایت سوچا سمجھا تھا۔ اس نے پہلے یہ معلوم کیا کہ آپ کو کون سا گوشت زیادہ مرغوب ہے۔ جب اسے یہ بات معلوم ہوگئی کہ دست کا گوشت آپ زیادہ رغبت سے نوش فرماتے ہیں تو اس نے بکری کے دست میں زہر بڑی مقدار میں جذب کر دیا۔ آپ نے دست کے گوشت کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھا مگر فوراً ہی تھوک دیا۔ گوشت کے اس ٹکڑے نے اپنے زہر آلود ہونے کی اطلاع آپ کو دے دی۔ زینب سے جب پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اقرار کر دیا اور شرمندہ ہونے کی جگہ یہ کہا۔

میں نے سوچا کہ آپ اگر اللہ کے نبی ہیں تو اللہ آپ کو خبر دیدے گا۔ یہ اپنے اطمینانِ قلب کے لئے تھا۔

یہ عذر مضحکہ خیز تھا مگر آپ نے اسے قبول کرتے ہوئے اسے معاف فرما دیا۔

بعض روایات کے مطابق اسے قتل کی سزا دی گئی، مگر آپ کو زہر دینے پر نہیں بلکہ حضرت بشیر بن براء نے اس بکری کے گوشت کا ایک نوالہ کھایا اور اس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ زینب کو ان کی موت کی وجہ سے یہ سزا دی گئی۔

۱۔ الاعراف: ۱۵۸

دعوت۔ حکمت اور موعظت کے ساتھ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد ہی سے بادشاہوں اور والیوں کے نام خطوط ارسال فرمانے شروع کر دیئے۔ یہ خطوط مدینہ کی اسلامی ریاست کے سربراہ کی جانب سے ان حکمرانوں کو بھیجے گئے جن کے علاقے اسلامی ریاست سے قریب تر تھے۔ اس مراسلت کو سرکاری حیثیت عطا کرنے کے لئے آپ نے ایک انگوٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ کندہ تھا۔ یہ لفظ تین سطروں میں نقش کیے گئے تھے۔ پہلی اور نچلی سطر میں محمد۔ درمیانی سطر میں رسول اور تیسری مگر سب سے اوپر والی سطر میں جو آنکھوں کے لئے پہلی سطر تھی اللہ۔ محمد کا لفظ آپ کی ذات اور شخصیت کا احاطہ کرتا ہے اور رسول کا لفظ آپ کے مرتبے کا اعلان کرتا تھا اور اس کے بعد اللہ کا لفظ اس ذات کو پیش کرتا ہے جس نے آپ کو اپنا رسول بنایا۔ یہ مہر ہی اس ریاست کی نوعیت اور ماہیت کا منشور تھی۔

اس مہر کو بنانے میں صحابۂ کرام کا مشورہ شامل تھا جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ رفیقانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کی سلطنتوں کے آداب اور حکمرانوں کے اندازِ فکر سے کس درجے باخبر تھے۔ حکمراں انہیں خطوط کو قابلِ التفات سمجھتے تھے جن پر مہر ثبت ہو۔ ان خطوط کو حکمرانوں تک پہنچانے کے لئے جن صحابۂ کرام کا انتخاب کیا گیا وہ فہم و دانش اور معاملہ فہمی میں ممتاز تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے اس نکتے پر بھی توجہ دی کہ جو قاصد جس علاقے میں بھیجا جائے وہ اس علاقے اور علاقے والوں کی زبان، تہذیب، اور طرزِ بود و باش سے خوب واقف ہو۔ اس بات کو بھی اہمیت دی گئی کہ قاصد خوش شکل اور خوش گفتار ہو اور اس کی

شخصیت اسلام کے جمال و جلال کا اشاریہ ہو۔ اپنی بات دوسروں تک نرمی سے مگر مرعوب ہوئے بغیر پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ خطوط صاف اور واضح اسلوب میں حق کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ خط زبان اور مفہوم دونوں کے اعتبار سے واضح ہیں۔ مفہوم واضح، صاف اور بے غبار۔ کہیں لفاظی اور غیر ضروری آرائش، دعوت و مفہوم کو دھندلاتی نہیں ہے۔ یہ خطوط حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی احادیث کی نمایاں صفات اپنے دامن میں رکھتے ہیں۔

ان خطوط میں مکتوب الیہ کے ذہنی اور دینی پس منظر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ مکتوب الیہ کو سچے راستے کی طرف بلایا گیا ہے مگر اس طرح کہ اس کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو، اور خط میں مشترک بنیاد (اگر کوئی ہو) پر زور دیا گیا ہے۔ عیسائی بادشاہوں اور علاقوں کے والیوں کے نام خطوط میں قرآنِ کریم کی اس آیت کو دعوت و تبلیغ کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (۱)

(اے رسول) آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! ایک ایسی منصفانہ بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر (اور مشترک) ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، اور نہ اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔ اور اگر (اس بات سے) منہ پھیر لیں تو آپ کہہ دیں کہ تم گواہ رہنا کہ ہم مسلم ہیں۔ کہ ہم (اللہ پرست اور معبودانِ باطل سے لاتعلق)

اس وقت جریج بن متی مصر کا حکمران تھا اور اس کا لقب مقوقس تھا۔ مقوقس کے نام سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر حضرت حاطب رضی اللہ عنہ دربارِ مقوقس میں گئے۔ یہ حکمران عیسائی تھا اسی لئے حضرت حاطبؓ نے اسے بتایا کہ اسلام کی دعوت کی سب سے شدید

۱۔ آل عمران: ۶۴

مخالفت مکۂ معظمہ کے قریش نے کی اور سب سے زیادہ سازشیں یہودِ مدینہ اور خیبر نے کیں، اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ نرمی کا اظہار نصاریٰ نے کیا۔ اسلام کے آغاز کے وقت ایک عیسائی عالم نوفل بن ورقہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی۔ اس پس منظر کے بیان نے مقوقس کے اندازِ فکر کو متاثر کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں ایک آنے والے رسول کا انتظار تھا اور وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کی تصدیق کرتی ہیں اور انسان کو پاک اور بہتر بنانا ان تعلیمات کا مقصود ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب گرامی اس دردمندی کا اظہار تھا جو ہر انسان کے لئے قلبِ نبوت میں موجود تھی۔ اسلام کی دعوت مقوقس کی سلامتی کے لئے تھی اور اس کو یہ یاد دلایا گیا تھا کہ اہلِ قبط کی سلامتی اور عافیت بھی اس کی ذمے داری ہے۔

سلام ہر اس ذات پر جو اسلام کی پیروی کرے۔ میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر آپ اسلام قبول کریں گے تو سلامتی آپ کا حصہ بنے گی اور آپ کا اجر دوگنا ہوگا، لیکن اگر آپ نے روگردانی کی تو اہل قبط کا گناہ بھی آپ کے سر ہوگا۔

اور مختصر دعوت کے بعد قرآن مجید کی وہی آیت پیش کی گئی، جو شاہِ حبش کے خط میں درج تھی۔ اللہ کی عبادت وہ مشترک بات تھی جو اس دعوت کا خلاصہ اور بنیادی نکتہ کہی جا سکتی ہے۔

شاہ مقوقس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کا اکرام کیا اور آپ ﷺ کے نام اپنے جوابی خط میں اس نے اعتراف کیا کہ ابھی ایک رسول کو آنا ہے، مگر وہ سمجھتا تھا کہ وہ رسول شام میں مبعوث ہوگا۔ مقوقس نے آپ کی خدمت میں دو کنیزیں بھیجیں۔ ان میں سے ایک حضرت ماریہ قبطیہ کے لئے آزادی اور اسلام کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ ام المومنین اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب زادے ابراہیم کی والدہ بننے کا شرف بھی مقدر تھا۔ رسول انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کے لئے بہترین اور برگزیدہ نفوس کو کس طرح جمع فرمایا اس پر غور کیجئے تو حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ساتھ حضرت بلال حبشی، سلمان فارسی اور صہیب رومی کے علوئے رتبہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

عیسائی حکمرانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختصر مکتوب تحریر کرائے کیونکہ وہ رسالت اور سلسلۂ وحی اور توحید سے واقف تھے لیکن شاہِ ایران خسرو پرویز کے نام آپ کے مکتوب گرامی میں اسلام کی بنیادی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

سلام اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور شہادت دے کہ صرف اللہ ہی عبادت کے لائق ہے، وہ واحد احد ہے۔ اس کی ربوبیت اور اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور میں تمام انسانوں کے لئے مبعوث کیا گیا ہوں۔ میں تمہیں اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ تم اسلام قبول کرو گے تو سلامتی پاؤ گے اور اگر تم نے انکار کیا تو اپنی رعایا کا بارِ گناہ تمہارے ذمے ہوگا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دعوتی خط آپ کی رسالت کی صداقت کے شاہد ہیں۔ ان میں ذاتی منفعت، شخصی برتری اور اپنی اہمیت کے اظہار کا شائبہ تک نہیں۔ اس میں مکتوب الیہ کی سلامتی کی تمنا کسی جذباتیت کے بغیر موجود ہے۔ ان کے انداز و اسلوب سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول اپنے فرضِ رسالت کی تکمیل کے لئے مکتوب الیہ سے بات کر رہا ہے۔ یہ بات بھی نمایاں ہے کہ لکھے ہوئے الفاظ میں گفتگو کا جوہر پوری طرح موجود ہے اور آپ کے یہ مکتوبات آپ کے خطبات کی ساری خوبیاں اپنے دامن میں رکھتے ہیں اور دعوت کا یہی انداز اللہ جل جلالہٗ نے تمام انبیا علیہم السلام کو تعلیم کیا ہے۔ یہ اندازِ دعوت رسولوں کا راستہ ہے اور تمام رسولوں اور خصوصاً نبیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ''اخلاق'' کا نمایاں جز اور اظہار ہے، کیونکہ کلام متکلم کی ذات و صفات، اخلاق و طرزِ زندگی کی علامت اور اشاریہ ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کی فصاحت معجزۂ نبوی ہے اور اس فصاحت کی ہم رکاب بلاغت جزوِ رسالت ہے۔ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں فصاحت و بلاغت کی خوبیاں بے حد تنوع رکھتی ہیں خواہ طویل جملے ہوں یا مختصر خطبات ہوں، یا مکاتیب، ادعیہ ہوں یا روزمرہ کی گفتگو، سوال و جواب ہوں یا مسلسل بیان، کلام نبوی کی بے مثال

جزالت، سلاست، نظمِ الفاظ، حسنِ ترکیب، یہ سب ہی ایسی خوبیاں ہیں جن کی نظیر بلا مبالغہ کسی دوسرے بشر کے ہاں موجود نہیں۔'' (۲)

یہ فصاحت و بلاغت افصح البشر صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ ہے اور اسی راستے پر صحابۂ کرام بھی چلے۔ آپ کے اخلاق کے دوسرے پہلوؤں کی طرح آپ کا اندازِ تبلیغ بھی آپ کے صحابہ کے کلام و بیان میں ملتا ہے۔ اخلاقِ نبوی کے ہر پہلو نے کس طرح انسانی قلوب اذہان کو متاثر کیا ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ط وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَO (۳)

آپ کہہ دیجیے کہ یہی میرا راستہ ہے۔ میں اور میرا اتباع کرنے والے پورے اعتماد اور بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔

دعوت الی اللہ کے مفہوم میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اپنی حاجات کے لئے صرف اپنے رب کو پکارنا ہے اور انسانوں کو اپنے رب کی طرف بلانا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (۴)

کہہ دیجیے کہ میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ مکتوبات ان تین صفات کا لفظی اظہار ہیں جو آپ کے اخلاق میں بہت نمایاں ہیں۔ حکمت، موعظت اور بہترین انداز۔ حکمت یہ ہے کہ گفتگو میں مخاطب کے ذہنی پس منظر کو سامنے رکھا جائے اور دوسرے شعبہ ہائے حیات میں موقع اور صورتِ حال کا لحاظ رکھا جائے، موعظت میں خیر خواہی کا مفہوم پوری طرح موجود ہے اور

سید عزیز الرحمٰن / خطابتِ نبوی ﷺ ۔ کراچی، زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷۷

یوسف: ۱۰۸

الجن: ۲۰

بہترین انداز میں عمل یا گفتگو کا سلیقہ۔ گفتگو یا تحریر میں نرم لہجہ بھی ''حسن'' کا درجہ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو نبی محترم علیہ السلام والصلوٰۃ نے نہایت درجے کاملیت کے ساتھ اپنایا اور آپ کے مکتوبات اس کے شاہد ہیں۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ O (۵)

اپنے رب کے راستے کی طرف انسانوں کو حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بہترین طریقے سے گفتگو کیجئے۔ یقیناً آپ کا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والوں سے خوب واقف ہے اور راہ پانے والے (ہدایت یافتہ) لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

۵۔ النحل: ۱۲۵

مدینۂ منورہ کا معاشرہ

اسلامی اجتماعی اخلاق کا منظر نامہ

سات برسوں کی اس کہانی میں مدینۂ منورہ کے معاشرے کو آپ نے وحی الٰہی اور تعلیمات ربانی کی بنیادوں پر تعمیر فرمایا۔ منافقوں سے قطع نظر انصار و مہاجرین کی انفرادی و اجتماعی زندگی ان اخلاقی اقدار کی زندہ مثال تھی جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو عطا کیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جن کی زندہ تجسیم تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی قبائے ذات کو اخلاق الٰہی کے رنگوں سے مزین فرمالیا تھا۔ مدینۂ منورہ میں اسلامی معاشرے کے تین ستون تھے:

کتاب، میزان اور حدید۔

قرآن حکیم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اور عالم انسانیت کو قیامت تک کے لئے زندگی کے اصول اور قوانین عطا کر دیئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی خود ایک میزان تھی۔ میزان عدل وقسط، توازن اور اعتدال کی میزان۔ مدینے کے معاشرے میں عدل وانصاف اس سطح پر قائم کیا گیا کہ یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات عدل اور قسط کے ساتھ قائم فرمائی ہے۔ نظام حیات انصاف اور عدل کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور یہ عدل معاشرے میں اجتماعی زندگی کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے اور انفرادی اور خاندانی زندگی میں بھی یہی عدل توازن برقرار رکھتا ہے۔

اور حدید سے مراد وہ قوت ہے جو معاشرے کی حفاظت کرتی ہے۔ ہر صحت مند اور

بالغ مسلمان مدینۂ منورہ میں اسلامی فوج کا سپاہی تھا۔

یہ قوت صرف فوج اور دفاع تک محدود نہ تھی بلکہ مدینے کا معاشرہ ایک وسعت پذیر معاشرہ تھا، جہاں زندگی کے مختلف شعبے صحت مند بنیادوں پر پروان چڑھ رہے تھے اور ہمہ گیر ترقی اور ضبط ونظم مشہود حقیقت بن گئے تھے۔ بازاروں میں مختلف تجارتیں ترقی کر رہی تھیں۔ تجارت کے ساتھ صنعت بھی اپنی جڑ پکڑ رہی تھی۔ ہر پیشہ اور ہر سرگرمی اسلام کے اصولوں اور مزاج کے تابع تھی۔

نظامِ عدل

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی احکام کو معاشرے میں نافذ فرمایا۔ آپ مدینے کی اسلامی ریاست کے سربراہ اور معاشرے کے سمت نما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب کی بنیاد پر معاشرے میں نظامِ عدل قائم فرمایا، کہ یہ مقصودِ رسالت تھا۔ ہر رسول کو اللہ تعالیٰ نے اسی لئے مبعوث فرمایا کہ وہ انسانی زندگی کو دانشِ نورانی سے محکم بنیادوں پر استوار کرے۔ تاکہ دنیا اپنے خالق کے نور سے جگمگا اٹھے۔ قرآن حکیم نے یہ بات مختلف سیاق وسباق میں بار بار بیان فرمائی ہے۔ قرآن حکیم (اور پہلے صحفِ سماوی) کے نزول کے مقاصد ان کتابوں کے مصنف جل جلالہٗ نے بیان فرما دیئے ہیں۔ تزکیہ نفس، اخلاق سازی، انسان سازی کے ساتھ ساتھ اپنے معاملات کو ربانی ہدایات کے مطابق چلانا۔ ہر انسانی قانون، اس قانون کے بنانے والے فرد یا طبقے کے مفاد کا تحفظ کرے گا۔ وہ قانون جو صرف کسی طبقے کے مفادات کے لئے نہ ہوں بلکہ ہر طبقے کے افراد کے مفادات کا یکساں تحفظ کریں، وہی ہو سکتے ہیں جن کا سر چشمہ وہ ذات ہو جس کے لئے ہر طبقہ اور فرد ایک سی حیثیت کا حامل ہو۔ ایک ایسی ذات جو ہر انسان کے ممکنات کی تکمیل کا سامان اپنے قانون کے ذریعے فراہم کرے، اور یہ ذات خالقِ کائنات کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔ اس ذاتِ باری نے نبیوں کو تبشیر اور تنذیر کے ساتھ بھیجا اور انہیں کتابیں اس لئے عطا کی گئیں کہ وہ لوگوں کے اختلافی معاملات کا فیصلہ ان کتابوں کے مطابق کریں۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ (۱)

اللہ نے انبیائے کرام کو مبشر اور منذر و نذیر بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں تاکہ لوگوں کے اختلافی معاملات کا فیصلہ ان کے مطابق کریں۔

آسمانی کتابیں اور خاص طور پر قرآنِ حکیم اس لئے نازل فرمایا گیا کہ انسانوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ انسانی دانش اور فہم زمان و مکاں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے مفادات کی اسیر ہے، اسی لئے قانون کا سرچشمہ ایسا ہو جو زمان و مکاں پر حاوی ہو اور انسان کے معاملات خود ساختہ مفادات کے تابع نہ ہوں۔ اللہ کی حکمت سے انکار کرنے والے خود اہلِ ایمان میں بھی ہو سکتے ہیں، اور یوں وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرتے رہے ہیں اور آج بھی کر رہے ہیں۔ (۲)

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَO (۲)

اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے (قوانین) کے مطابق حکم اور فیصلے نہ کریں وہی ظالم ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ربِ جلیل نے واشگاف انداز میں فرمایا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰکَ اللّٰهُ ط وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا (۳)

یقیناً ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ (اپنی) کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ آپ لوگوں میں اس کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے آپ کو سمجھایا ہے اور خیانت کرنے والوں کے طرف دار نہ ہو جائیں۔

۱۔ البقرہ: ۲۱۳

۲۔ المائدہ: ۴۵

۳۔ النساء: ۱۰۵

قرآنِ حکیم کی یہ آیت، آیاتِ محکمات میں داخل ہے اور اس کا مفہوم بہت واضح ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا گیا اب اس کا اطلاق مسلمان اولوالامر اور حکام پر ہوگا، وہ ہر مصلحت اور جانب داری سے بالاتر ہو کر انصاف کریں اور کسی رشتے ناتے کو خاطر میں نہ لائیں، لیکن اس آیت کا ایک تاریخی پس منظر ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے آپ کے سامنے ایک مقدمہ پیش کیا گیا جس میں ایک نام نہاد ''مسلمان'' اور ایک یہودی فریق تھے۔ بشر منافق نے ایک زرہ چرائی اور پھر مجبوراً اس نے وہ زرہ ایک یہودی کے گھر میں پھینک دی اور چوری کا الزام اس پر لگایا۔ اس مقدمے کے فیصلے کے لئے بشر نے دشمنِ اسلام اور ممتاز یہودی سردار کعب بن اشرف کا انتخاب کیا، کیونکہ اپنے نفاق کی وجہ سے منافق اللہ کے رسول سے کتراتے ہیں۔ اس نفاق کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ منافق اسلامی ریاست کے سربراہ کے دائرۂ اقتدار کو دل سے تسلیم نہیں کرتا تھا۔ لیکن یہودی جو مدینہ کا باشندہ تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کے انداز دیکھ چکا تھا اور آپ کی حق پسندی و حق شناسی کا قائل تھا۔ اس کے زور دینے پر یہ مقدمہ دربارِ رسالت میں پیش کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی رہنمائی فرمائی اور آپ حقیقت تک پہنچ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

بشر نے ایک نیا فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے یہودی سے کہا کہ چلو ہم اپنا مقدمہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کریں۔ اس کا خیال تھا کہ عمرؓ کافروں پر شدید ہیں اور وہ مجھے مسلمان سمجھتے ہوئے فیصلہ میرے حق میں دیں گے۔ دونوں حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہوئے اور مقدمہ ان کے سامنے پیش کیا۔ اپنے بیان میں یہودی نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بھی بتا دیا کہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم اس مقدمے کا فیصلہ اس کے حق میں کر چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے بشر سے دریافت کیا یہ بات سچ ہے؟ بشر کو اعتراف کرنا پڑا۔ حضرت عمرؓ اپنے گھر کے اندر گئے۔ نیام سے تلوار نکالی اور باہر آ کر بشر کی گردن اڑا دی۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے فیصلے کو تسلیم نہ کرنا، دراصل اسلامی ریاست کے خلاف بغاوت تھا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدل کو مدینے کے اسلامی معاشرے میں عام کرنے

اور اس کو مستحکم کرنے کے لئے اکابر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تربیت بھی فرمائی۔ انہیں عدل کے بنیادی اصولوں کی آگاہی عطا کی۔ اس بات کو ان کی فکر اور عمل کا حصہ بنادیا کہ انصاف کرتے وقت وہ اپنے ذاتی جذبات سے بلند تر ہوجائیں۔ اتنے بلند کہ کوئی رشتہ، کوئی تعلق انصاف کی راہ میں حائل نہ ہو۔ وہ فریقین کی بات پورے تحمل اور صبر اور دل سے سنیں اور شہادتوں پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رہنمائی تھی، لیکن آپ نے واضح فرمادیا کہ میں مقدمات کا فیصلہ شہادتوں، بیانات اور صورتِ حال کو دیکھ کر کرتا ہوں اور اگر کوئی غلط شہادت یا کسی کی چرب زبانی میرے فیصلے پر اثر انداز ہوجائے تو بھی حق دار کا حق قیامت تک باقی رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو ان کی صلاحیتوں اور اہلیت کے مطابق ذمے داریاں سونپی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت قرآن فہمی اور احادیث کی تفہیم اور علمِ قرآن وحدیث کو زندگی کے مسائل پر منطبق کرنے کی صلاحیت کو حاصل تھی۔ مدینے کے معاشرے میں تعلیم وتعلم کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ پہلی اسلامی یونیورسٹی بھی مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الف الف سلاما میں قائم کی گئی جس کے معلمِ اعظم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس درسگاہ میں ستر سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہمہ وقتی طالب علموں کا درجہ رکھتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ذوق اور فطری رجحان کے مطابق علم حاصل کرلیتا اصحابِ صُفّہ کے علاوہ دوسرے اکابر صحابہ زندگی کی مختلف سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ تفقہ فی الدین حاصل کرنے میں مصروف رہتے۔ یہ عملی سرگرمیاں ان پر زندگی کے مسائل وا کرتیں اور وہ ان مسائل کو معلمِ اعظم انسانیت کی رہنمائی میں حال کرتے چنانچہ بعض صحابہ کو اس باب میں دوسروں پر تفوق حاصل تھا اور انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فتویٰ دینے کی اجازت حاصل تھی۔ ان صحابۂ کرام میں خلفائے راشدین (ابوبکر وعمر، عثمان وحیدر) کے علاوہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت حذیفہ، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابوالدردا، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

عہدِ غلامی میں دینی اقتدار کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے دینی اصطلاحوں کے مفہوم

بدل جاتے ہیں اور وسعتیں تنگیوں میں بدل جاتی ہیں، جیسے برطانوی عہد میں قاضی، نکاح خواں ہوکر رہ گیا اور فتوے شادی، طلاق اور وراثت تک محدود ہوکر رہ گئے۔ اگر حقیقی اسلامی ریاست موجود ہوتو اس میں قاضی کا لقب عام جج سے لے کر عدالتِ عظمیٰ کے چیف جسٹس تک کے لئے استعمال ہوتا ہے اور فتویٰ محض رائے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ فیصلے کا درجہ رکھتا ہے۔

مدینۂ منورہ کے اسلامی معاشرے میں مقرر کردہ صحابہ لوگوں کے معاملات و مقدمات فیصل کرتے تھے اور ان کے فیصلوں کی اپیل سرورِ کائنات کی عدالتِ عظمیٰ میں کی جاتی تھی۔ یہی نظام خلفائے راشدین کے عہد میں وسیع ہوکر پوری ریاستِ اسلامیہ میں نافذ ہوا۔ خلیفۂ مسلمین کو انتظامی سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ سپریم جج کی حیثیت بھی حاصل تھی۔

آج ہمارے عہد میں انتظامیہ، مقننہ، ونظام انصاف اور فوج کی علیحدگی پر زور دیا جاتا ہے۔ آج کے انسان کی عقلِ حیلہ ساز، خودغرضی اور مفاد پرستی کے پیشِ نظر یہ ایسا کچھ غلط بھی نہیں ہے مگر مکمل علیحدگی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے ہاں دعویٰ تو یہی کیا جاتا ہے کہ عدلیہ آزاد ہے مگر عدلیہ کے اختیارات نافذہ کے بغیر یہ علیحدگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ حکومت اور انتظامیہ کا جبر عدالت کو بے بس بنا دیتا ہے۔ چور دروازے کھل جاتے ہیں، فوج وزیراعظم کو معزول کردیتی ہے اور آئین کو معطل اور یہ سب کچھ قانونِ ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔ عدالتِ عظمیٰ، اقتدار پر قابض فوجی آمر کی مرضی کے آگے جھک جاتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں مدینے کے معاشرے کو جو اخلاقی بنیاد عطا کی اس کی گہری چھاپ زندگی کے ہر شعبے پر نظر آتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول تھے، مدینہ کی مملکت کے سربراہ تھے، لیکن آپ نے اپنے لئے کوئی مراعات قبول نہیں کیں۔ یہی کیفیت خلفائے راشدین کے عہد میں برقرار رہی۔ انصاف کے سلسلے میں عام شہری اور خلیفہ کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ آج عدالت میں کسی صورت صدرِ مملکت کی حاضری کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا جب کہ کسی معاملے میں اگر خلیفۂ راشدین کو کوئی عام آدمی فریق بنالیتا تو خلیفہ اپنے آپ کو عدالت میں پیش کردیتا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات میں اپنے آپ کو اور عام شہری کو برابر سمجھا۔

اس سے زیادہ انصاف اور کیا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی اعرابی کا قرض تھا۔ اس نے بڑی سختی اور خاصی بے ادبی سے قرض کی ادائی کا مطالبہ کیا۔ صحابۂ کرام نے اسے ڈانٹا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخی کر رہے ہو۔ بدو نے کہا کہ میں تو اپنا حق مانگ رہا ہوں اور اگر اللہ کے رسول میرا حق مجھے نہیں دیں گے تو اور کون دے گا۔ عادلِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ تم لوگوں نے صاحبِ حق کا ساتھ کیوں نہیں دیا؟ پھر آپ نے حضرت خولہ بنتِ قیس سے کھجوریں قرض لے کر اس اعرابی کی کھجوروں کا قرض ادا کیا، اور اس کی تالیفِ قلب کے لئے قرض لی ہوئی کھجوروں کے وزن سے زیادہ کھجوریں دیں۔ یہ حیاتِ نبوی ﷺ کا ایک چھوٹا سا واقعہ ہے لیکن عدل وانصاف کی پوری تاریخ کیا ایسی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے دور میں سرکارِ ختمی مرتبت کے اسوۂ حسنہ اور عدل گستری کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھا اور یہ روایتِ عدل جاری رہی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے درمیان کھجور کے ایک درخت کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ حضرتِ عمرؓ نے اس قضیے کے فیصلے کے لئے ثالثی کی تجویز پیش کی۔ فریقین حضرتِ زید بن حارث کی ثالثی پر رضامند ہو گئے اور دونوں فریق حضرت زیدؓ کے گھر گئے۔ حضرت زیدؓ نے ان کا استقبال کیا اور پھر حضرت خلیفۃ المسلمین کو اپنے بستر کے سرہانے بیٹھنے کو کہا۔ حضرت عمرؓ نے بیٹھنے کی بجائے حضرتِ زیدؓ سے کہا کہ یہ پہلا ظلم ہے جو آپ نے مقدمے کی سماعت سے پہلے میرے مخالف کے ساتھ کیا ہے۔ میں کسی امتیازی سلوک کا حق دار نہیں۔ ہم دونوں فریق ایک ساتھ بیٹھیں گے۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھ گئے۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا۔ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے انکار کیا۔ اصولِ شہادت کے مطابق مدعی علیہ کے لئے قسم کھانی ضروری تھی۔ حضرت زیدؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے کہا کہ وہ امیر المومنین کو قسم کھانے کی زحمت نہ دیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ زید! یہ دوسرا ظلم ہے جو آپ میرے مخالف فریق پر کر رہے ہیں۔ اور آپ اچھے اور عادل قاضی اسی وقت بن سکتے ہیں جب عمرؓ اور ایک عام مسلمان میں کوئی فرق نہ کریں۔ اس بات کا حضرت ابن کعبؓ پر اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے

اپنا دعویٰ واپس لے لیا۔ عہدِ فاروقی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے میں عدل کا مستحکم ادارہ اور نظام قائم تھا اور اسی طرح نظامِ صلاۃ کے قیام کے لئے بھی عہدہ دار متعین کئے جاتے تھے۔ یہ بات صفحاتِ گزشتہ میں مختلف سیاق وسباق میں پیش کی جا چکی ہے کہ نظامِ صلاۃ اسلام کے مجموعی نظام کا استعارہ ہے۔ مسجدِ نبوی کے علاوہ مضافاتِ مدینہ کی مختلف مسجدوں کے لئے اعلیٰ صلاحیتوں والے امام مقرر کئے گئے تھے۔ یہ مسجدیں ضعیفوں اور بیماروں کے لئے ان کے رہائشی علاقوں میں ضروری تھیں۔ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں مدینہ منورہ میں کم وبیش نو مساجد تھیں۔ مسجد نبوی کے لئے دو موذن مقرر کئے گئے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن ام مکتومؓ۔ یہ موذن وقت کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف نمازوں کے لئے اذان دیتے تھے اور نمازِ عشاء کے لئے نمازیوں کے اجتماع کا مناسب حد تک انتظار کیا جاتا۔

نماز مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ اور نظم وضبط کا اشاریہ بھی ہے۔ نمازِ باجماعت میں صف بندی کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ صف میں لوگ برابر برابر کھڑے ہوں، ان کے درمیان خلا نہ ہو۔ صفوں کی درستی کے لئے افسر مقرر تھے۔ ان کے علاوہ کچھ عہدہ داران مسجد کا فریضہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کو مسجد میں شور وغل مچانے سے منع کریں۔ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ دیہاتوں سے آنے والے (اعرابی) معاشرتی آداب سے کم واقف تھے۔ اس باب میں ان کی تربیت ضروری تھی۔ سورۃ جمعہ مدنی آیت ہے اور اس حقیقت کی گواہ کہ بعض نمازی اپنے امامِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم ؐ چھوڑ کر بازار کے کھیل تماشے کی طرف مائل ہو جاتے۔

مسجد کی صفائی اور روشنی کے کام بھی مستقل تھے۔ تمام صحابہ کو مسجد نبوی عزیز تھی۔ لیکن ان صاحبان کی اپنی مصروفیات تھیں، اس لئے ان کاموں کے لئے مستقل عملے کی ضرورت تھی اور معاشرے کی شیرازہ بندی میں مسلمانوں کی وحدت واتحاد و تنظیم کے داعی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان باتوں کو بڑی اہمیت دی۔ مسجد اور نماز اسلام کے بنیادی ادارے ہیں۔ ہر نظام میں ادارے (Institutions) خارجی، مادی اور مشہود شکل رکھتے ہیں۔ اسلام ہر نظام سے

مختلف ہے۔ اس میں نماز بھی ادارہ ہے اور مسجد بھی ادارہ ہے۔ ایک غیر مادی اور روحانی ادارے (صلوٰۃ) کو ایک مادی اور مشہود ادارے مسجد کے ذریعے معاشرتی اور اجتماعی شکل دی گئی ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ وہ انسان کو فحش اور منکرات سے بچاتی ہے، یوں اخلاق کی تفسیر، نماز کا مقصد اور اس کی شناخت ہے۔ دوسری طرف نماز، انسان کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ کرتی ہے۔

مدینۂ منورہ کی شہری ریاست میں ''کاتب'' بھی اہم عہدہ دار تھے۔ کتابت کو اسلام اور اسلامی نظام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ''لکھنا'' اور ''پڑھنا'' دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے باہمی، بالخصوص تجارتی معاملات اور لین دین کو لکھ لیا کریں، اس میں قرض کے معاملات بھی شامل ہیں۔ وصیت کو بھی لکھ لینا، وصیت کے احکام کے نزول سے پہلے فرض قرار دیا گیا تھا۔ کاتبانِ وحی کو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سعادت آثار، سعادت نشان جماعت میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ کاتبانِ وحی کے علاوہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور بھی کاتب دوسرے کاموں کے لئے تھے۔ کائنات کا ذہین ترین انسان صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو مختلف منصب اور فرائض تفویض کرتے ہوئے ان کی صلاحیتوں کا پورا لحاظ رکھتا تھا۔ جو صحابۂ کرام مختلف قبیلوں کو زیادہ اچھی طرح جانتے تھے اور ان کی ضروریات سے بھی واقف تھے وہ افرادِ قبائل کے احوال لکھنے پر متعین تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ قبیلوں کے پانی کی ضروریات کا بھی حساب لکھتے تھے تاکہ چشموں اور کنوؤں کے پانی پر سب کے حقوق منصفانہ ہوں۔ ان محرروں میں حضرت زید بن ارقم اور حضرت ابو العلا بن عقبہ رضی اللہ عنہما شامل تھے۔ کچھ صحابۂ کرام اپنے ساتھیوں کے معاملات کی شرائط اور باہمی معاہدوں کو تحریری شکل دیتے تھے کہ یہ حکم قرآن حکیم کا تھا اور لوگوں میں جھگڑوں اور اختلافات کو روکنے کی ایک صورت تھی۔ ان شرائط اور معاملات کے مرتب کرنے والوں میں حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت حصین بن نمیر شامل تھے۔ یہ کاتب حضرات اموال و میراث کا حساب کتاب بھی لکھتے تھے۔ اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہوں اور حکمرانوں کو مکتوبات روانہ کئے تو کاتبوں کے انتخاب میں زیادہ سمجھدار اور بہتر خط رکھنے والے کاتب منتخب

کئے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط، معاہدوں اور دستاویزوں کی کتابت کرانے کے عمل سے اپنی ایک سنت آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کردی۔ اس سے ہمیں درس ملتا ہے کہ دستاویز اور مکتوبات واضح ہوں، ان میں کوئی ابہام نہ ہو، مکتوب الیہ (خطوط) اور فریقین (معاہدات) کا احترام کیا جائے، ان کے درمیان انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ ہمارے عہد کی ابلیسی سیاست اور خود غرضیاں ایسے معاہدات مرتب کراتی ہیں کہ بنائے فساد بنیں۔ حالیہ عالمی تاریخ اس پر شاہد ہے، فلسطین اور کشمیر اس کی بدترین مثالیں ہیں کہ مبہم اور ظالمانہ معاہدوں کے ذریعے فلسطینیوں کو بے زمین اور اپنے وطن میں اجنبی اور کشمیری مسلمانوں کو جبر و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ حالیہ اعداد و شمار (ابتدائے مارچ ۲۰۰۷ء) کے مطابق دس لاکھ مسلمان کشمیری خواتین کی عصمت دری کی گئی یا انہیں بیوگی کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہری ریاستِ مدینہ کے عمل دار اور حکام پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو زندگی کے مختلف شعبوں اور سرگرمیوں کو مرتب اور منظم کرنے والے عمل دار موجود تھے تو اسی کے ساتھ ساتھ ان پر نظر رکھنے والا اور ان کا محاسبہ کرنے والا عملہ بھی موجود تھا اور خفیہ ''پولیس'' بھی موجود تھی جو سرکاری حاکموں کی کارکردگی پر نظر رکھتی تھی۔ قرآن حکیم کے احکام میں یہ حکم اور ہدایت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ عہدے اہل لوگوں کے سپرد کئے جائیں اور لوگوں کا مال حاکموں تک غلط انداز سے نہ پہنچے (رشوت کا سدباب)۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے، دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ ''لعنت'' کا مفہوم وعید ہے اور وعید میں آخرت کے عذاب کے ساتھ ساتھ دنیاوی سزا بھی شامل ہے۔ مالِ حلال اور کسبِ حلال کے سلسلے میں انسان کا ضمیر سب سے سچا اور قوی محاسب ہے۔ خلفائے راشدین ان تحائف کو جو غیر ملکی سفیر دیتے تھے اور جو دوسرے حکمران بھیجتے تھے بیت المال میں داخل کردیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ تحفے اسلامی ملک کے سربراہ کو بھیجے گئے ہیں، ان کی ذات کو نہیں۔

اجتماعی مالیات میں اہتمام اور احتیاط کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس کا راست تعلق امانت اور دیانت سے ہے۔ وہ رسول جس کا رسالت سے پہلے کا تعارف امانت تھا، اسے اللہ

تعالیٰ نے جو دین عطا فرمایا اس میں امانت کو ایک بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ غزوۂ احد میں ایک مجاہد نے کوئی ادنیٰ سی چیز (غالباً رسی کا ٹکڑا یا جوتے کا تسمہ) لے لی اور پھر اس نے شہادت پائی تو اس ''چھوٹی سی'' خیانت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوگئی اور آپ نے فرمایا کہ میں اسے جہنم میں دیکھ رہا ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اللتبیہ رضی اللہ عنہ کو بنی سلیم کے محصولات کی وصولی کا عامل مقرر فرمایا۔ جب وہ واپس آئے تو انہوں نے وصول کردہ صدقات کے ایک حصے کے بارے میں کہا کہ مجھے ہدیہ کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم عامل نہ ہوتے تو کیا تمہیں یہ ہدیہ ملتا؟ یہ محصولات کا حصہ ہے اور اس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے (۴) نبی معظم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے عاملوں سے آمدنی اور اخراجات کا حساب لیتے تھے تاکہ عام مسلمان کو اس کا پورا حصہ ملے۔ آج ہمارا معاشرہ اس احساسِ دیانت سے محروم ہے۔ لوگوں کو ان کے عہدوں کی وجہ سے جو تحائف، آسانیاں اور روپیہ ملتا ہے، وہ اسے اپنا ''حق'' سمجھتے ہیں اور یوں اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔

حکام وعمال کے محاسبے کا ایک ایسا نظام عادلِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا جو آپ کی سنت کے طور پر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عملِ مسلسل بن گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جانشینوں نے اسلامی عبادات اور معاشرے میں امن وامان، انصاف اور معاملات کی درستگی کے تعلق کو واضح کر دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ اور ان کے بعد آنے والے دونوں سربراہانِ حکومتِ اسلامیہ حج کے موقع پر اطراف وجوانب سے آنے والے مسلمانوں سے ان کے حکام کی کارکردگی اور مختلف علاقوں کے عمومی حالات کے بارے میں سوالات کرتے تھے اور معلومات حاصل کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اکثر راتوں کو مدینۂ منورہ کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے تاکہ لوگوں کے حالات معلوم کر سکیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ بہت سے حکام تمام حالات صحیح طور پر دربارِ خلافت میں پیش نہیں کرتے۔ حضرت خلیفۂ ثانی نے اپنے اس عزم کا بھی اظہار فرمایا کہ وہ بشرطِ زندگی مصر، بحرین، کوفہ وبصرہ کا دورہ کریں

۴۔ بخاری: کتاب الاحکام۔ باب ھدایا العمال

گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کا بھی لحاظ کرتے تھے کہ حکام وعمال کے خلاف جھوٹی شکایتوں پر کوئی کاروائی نہ کی جائے۔

عدلیہ اور حکام وعمال کے محاسبے کے علاوہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق لوگوں اور پیشہ والوں کا محاسبہ بھی کیا جاتا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والے ادوار کے مسلمانوں کو اپنے طرزِ عمل سے یہ بتایا کہ کوئی پیشہ اور کوئی انسانی سرگرمی اخلاق کے ضابطوں سے الگ ہو کر معاشرے کی تکمیل وتعمیر صحیح خطوط پر نہیں کر سکتی۔ مدینۂ منورہ میں تجارت اور اس کا سلسلہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ مدینہ کے بازاروں میں غلہ کی منڈیاں تھیں، صراف سونے چاندی اور سکوں کے تبادلے کا کاروبار کر رہے تھے، چمڑے کی رنگائی اور چمڑے کی مصنوعات تیار ہو رہی تھیں، درزی کپڑے سی رہے تھے، کپڑے کی بنائی کی صنعت وجود میں آچکی تھی، پارچہ فروش کپڑے بیچ رہے تھے، بڑھئی اپنے کاروبار میں مصروف تھے، زندگی کی آسائشوں کے لئے بھی گنجائش پیدا ہو چکی تھی، عطر فروش خواتین، نسوانی زیورات بنانے والی خواتین اور حنا فروش عورتیں بھی اپنے اپنے دائرے میں تجارت کر رہی تھیں، عمار اور معمار بھی شہر کے پھیلاؤ کو حسن دے رہے تھے۔ یہ تمام تفصیلات علامہ شیخ عبدالحئی الکتانی کی تالیف التراتیب الاداریہ میں موجود ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ مولانا محمد ابراہیم فیضی سلمہٗ اللہ تعالیٰ ''نظامِ حکومت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے کر چکے ہیں۔ ہمارے قاری اس کتاب کے مطالعے سے نبی محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاست مدینہ اور اندازِ زیست کے بارے میں بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان معلومات کو اپنے طور پر ترتیب دے کر اس طرح مطالعہ کریں کہ عہد نبویؐ کا معاشرہ اپنے تمام اخلاقی پہلوؤں کے ساتھ ہمارے سامنے آسکے۔

علامہ خزاعی کی تالیف تخریج الدلالات السمعیہ اور شیخ الکتانی کی تالیف التراتیب الاداریہ کے بنیادی مصادر کتب احادیث ہیں۔ کتبِ احادیث کی وسعت، ہمہ گیری اور جامعیت ایک معجزے سے کم نہیں۔ جس طرح قرآن حکیم تاریخ کی کتاب نہیں ہے مگر اس کے مطالعے سے اقوامِ سابقہ کی عادات، رسوم اور معتقدات ہمارے سامنے آجاتے ہیں اور ہم ان قوموں کو ان کے مساکن میں رہتے، بستے اور اپنے اپنے انجام سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھ

لیتے ہیں، اسی طرح کتبِ احادیث میں ہمیں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابۂ کرام سخت حالات میں اور دشمنوں سے بھرے ہوئے معاشرے میں ایمان کی شمع روشن کرتے ہوئے، اپنی تعمیر کرتے ہوئے، اپنے کردار سے تاریخ کو بدلتے ہوئے، کفار معاشرے کے اندھیروں میں اضافہ کرتے ہوئے، اپنے بغض اور حسد سے شمعِ حق کو بجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اور منافق اپنی منافقت کے جالوں میں خود پھنستے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح مدینۂ منورہ کے اسلامی معاشرے کے خدوخال، سرگرمیاں، زندگی کے طریقے اور اہلِ ایمان کے شب و روز ان مجموعہ ہائے حدیث میں سند، صحت اور قطعیت کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ماحول اور اندازِ حیات کے مطالعے کے بغیر ان قدسی نفس انسانوں اور ان کے ہادی و رہبر صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد، آزمائشوں صبر، توکل، اعتماد علی اللہ، ادارہ سازی، معیشت اور عبادت و ریاضت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ ہمیں صحابۂ کرام مسجدِ نبوی میں عبادت کرتے ہوئے، صُفّہ کی درس گاہ میں علم حاصل کرتے ہوئے، مدینۂ منورہ کے باغات میں اپنے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تفریح کرتے ہوئے، اپنے مکانوں میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ ایک متوازن اور مثالی زندگی گزارتے ہوئے، اپنے بازاروں میں اس طرح وقت گزارتے ہوئے کہ دست بکار و دل بایار کا مفہوم ان کے طرزِ عمل سے آئینہ ہو جائے۔ احادیث کے مجموعے کتابوں، ابواب اور موضوعات کے اعتبار سے مرتب کئے گئے ہیں۔ ہمارے دور میں احادیث متعلقہ کی تلاش بہت مشکل کام نہیں، لیکن احادیث کا مطالعہ عہد نبوی کے لوگوں کے ذہن، اس عہد کے مختلف علوم اور زندگی کے مختلف شعبوں کی تفہیم اور ان کے لئے رہنما اصولوں کی تفتیش و تلاش کے لئے کرنا ایک تخلیقی عمل ہے۔

بخاری شریف کی کتاب البیوع میں مختلف تجارتی پیشوں اور سرگرمیوں کا ذکر ہمیں ملتا ہے۔ ایک صحابی جن کی کنیت ابوشعیب تھی، ان کا ایک غلام قصاب تھا۔ انہوں نے اپنے قصاب غلام سے کہا کہ "اتنا کھانا پکاؤ جو پانچ افراد کے لئے کافی ہو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھ چار اور ساتھیوں کو کھانے کی دعوت دی ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت ابوشعیب رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اگر تم اجازت دو تو وہ بھی شریکِ طعام ہو جائیں ورنہ واپس چلے جائیں۔ حضرت ابوشعیبؓ نے خوشی سے اجازت دی (۵) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاب ایک پیشے کا درجہ رکھتے تھے اور وہ کھانا بھی پکاتے تھے۔ کئی معاشرتی نکات بھی اس حدیث میں آ گئے۔ اگر کوئی زائد اور بن بلایا مہمان ہو تو میزبان کی اجازت ضروری ہے ورنہ وہ مہمان "چور" بن کر آئے گا اور "ڈاکو" بن کر لوٹے گا۔ مہمانوں کی تعداد کا جاننا میزبان کا حق ہے تاکہ اسے خفت اور مہمانوں کو پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

کتاب البیوح کے باب ۱۳۰۳ میں سناری کے پیشے کا تذکرہ ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذخر (ایک قسم کی گھاس) کو مدینۂ منورہ میں کاٹنے کی اجازت دی کہ وہ کاریگروں کے کام میں استعمال ہوتی تھی۔ اسی طرح حدیث سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ عہدِ جاہلیت میں لوہار کا کام کرتے تھے اور عاص بن وائل پر ان کی کچھ رقم نکلتی تھی۔ اس نے قرض کی ادائیگی سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار نہیں کرو گے میں تمہاری رقم نہیں دوں گا۔ اس حدیث سے یہ بات سامنے آئی کہ زندگی کے ہر محاذ اور ہر شعبے میں اسلام کی مخالفت کس طرح قریشِ مکہ کا طریقِ حیات بن گئی تھی۔ حضرت انس بن مالکؓ کی ایک حدیث میں اس دعوت کا ذکر ہے جس میں میزبان ایک درزی تھا اور اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں وہ شوربہ پیش کیا جس میں گوشت کے ساتھ لوکی بھی پڑی ہوئی تھی اور حضور نے لوکی کے قتلے بڑے شوق سے تناول فرمائے۔ اسی طرح بخاری کتاب البیوع میں کپڑا بننے والی خاتون اور بڑھئی کا بھی ذکر ہے اور مویشیوں کے تاجروں کا بھی۔ اسی طرح عطر فروش خواتین کا تذکرہ بھی کتبِ احادیث میں موجود ہے۔ ان تفصیلات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مدینۂ منورہ میں بازار بھی موجود تھے، بستیوں میں مختلف اشیائے ضرورت کی دکانیں بھی موجود تھیں اور اسی کے ساتھ ساتھ گھر گھر جا کر سودا فروخت کرنے کا رواج تھا، خاص طور پر خواتین کی ضرورت کی چیزیں خواتین بھی فروخت کرتی تھیں۔ یہ نئے بازار عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قائم ہوئے۔ "آزاد تجارت"

۵۔ بخاری: کتاب البیوع۔ باب ۱۲۹۶

جس کو اس عالم گیریت کے دور میں بڑی اہمیت ہے، لارڈ رسل کے قول کے مطابق اسلام ہ حطیہ ہے۔

مدینۂ منورہ کی مسلم آبادی میں بیشتر مہاجر تجارت پیشہ تھے جنہوں نے مدینے میں تجارت کو فروغ دیا اور تجارت کے وسیلے سے اللہ نے انہیں مالی آسودگی اور فارغ البالی عطا فرمائی۔ کتاب البیوع کے باب ۱۲۷۶ء میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی یہ حدیث ملتی ہے جو ان کی اور مہاجرین کی معاشی سرگرمیوں اور مواخاۃ کے بارے میں ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے فرمایا کہ جب ہم ہجرت کر کے مکۂ مکرمہ سے مدینۂ منورہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے اور سعد بن ربیعؓ انصاری کے درمیان مواخاۃ کرادی۔ سعد بن ربیعؓ نے مجھ سے کہا کہ میں انصار کے متمول ترین افراد میں سے ہوں۔ (مواخاۃ کے رشتے کی پاس داری کرتے ہوئے) میں اپنی آدھی دولت آپ کو دیتا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے آپ کو جو پسند ہو اسے میں طلاق دے دیتا ہوں۔ عدت کے بعد آپ اس سے نکاح کر لیں۔ (اپنے بھائی سعد بن ربیعؓ کی یہ باتیں سن کر میں نے کہا کہ) مجھے ان چیزوں کی الحمدللہ حاجت نہیں۔ آپ مجھے مدینہ میں کسی بازار کی نشاندہی کریں کہ میں کاروبار شروع کر سکوں۔ سعد بن ربیع (رضی اللہ عنہ) نے سوقِ بنو قینقاع کا نام لیا۔ میں گھی اور پنیر لایا اور پھر خرید و فروخت کے لئے بازار جانے لگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کے حق میں وسعت رزق کی دعا فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دعاؤں کی طرح اس دعا کو یوں قبول فرمایا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مٹی کو بھی ہاتھ لگاتے تو سونا بن جاتی۔ قرآنِ مجید کی تعلیمات اور اسوۂ رسول کریم کی پیروی میں حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور دوسرے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے انفاقِ فی سبیل اللہ کو اپنا شعار بنا لیا، جس کی انتہائی مثالوں کے طور پر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے اپنی ساری متاع کو اللہ کے راہ میں دینے اور ایک غریب صحابی کے اپنی ایک دن کی کمائی تھوڑی سی کھجوروں کو ایک غزوے کے چندے میں پیش کرنے کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں تیس ہزار خاندانوں کو غلامی سے آزاد کرایا۔ ایک اور موقع پر آپؓ نے اپنی ایک زمین چالیس ہزار

دینار میں فروخت کر کے اسے راہِ خدا میں تقسیم کر دیا اور امہات المومنین رضی اللہ عنہن کو ہدیتاً پیش کر دیا۔ اس موقع پر صحابۂ کرام کا انفاق فی سبیل اللہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ لیکن مدینۂ منورہ کے اسلامی معاشرے کی اس اقتصادی صورتِ حال کو پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آج کے مسلمان تجارت کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ آج سیاسی اور فوجی غلبہ معاشیات کی بنیادوں پر استوار ہے اور معاشیات کی اساس تجارت ہے۔ یہ تجارت، صنعت اور سائنسی ایجادوں سے پیوستہ اور منسلک ہے۔ اقوامِ عالم میں باعزت جگہ بنانے کے لئے معاشی ترقی اور بین الاقوامی تجارت میں آگے بڑھنا ناگزیر ہے۔ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ اخلاقیات کی ایک محکم بنیاد معاشی خوش حالی اور ترقی ہے اور تجارت اس کا وسیلہ ہے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم معاشی سرگرمیوں کو "معاشیات" ہی نہ سمجھیں بلکہ اسے "اقتصادیات" سمجھیں۔ غالباً اس نکتے پر سطورِ گزشتہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔ اقتصادیات میں میانہ روی اور اعتدال کا تصور بہت واضح ہے۔ اسلام انسان کو معاشی حیوان نہیں بنانا چاہتا بلکہ اسے اخلاقی وجود کے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے عام مسلمانوں کی معاشی صورتِ حال اور معیار کے مطابق زندگی بسر کی، بلکہ ان کی ضروریات کو اپنی ضرورتوں پر ترجیح دی اور ایثار سے کام لیا۔

تجارت کی قوموں کی زندگی میں کیا حیثیت ہے اس کا اندازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیثِ گرامی سے ہو سکتا ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے رزق کے نو حصے تجارت میں رکھے گئے ہیں اور ایک حصہ دوسرے تمام شعبوں میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تجارتی اصولوں کو پیش کیا جن پر آج کی معاشی زندگی کی اساس قائم ہے۔ یہ انسان کی بدنصیبی ہے کہ وحیٔ الٰہی اور سنتِ رسول سے رشتہ توڑ کر اس نے تجارت کو سود بنا دیا۔ ہمارے اس پیرایۂ اظہار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آج کی تجارت سود اساس ہے اور:

سود ایک کا، لاکھوں کے لئے مرگِ مناجات

آج کے گلوتراش تجارتی مقابلوں میں کسی اخلاقی ضابطے کا پاس نہیں کیا جاتا۔

سب سے اہم نکتہ تو ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ معاشرے اور صحابۂ

کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے اندازِ حیات اور طرزِ عمل سے اُبھر کر سامنے آتا ہے یہ ہے کہ اقتصادی سرگرمیوں کا مقصد قوموں اور افراد کی دنیوی زندگی کو سہل بنانا، اداروں کی تعمیر و تشکیل میں دولت کو صرف کرنا، معاشی طور پر کمزور افراد کے لئے ایسا نظام قائم کرنا ہے کہ وہ دست سوال بلند کئے بغیر باعزت زندگی گزار سکیں۔ امدادِ احتیاج مندوں کے لئے جو نظامِ کفالت (support system) سرکارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا وہ بیت المال تھا۔ آج ہمارے ہاں ایسے دولت مندوں اور صاحبانِ ثروت کی کمی نہیں جو زکوۃ کے علاوہ اپنی دولت کا خاصا بڑا حصہ صدقات پر صرف کرتے ہیں۔ مدرسوں، یتیم خانوں، بیواؤں کے مساکن کا قیام اور صحت کے بہت سے منصوبے ان کی زکاۃ و صدقات سے چلتے ہیں لیکن پورے عالم اسلام میں (support system) نظر نہیں آتا۔ یوں معاشی زیردستوں میں احساسِ کمتری پیدا ہوتا ہے۔ سماجی تحفظ کا نظام (social security system) آج مغرب میں ان کی بے انتہا کمزوریوں کے باوجود ہمارے لئے دعوتِ فکر و عمل ہے۔

اسلام کے اقتصادی نظام کا مقصد یہ تھا کہ افرادِ معاشرہ روٹی، کپڑے، مکان سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات کی نشو و نما کر سکیں۔ اسلام کا اقتصادی نظام ہر انسان کی کفالت کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا بلکہ ہر ذی حیات کی زندگی اور بقا کے لئے وسائل کی فراہمی کی ذمے داری قبول کرتا ہے۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا یہ قول وقت کے سمندر کی موجوں پر جیسے رک گیا ہے اور وقت کا سیلِ رواں اسے بہا کر فراموشی کے خلا میں نہیں پھینک سکا کہ اگر دجلہ کے کنارے کوئی اونٹ بھی بھوکا مر جائے تو اس کی ذمے داری عمر پر ہو گی۔

معاشی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان میں موجود حدت نے ہمارے مطالعے کے ارتکاز کو متاثر کیا ہے، لیکن اسلام کے اقتصادی نظام کی ہمہ گیریت کی وجہ سے ہم معذور تھے۔ آیئے تجارت کی اہمیت اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تجارت اور اقتصادیات کے تعلق پر ہم اپنے مطالعے کو آگے بڑھاتے ہیں، اور اس سلسلے میں آگے بڑھ کر یہ بھی دیکھیں گے کہ تجارت کو اخلاقِ انسانی کی بنیاد بنانے کے لئے دنیا کے سب سے عادل تاجر صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اقدام کئے۔

تجارت کے حدود، اس کے تقاضوں اور اللہ تعالیٰ سے اس سرگرمی کے رشتے کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ○ (٦)

اے ایمان والو! ایک دوسرے کے مال (آپس میں) ناجائز طریقے سے مت کھاؤ، ہاں البتہ کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو، اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے حق میں رحیم (اور بے حد مہربان) ہے۔

اس آیتِ مبارکہ کا تعلق تجارت سے ہے۔ اس لئے ناجائز طور پر ایک دوسرے کا مال کھانے سے مراد رشوت اور دوسرے ایسے ہی طریقے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اپنی تجارت میں ناجائز معاملات شامل نہ کرو مثلاً اسلام نے تجارت اور سود کو ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اسی طرح قمار بازی تجارت کا جزو نہ بننے پائے۔ آج قمار بازی اور جوئے کو تجارت کے رگ و ریشے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ پھر باہمی رضامندی تجارت کے لئے لازم ہے۔ اس باہمی رضامندی میں تجارتی شراکت اور ساجھے داری بھی شامل ہے۔ شراکت کی بنیاد ایمان داری، ایک دوسرے کے حق کی پاس داری اور محنت و سرمایہ کا توازن ہے۔ آج بدقسمتی سے مسلمانوں کے تجارتی ادارے باہمی عدم اعتماد کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اور باہمی معاہدوں کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ اس باب میں مسلمان خاص طور پر بدنام ہیں۔ تجارت کی ترقی کے لئے امن و امان اور مناسب فضا ناگزیر ہے اور اس شرط کے لئے لا تقتلوا انفسکم کے ذریعے ہمیں متوجہ کیا گیا ہے۔ قتلِ نفس سے مراد خودکشی بھی ہو سکتی ہے، مگر اس آیت میں اس کا محل نہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مال اور جان کی حرمت اور احترام کا سبق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

٦۔ النساء: ۲۹

معاشی سرگرمیوں اور خوش حالی کی جدو جہد کا مقصد اسلام میں یہ ہے کہ لوگ آسودگی کے لئے اللہ کی یاد، اطاعت وعبادت اور حقوق کی ادائیگی میں مصروف ہوسکیں۔ یہ ایک مشکل مرحلہ ہے۔ سورۃ الجمعہ مدنی سورۃ ہے اور اس تاریخی صورتِ حال کو پیش کرتی ہے کہ مدینہ منورہ میں ابتداً یہ صورت بھی پیش آئی کہ ایک بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمارہے تھے کہ ایک تجارتی قافلے کی آمد کی خبر سن کر بیشتر مصلی خرید وفروخت کے لئے باہر چلے گئے کہ کہیں مالِ تجارت ختم نہ ہوجائے۔ اس واقعے کے پس منظر میں رب العزت نے یہ بتایا ہے کہ اصل زادِ حیات اللہ کی قربت، اور تقویٰ ہے اور یہی مومن کا ''رزق'' ہے۔ معاشی سرگرمیوں کی اہمیت مسلّم مگر اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر ایمان ہی مومن کی شناخت ہے۔

وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْلَهْوَا ۨانْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (۷)

اور جب کوئی تجارتی سرگرمی (اور سودا بکتا ہوا) دیکھتے ہیں یا کوئی تماشا نظر آجاتا ہے تو اس کی طرف دوڑ جاتے ہیں اور آپ کو کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ کھیل اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب سے اچھا رزق پہنچانے والا ہے۔

اس بات پر ایمان لازم ہے کہ ہمارا رازق اور روزی رساں اللہ تعالیٰ ہے اور ہمارا رزق ہمیں مل کر رہے گا۔ پس اس اللہ کی اطاعت اور اس پر بھروسا ہی ہمارے رزق کو طیب اور بہتر بناتا ہے جس سے جسم کے ساتھ ساتھ ذات کی بھی پرورش ہوتی ہے۔ پھر یہی اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے کہ کوئی تجارت اور کوئی مالی منفعت انہیں ذکرِ الٰہی اور طاعتِ الٰہی سے غافل نہیں کرتی تھی۔ وہ اللہ کا ذکر کرتے، نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کے ذریعے معاشرے میں دولت کی گردش کو جاری رکھتے۔ دولت اور خواہشِ زر پر غالب آنے کے دو قوی محرکات تھے۔ ایک تو خیالِ عاقبت اور دوسرے اس بات پر یقین کہ اللہ جسے چاہے اور جتنا چاہے، عطا فرمائے۔ وہ انسانوں کو ان کے ظرف، ان کی ضرورت کے مطابق اور ان کو

۷۔ الجمعہ: ۱۱

آزمانے کے لئے جتنا چاہے دے۔ دولت بھی آزمائش کی ایک صورت ہے۔

رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (۸)

ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے، قیامِ صلاۃ سے اور ادائے زکاۃ سے غافل نہیں کرتی، اور جو اس دن سے ڈرتے ہیں جب (انسانوں کے) دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی (اس دن انہیں یقین ہوگا کہ) اللہ ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا اور اپنے فضل سے اور زیادہ عطا فرمائے گا۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب اور بے شمار رزق عطا فرماتا ہے۔

رزق کا تعلق اللہ تعالیٰ کے فضل سے قائم کر کے مسلمانوں کی اخلاقی تربیت کی گئی۔ خود رزق کو اللہ جل جلالہٗ کا فضل قرار دیا گیا۔ یوں اقتصادی جدو جہد اور سعی وکوشش عبادتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے لئے فریضہ بن گئی اور اسی کے ساتھ ساتھ آزمائش کا ایک حصہ۔ وہ آزمائش جو ہمارے رشتوں پر، ہمارے رہن سہن پر اور تمام مال ومتاع پر حاوی ہے۔ ماں باپ، بیوی بچے، تجارت، حصولِ مال کے دوسرے وسیلے، کوٹھیاں اور جائیدادیں یہ سب مومن کے راستے میں آزمائشوں کی طرح آتے ہیں اور کبھی کبھی تو اسے اللہ کے راستے میں جہاد اور جدو جہد سے روکتے ہیں۔ جب نفس کی یہ کیفیت ہوجائے تو صاحبِ ایمان کو عذابِ الٰہی کا انتظار کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ مسلمان کو ایمان اور اخلاص کے اس درجے پر دیکھنا چاہتا ہے جہاں وہ کہہ سکے کہ

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں، لا الٰہ اِلا اللہ

۸۔ النور: ۳۷، ۳۸

سورۃ التوبہ کی آیات ۲۳ اور ۲۴ پوری انسانی زندگی کے پس منظر، رشتہ و پیوند کے پھیلاؤ اور معاشی جدوجہد اور سرگرمیوں کے مقابلے میں مسلمان کی اس اخلاقی برتری کی منزل کا سراغ دیتی ہیں جس کو اس کے رب نے اس کے لئے مقدر کر دیا ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَ کُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ ط وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ O قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَ اَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ط وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ O (۹)

اے ایمان والو! اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان سے زیادہ عزیز رکھیں۔ تم میں سے جو ان سے محبت رکھے گا، وہی ظالموں اور گناہ گاروں میں سے ہوگا۔ آپ کہہ دیجیے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے کنبے والے اور تمہارے کمائے ہوئے اموال، اور وہ تجارت جس کے خسارے و کساد بازاری سے تم خوف زدہ ہوتے ہو اور تمہارے (وہ شان دار) مسکن جو تمہیں پسند ہیں، اور یہ تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں، تو تم انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ (اور عذاب) لے آئے، اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

قرآن مجید کی آیات، احادیثِ نبوی، سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے تجارت کے بنیادی اصول، مباحات اور منکرات اور پسندیدہ طرزِ

۹۔ التوبہ: ۲۳، ۲۴

عمل کی تفصیلات بڑی وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتی ہیں اور اس بارے میں کوئی اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ حرام اور حلال کی حدیں معین ہیں اور مسلمان کی زندگی کے اصول، تجارت کا بھی احاطہ کر لیتے ہیں۔ چند نکات مختصراً پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ اسلام نے تجارت اور سود کے درمیان جو فرق قائم کر دیا ہے، وہ ابدی ہے۔ سود کے مضمرات اور خراب عواقب و نتائج پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آج کے معاشی رجحانات اور سرگرمیاں قوموں کو کس طرح اپنی گرفت میں لے رہی ہیں اور فرد کی سطح پر امیری اور غریبی کا بڑھتا ہوا تفاوت سود کی پیداوار ہے۔ سود کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلاف جنگ قرار دیا۔ اس سلسلے میں سورۃ البقرۃ کی دو آیات کا حوالہ کافی ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ط ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط فَمَنْ جَآءَہٗ مَوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّہٖ فَانْتَھٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ط وَاَمْرُہٗٓ اِلَی اللّٰہِ ط وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ O یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ ج وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ O (۱۰)

وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں نہ کھڑے ہوں گے مگر اسی طرح جس طرح وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان کے مس (اور لمس) نے خبطی اور حواس باختہ بنا دیا ہو۔ اس لئے کہ یہ سود خور کہا کرتے تھے کہ تجارت بھی سود کی طرح ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ جو شخص اپنے پاس آئی ہوئی ربانی ہدایت سن کر رک گیا اس کے لئے وہ ہے جو گزرا اور اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے، اور جو پھر دوبارہ حرام کی طرف لوٹا وہ دوزخی ہے اور ایسے لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کسی

۱۰۔ البقرہ: ۲۷۵۔۲۷۶

ناشکرے اور گناہ گار سے محبت نہیں کرتا۔

۲۔ تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ کوئی فرد یا جماعت دوسرے کی مجبوری اور حالات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکے۔ الدین النصیحۃ۔ دین خیر خواہی کا نام ہے۔ ایک روایت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ بیچنے والا مالِ تجارت کا عیب نہ چھپائے اور دونوں ایک دوسرے کی خیر خواہی کو پیشِ نظر رکھیں۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی روایت کردہ حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص پر رحم کرتا ہے جو فروخت کرتے وقت، خریدتے وقت فیاضی اور وسعت سے کام لیتا ہے (۱۱) کہ یہ بھی خیر خواہی ہے۔

۳۔ جن چیزوں کا کھانا پینا اور استعمال حرام ہے ان کی تجارت بھی حرام ہے اور حرام چیز کی حرمت کی شدت کے پیشِ نظر تجارت کی حرمت میں بھی شدت ہوگی مثلاً شراب حرام ہے اور اس درجے کہ شراب کی کشید حرام ہے، اس کا لانا اور لے جانا حرام ہے، اس کا خریدنا اور بیچنا حرام ہے، جس دسترخوان پر شراب پی جا رہی ہو اس پر کھانا کھانا حرام ہے۔ اور یہ حرمت صرف شراب تک محدود نہیں بلکہ ہر نشہ آور چیز کی تجارت حرام ہے۔ افیون، گھانجا، بھنگ، چرس اور ہیروئن یہ سب اسی حکم کے تحت آتے ہیں۔

۴۔ چیزوں اور بالخصوص کھانے پینے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی ممنوع ہے، اور خاص طور پر اس غرض سے کہ کسی شئے تجارت کی کمی سے اس کی مانگ میں اضافہ ہو جائے اور اس کی من مانی قیمت ضرورت مند خریداروں سے وصول کی جائے۔ آج تجارت میں یہ چیزیں عام ہیں۔ آج بڑے تاجروں کے گروہ اور سنڈیکیٹ یوں ہی بازار پر اجارہ داری قائم کرتے ہیں اور اس طرح چھوٹی کمپنیوں کا دیوالیہ نکل جاتا ہے اور تجارت کے سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔

۵۔ ہر غیر اخلاقی طریقہ اور فیصلہ و تدبیر اسلام میں ممنوع ہے۔ یہ فہرست بہت طویل ہو جائے گی۔ چند باتیں مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہیں۔ اس بات کو شدید ناپسندیدہ

۱۱۔ بخاری۔ کتاب البیوع: رقم ۱۲۹۴

قرار دیا گیا ہے کہ تھوڑے سے مالی فائدے کے لئے تاجر قسمیں کھائیں اور جھوٹی قسم کا وبال تو ظاہر ہے۔ خرید و فروخت میں کسی قسم کے دھوکے کا دخل نہ ہو۔ یہ بات بھی دھوکے میں شامل ہے کہ اچھا اچھا مال اوپر رکھا جائے اور خراب مال نیچے چھپا دیا جائے، یا کسی مالِ تجارت کے وزن کو بڑھانے کے لئے پانی ڈال دیا جائے اور ناپ تول میں کمی تو ایسا جرم ہے کہ اقوامِ سابقہ میں سے بعض صفحۂ ہستی سے معدوم کر دی گئیں۔ یہ جرم کبائر میں داخل ہے۔ قرآنِ عظیم کی بہت سی آیات اس سلسلے میں شدید وعید کا درجہ رکھتی ہیں۔ سورۃ المطففین کا عنوان ہی اس جرم کی سنگینی کا مظہر ہے۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ O اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ O وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ O اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ O لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ O يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ O (۱۲)

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے، کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا ناپ (تول) لیتے ہیں اور جب انہیں دیتے ہیں تو کم ناپ تول کر دیتے ہیں۔ کیا انہیں اپنے مرنے کے بعد زندہ ہونے کا گمان نہیں، اس عظیم دن کے لیے، جب سارے انسان رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

قرآنِ عظیم نے واضح کر دیا ہے کہ ایسی حرکات میں تو وہی مبتلا ہوتے ہیں جنہیں یوم حساب کا یقین نہ ہو۔ یومِ جزا پر یقین رکھنے والا مسلمان ہرگز اس خبث میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ناپ تول میں کمی کرنے والوں کا ذکر تھا۔ اہلِ ایمان کو یہ حکم ایک مختصر آیت میں واضح ترین الفاظ میں دیا گیا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ O (۱۳)

انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو اور میزان میں کمی نہ کرو۔

۱۲۔ المطففین: ۱،۶

۱۳۔ الرحمٰن: ۹

یہ امتِ وسط کے لئے اس رب کا فرمان ہے، جس نے کائنات بالقسط پیدا کی ہے۔ جس کے میزانِ تکوین وخلق میں کہیں کوئی کمی بیشی نہیں۔ اور اس کا حکم اشیائے تجارت وخرید و فروخت تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر معاملے کو اپنے احاطے اور گھیرے میں لئے ہوئے ہے۔ اسلامی احکام کی وسعت کا اسی سے اندازہ کیجئے کہ ہر معاملہ اخلاقی اعتبار سے لین دین کا معاملہ ہے اور مسلمان کو حکم ہے کہ کہیں میزانِ عدل میں کجی نہ آنے پائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینے کے بازاروں میں ایسے عمال موجود اور متعین تھے جو اشیائے صرف کو تولا کرتے تھے اور ان کی اجرت بیچنے والے اور خریدنے والے ادا کرتے تھے۔ یہ ایک باقاعدہ منصب تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے عمال بھی تھے جو وزن کے باٹوں کی دیکھ بھال اور جانچ کرتے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ دوکاندار سودا فروخت کرتے ہوئے ہلکے باٹ استعمال کرتے ہوں اور خریدتے وقت بھاری باٹ استعمال کرتے ہوں، تاکہ دوسروں کو کم مقدار میں دیں اور خود زیادہ وزن میں چیز حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ اس بات پر بھی نگاہ رکھی جاتی تھی کہ ترازو درست ہوں اور دکاندار تولتے ہوئے ہیرا پھیری نہ کرسکے۔ اول تو عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دکاندار قرآن واحادیث کے احکام پر کارفرما تھے، لیکن ریاست کا فریضہ اپنی جگہ اہم ہے، اور آخری کتاب اور آخری رسول کو تو ہر دور کے لئے احکام عطا کرنے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکامِ تجارت عطا فرمائے اس میں تاجرانہ دیانت، ہمواری اور اعتدال کے ساتھ ساتھ تاجر اور خریدار دونوں کے حقوق کا ہی نہیں بلکہ دونوں کے تعلقات کی بہتری اور خلوص واعتدال کو بھی ملحوظ رکھا گیا۔ یہ حکم دیا گیا کہ کوئی اپنے بھائی کے دام پر دام نہ لگائے کہ کہیں یوں تاجرانہ رقابت میں اشیائے تجارت کی قیمت غیر ضروری طور پر نہ بڑھ جائے۔ اسی لئے اس بات کی بھی مخالفت کی گئی کے باہر سے آنے والے تجارتی قافلوں کی پیشوائی کے لئے خریدار بازار سے باہر جائیں۔ اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ آنے والوں کو بازار کے حقیقی نرخ معلوم ہوجائیں۔

اہلِ مدینہ کا پیشہ زراعت تھا۔ زراعت کے پانی کی تقسیم اور اس باب میں باہمی

برتاؤ کے بارے میں احکام دیئے گئے۔ اسی طرح زرعی پیداوار کی خرید وفروخت کو انتہائی عادلانہ قوانین کے تابع کیا گیا۔ یوں نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہری ریاست میں تجارت کو ذریعۂ معاش کے ساتھ ساتھ حصولِ جنت کا وسیلہ بھی بنایا گیا اور ارشاد ہوا کہ ایمان دار تاجر جنت میں انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کا ساتھی ہوگا۔

مدینۂ منورہ میں تفریحات

مدینۂ منورہ میں زندگی کا ہر گوشہ روشن اور تابناک تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہر ضروری، جائز، مستحسن اور سیرت ساز انسانی سرگرمی، دلچسپی، شغل اور تفریح کی مثال موجود ہے۔ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا معاشرہ قائم فرمایا جس نے انسانوں کے تمام تقاضوں، جبلتوں، ضرورتوں اور رجحانات کی آبیاری کی۔ اسلام نے انسان کی کسی صلاحیت، کسی جوہر، کسی تخلیقی میلان پر پابندی عائد نہیں کی بلکہ ان کی سمت کو تعمیر کی طرف موڑ دیا۔ جنگ وجدل کو قوانینِ الٰہی اور عدل کا جامہ عطا کیا، موسیقی کو ہوا و ہوس کی چاکری سے نکال کر خوش آوازی کو قرآنِ حکیم کی زینت کا سبب بنا دیا اور جائز حدود میں شعر خوانی سے وابستہ کر دیا، لہو ولعب کی پستی کو مردانہ کھیلوں کی شکل میں انسانی صحت کا وسیلہ اور جہاد کی تیاری میں بدل دیا۔ بازاروں میں اپنے آپ کو گم کرنے کی جگہ بازاروں کو حلال وطیب تجارت کا مرکز اور باہمی میل ملاقات کی جگہ بنا دیا اور اس طرح کہ مومن کے سامنے ہمیشہ یہ نکتہ رہے کہ تمہاری بستیوں کی بدترین جگہیں ان کے بازار اور بہترین جگہیں ان کی مساجد ہیں۔

جن لوگوں کی زندگی کا ہر لمحہ رضائے الٰہی کی کوشش سے عبارت تھا ان کی زندگیوں میں اپنے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں باغوں کی سیر اور سبزہ وگل کے سائے میں وقت گزاری بھی عبادت بن گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ تفریح یہ تھی کہ باغوں میں صحابۂ کرام کے ساتھ کچھ وقت گزاریں۔ درختوں کا سایہ، بہتا پانی، اصحابِ باصفا کا مجمع اور اس میں ذکرِ الٰہی۔ یوں جنت زمین پر اتر آتی۔ قرآن حکیم میں کتنے مقامات پر جنت باغوں کی شکل

میں نظر آتی ہے۔ ان آیات کو دہرانے کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ باغوں کی سیر اور دلچسپی کے وقت بھی اسلامی اسلوبِ حیات ہر ایک کے سامنے رہتا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تفریح کے اوقات کے بغیر یہ اسلوب پوری طرح ابھر نہیں سکتا تھا۔ دو صحابہ اگر کسی بڑے درخت سے اس طرح گزرتے کہ ایک دو ثانیے کے لئے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے تو پھر یکجا ہونے پر ایک دوسرے پر سلامتی بھیجتے۔ ''السلام علیکم'' ''وعلیکم السلام''۔ یوں ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کی خواہش اور بہی خواہی کی تمنا عام ہو کر اس معاشرے کو انسان کی جنت بنا دیتی ہے۔ نیت ہر عمل کی اساس ہے، مگر زبان سے اس کا اظہار ہمارے لئے مہمیز اور خود آمادگی کا وسیلہ ہے۔

مردانہ کھیل اور ان کے مقابلے معمارِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینۂ منورہ میں عام تھے۔ آج بھی مسجد نبوی کے نواح میں اور پاکستان ہاؤس نمبر ا کے سامنے مسجد سبق موجود ہے۔ یہاں وہ میدان تھا جہاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تیراندازی، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی مشق کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق تیراندازی سیکھنے کے بعد اس کی مشق جاری رکھنا لازم تھا۔ مشق چھوڑ دینا نافرمانی کا کام ہے کیونکہ صحیح صحیح نشانہ لینے کے لئے مشق ضروری ہے۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

> سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يَقُوْلُ مَنْ عَلِمَ الرَّمْيَ ثم تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا اَوْ قَدْ عَصٰى (۱)
>
> میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا کہ جس نے تیراندازی سیکھی اور اس کو چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں یا آپ نے فرمایا کہ اس نے نافرمانی کی۔

اس کو آپ نے معصیت اس بنیاد پر قرار دیا کہ اس نے تیراندازی کی ضرورت اور اہمیت کو جہاد کے سلسلے میں نہیں سمجھا۔ مردانہ کھیلوں کے ذریعے اپنی صحت کو برقرار رکھنا اور جہاد کے لئے تیار رہنا بھی اخلاقِ مسلم کی ایک شق ہے۔ اخلاق کی ہر شق اور اخلاق کا ہر شعبہ، اخلاقی نظام کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے اور اپنی صحت کو برقرار رکھنے کی کوشش مسلمان کے اخلاق کی ترقی

۱۔ مسلم بن حجاج، ابوالحسین/ الصحیح۔ بیروت، دارالکتب العلمیہ ۱۹۹۸: ج ۳، ص ۲۷۰، ۱۹۱۹

کا ایک سبب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قوی مومن کمزور (اور بیمار) مومن سے بہتر ہے۔

صحیح بخاری کی کتاب الجہاد میں حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیا سے ثنیۃ الوداع تک (جہاد کے لئے) تیار کئے ہوئے گھوڑوں کی دوڑ کرائی اور جو گھوڑے تیار نہیں کئے گئے تھے ان کی دوڑ ثنیۃ الوداع سے مسجدِ بنی زریق تک کرائی گئی۔ حضرت ابنِ عمرؓ اس گھڑ دوڑ کے شرکا میں سے ایک تھے۔ تیار گھوڑوں کی دوڑ کا فاصلہ پانچ چھ میل تھا۔

حسن و جمال کا خیال صحابۂ کرام گھوڑوں اور اسلحۂ جنگ کے سلسلے میں بھی کرتے تھے۔ اونٹ کی پشت کے چمڑے، رانگا اور لوہے سے تلواروں کی آرائش کی جاتی تھی۔ اس سے ہمیں یہ اخلاقی درس ملتا ہے کہ اپنی چیزوں کو اچھی حالت میں اور سجا سنوار کر رکھنا مسلمان کے اخلاق کا ایک جز ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پھر گھر کی صفائی اور اس کی ترتیب اور لباس کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کو پاک صاف رکھنا اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اپنے گھروں کے صحنوں کو صاف رکھنا مسلمان کا ایک وصف قرار دیا گیا ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتیں دراصل ''ماحولیات'' کا حصہ ہیں۔ آج ''ماحولیات'' کو ایک سائنس اور علم کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس کا آغاز قرآنی آیات اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کی سنت سے ہوتا ہے۔ مسجدِ اقصیٰ کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ جل جلالہ ہے کہ بٰرَکۡنَا حَوۡلَهٗ کہ ہم نے اس کے گردو پیش (اور ماحول) کو برکت عطا فرمائی ہے۔ جب معمارِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یثرب کو مدینۃ النبی بنایا تو آپ کے ابتدائی کاموں میں چراگاہوں کی تعمیر بھی تھی۔ غور کیجئے تو یہ بھی رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمۃ للعالمینی کا ایک پہلو تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں پر بھی حد درجہ شفیق تھے۔ جس طرح انسان اپنے گھر کے پرسکون ماحول میں بیوی بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر خوش ہوتا ہے، یا پھر مجمعِ یاراں میں دوستوں کی صحبت کھانے کو نیا ذائقہ عطا کرتی ہے اسی طرح مویشی کھلی اور وسیع چراگاہوں میں گھاس چر کر اور جھاڑیوں کے پتے چبا کر خوش ہوتے ہیں۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور صفاتِ حسنہ کا دائرہ کس طرح انسان اور اس دنیا کی زندگی پر محیط ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ بات جہاد، آلاتِ جنگ، مردانہ کھیلوں سے چراگاہوں تک پہنچ گئی۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ساری کائنات کس طرح ہم رشتہ ہے اور ہم جن باتوں کو بالکل الگ سمجھتے ہیں وہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

مدینۂ منورہ کی اجتماعی زندگی میں خواتین کا حصہ

مدینہ منورہ کی اس معاشرتی تصویر میں ہم نے اب تک خواتین کے کردار، معاشرے کی تزئین میں ان کے حصے اور ان کے حقوق کی بات نہیں کی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہر امتیاز، ہر حق مگر ہر فرض ہر حق میں مسلمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان مسابقت اور مقابلے کی جگہ ''رفاقت'' کا تصور اور حقیقت پیش کی ہے۔ مرد، عورت کا لباس ہے اور عورت مرد کا لباس۔ ان کے اشتراک کے بغیر معاشرے کی بنیادی اکائی (خاندان) وجود میں نہیں آسکتی۔ ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لئے تسلی اور تسکین کا درجہ رکھتا ہے۔ عورت ہی مکان کو گھر بناتی ہے اور در و دیوار کو محبت کا مفہوم عطا کرتی ہے۔ مرد کے اخلاق کی تعمیر میں اس کی رفاقت کو اساس کا درجہ حاصل ہے، اور عورت کا اخلاقی وجود مرد کے بغیر تکمیل نہیں پاسکتا۔

نبیِ اکرمؐ نے زندگی کے معاملے میں عورت کو اس کا جائز حصہ دلایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی ذہنی، دینی اور اخلاقی تربیت کا اس درجے خیال کیا کہ عورتوں کی تربیت اور تہذیب کے لئے آپ نے دن مخصوص فرما دیا تا کہ خواتین اپنے مسائل آپ کے سامنے پیش کر سکیں۔ حیا اسلامی نظام اخلاق کی ایک شق ہے اور اسی لئے آپ نے امہات المومنین کو فقہ اور اسلامی آداب و اخلاق میں اس درجے کامل کر دیا کہ خواتین اپنے مسائل امہات المومنین سے معلوم کر سکیں اور ان سے رہنمائی حاصل کر سکیں۔

''مسلم'' اور ''مومن'' کے عموم میں مسلم خواتین اور مومن عورتیں بھی آجاتی ہیں،

لیکن جہاں اخلاقی صفات کا ذکر کیا گیا ہے جیسے فرماں برداری اور اطاعت، صدق، صبر، خشوع، تصدیقِ حق و صداقت وہاں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالٰی کے کلام میں کوئی لفظ بلکہ حرف تک زائد نہیں۔ ہر لفظ مفہوم کو ابھار کر اہلِ ایمان کے سامنے پیش کرتا ہے کیونکہ قرآن حکیم کتابِ مبین ہے، حق و باطل کو الگ الگ کر دیتی ہے، کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی۔ زمانوں کے خالق کو معلوم تھا کہ حریت نسواں کی تحریک کس طرح ذہنوں اور زبانوں کو متاثر اور مسموم کرے گی۔ کس طرح صنفی تفریق و امتیاز (gender bias) کے مسائل پیدا ہوں گے۔ معاذ اللہ آج تو عورتیں اس پر بھی احتجاج کر رہی ہیں کہ خدا کے لئے He کا لفظ کیوں استعمال ہوتا ہے۔ ان عصری حقائق کے پیش نظر ایسے قرآنی بیانات کی اہمیت سامنے آتی ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ
وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ
وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ
وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ
وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا
عَظِیْمًا O (۱)

بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں، راست باز (اور صادق) مرد اور راست باز (اور سچی) عورتیں، صابر مرد اور صابر عورتیں، (اللہ کے حضور) عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، اور تصدق (خیرات) کرنے والے مرد اور تصدق کرنے والی عورتیں اور روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں اور اپنی (عصمت اور شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اور حفاظت کرنے والی

۱۔ الاحزاب: ۳۵

عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں ان اخلاقی صفات کا ذکر کیا گیا ہے جو افراد کے ساتھ ساتھ معاشرے کی تعمیر کرتی ہیں۔ ایمان اور فرماں برداری سے معاشرہ صبغۃ اللہ سے جگمگا اٹھتا ہے جس سے معاشرے میں استحکام اور برداشت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن قرآنِ حکیم نے بات یہیں پر ختم نہیں کردی کہ مسلمان مرد اور عورتیں ان صفات کی حامل اور مالک ہوتی ہیں بلکہ قرآن عظیم نے یہ بھی وضاحت کردی کہ مسلمان مردوں کے ساتھ مسلمان عورتیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں ایک دوسرے کے ساتھی اور رفیق ہوتے ہیں۔ اقامتِ صلاۃ کی جدو جہد میں مسلمان عورتیں بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اور ایتائے زکوٰۃ کے ذریعے معاشرے کی تعمیر کرتی ہیں۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (۱)

اور ایمان والے اور ایمان والیاں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ معروف (اور نیک باتوں) کا ایک دوسرے کو حکم دیتے ہیں اور منکرات (بری باتوں) سے منع کرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور ایتائے زکوٰۃ کو اپناتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ضرور ان پر رحمت فرمائے گا۔ بیشک اللہ صاحبِ اقتدار اور بڑی حکمت والا ہے۔

یہ ایک بڑا المیہ ہے کہ آج کی عورت اور بالخصوص مسلمان عورت دفتروں میں نوکری

۱۔ التوبہ: ۷۱

کرنے، سماجی تنظیموں میں کام کرنے کے نام پر دعوتیں کرنے اور تفریحی اجتماعات کے انعقاد کو حاصلِ حیات سمجھتے ہوئے معاشرے کی تعمیر سے غافل ہے۔

مدینۂ منورہ کی معاشرتی زندگی کا اعتدال خواتین کی ہمہ گیر سرگرمیوں اور دلچسپیوں کا مرہونِ منت تھا۔ امہات المومنین، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اور دوسری صحابیات نے غزوات میں شرکت کی۔ وہ مجاہدین کو پانی پلاتیں، ان کے زخموں کی دیکھ بھال کرتیں اور سامانِ جنگ کی رسد میں مدد کرتیں۔ حضرت رفیدہ رضی اللہ عنہا کا طبی کیمپ تو مسجدِ نبوی کے صحن میں قائم کیا جاتا۔

مدینۂ منورہ کی خواتین تجارت کی سرگرمیوں میں حصہ لیتیں۔ اسلامی معاشرے میں حیا کا تقاضا یہ تھا کہ خواتین کی ضرورت کی چیزیں خواتین فروخت کریں، سنگھار کی چیزیں اور عطر خواتین، خواتین ہی سے خریدتیں۔ خواتین کے لئے اسلام نے زینت کی مناسب صورتیں، ریشم اور سونا حلال قرار دیا ہے۔ نسوانی مزاج کے تمام تقاضوں کا اسلام نے پورا احترام کیا ہے، لیکن بہت زیادہ زیوروں کی ہمت افزائی نہیں کی گئی ہے کیونکہ حد سے بڑھی ہوئی زینت کا شوق انفاق کے جذبے کو کمزور کر دیتا ہے۔ روپے کا بہترین مصرف انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ صحابیات نے زیور کی محبت کو انفاق اور صدقات کے جذبے کے تحت رکھا اور اسے غالب نہیں ہونے دیا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز آبادی سے باہر ادا فرمائی۔ نماز کے بعد آپ عورتوں کے حصے کی طرف تشریف لے گئے اور انہیں صدقے کا حکم دیا۔ عورتوں نے اپنی بالیاں، خوشبو اور مشک کے ہار حکمِ رسالت پر صدقے میں دے دیئے۔ اس سلسلے کی دوسری حدیث میں یہ صراحت بھی ہے کہ عورتیں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے کپڑے میں (جو بچھا دیا گیا تھا) اپنی بالیاں اور انگوٹھیاں ڈالنے لگیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں جو انہوں نے اپنے ہادی، اپنے رسول اور اپنے زوج کے حکم پر صدقے میں دے دیں۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورت کے ہاتھ میں مہندی اور چوڑیاں پسند تھیں تاکہ عورت کے ہاتھ معلوم ہوں۔ ادنیٰ سے تامل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ ''تشابہ'' کا

معاملہ ہے۔ ''یہ نفسیاتی معکوسیت'' کا مسئلہ ہے۔ ہمارے عہد میں ایسے مرد ہیں جو نسوانی ادائیں ہی نہیں بلکہ نسوانی لباس بھی اختیار کر لیتے ہیں، اور اب تو ٹیلی وژن پر ایسے لوگوں کے پروگرام اور ''شو'' بڑے فخر کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح ایسی خواتین بھی ہیں جو مردوں کا سا لباس پہنتی ہیں، ان کی چال ڈھال اپناتی ہیں، ان کا طرزِ تکلم اختیار کرتی ہیں۔ اُس رسولِ اعظم نے جس کی رسالت کا عہد قیامِ قیامت تک ہے ان سب خطروں سے آگاہ فرمایا۔ آپ نے عورت کی نسائیت کا بھی تحفظ فرمایا۔ ''چوڑی'' اور ''مہندی'' کا معاملہ جو بظاہر کسی اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا، اس پس منظر میں کتنا اہم ہو جاتا ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کی چال ڈھال کو اپنانے والے مردوں پر، اور مردوں کی چال ڈھال اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت بھیجی ہے۔ (۲)

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ مدنی معاشرے میں خواتین کو تفریحات میں شرکت کے مواقع حاصل تھے۔ ایک مرتبہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حبشی بازی گروں کے کرتب دکھائے اور اس طرح کہ آپؓ اپنے حجرے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں کھڑی تھیں۔ تفریح کے نام پر اسلام مرد و عورت کے بے محابا سماجی میل جول اور اجتماع کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ ایسے اجتماعات زنا کے مقدمات ہیں اور فرقانِ مجید کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی۔ (۳)

پردے کی پابندی کے ساتھ خواتین کھیل کود میں بھی حصہ لے سکتی ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بار دوڑ لگائی۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام عورت کی ہر صلاحیت کو اپنے حدود میں پروان چڑھانے کی اجازت دیتا ہے تاکہ اس کی روحانی اور اخلاقی نشو و نما کے ساتھ ساتھ جسمانی ارتقا بھی ہو سکے۔

حقیقی تفریح اور انٹرٹینمنٹ کے لئے باہمی رفاقت، دوستی، خیر خواہی، فرصت

۲۔ ابوداؤد، سلیمان بن اشعث / السنن۔ بیروت، دار الفکر، ۱۹۹۴ء: ج ۴، ص ۶۷، رقم ۴۰۹۸

۳۔ بنی اسرائیل: ۳۲

لازمی شرائط ہیں۔ وقت وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے جو ہم ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ اگر زندگی کی نہج یہ ہو کہ میاں بیوی اپنے کاروبار، اپنی نوکریوں اور اپنی معاشی و ''معاشرتی'' سرگرمیوں سے ایک تھکا دینے والے دن کے بعد واپس آئیں تو وہ یہی کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح پیٹ کے دوزخ کو پُر کر کے تھکے ہارے سو جائیں۔ میاں کے پاس بیوی کے لئے، بیوی کے پاس میاں کے لئے اور دونوں کے پاس بچوں کے لئے کوئی وقت نہیں ہوگا۔ بچے ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے سہارے اپنا وقت گزار دیں گے اور آج کی لغتی دلچسپیوں میں گم ہو کر رہ جائیں گے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھروں کو اپنے انتہائی قیمتی وقت سے ان کا حصہ ان کو دیا۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو بال بچوں اور عزیزوں کو وقت دینا بھی ''انصاف'' کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضا ہے جو انسانی زندگی کو اخلاقی رنگوں سے مزین کرتا ہے۔ اور اس سب سے بڑے انسان کی ذمے داریوں پر غور کیجئے جس کو عالمِ انسانیت کے سامنے اللہ کا آخری پیغام پہنچانا تھا، اس کے حرف حرف پر عمل کر کے ہمیشہ کے لئے نمونہ پیش کرنا تھا، جہاد کے میدانوں میں حق کا دفاع کرنا تھا، دوستوں کے درمیان بیٹھ کر مجلسی زندگی کے آداب قائم کرنے تھے، عبادت و ریاضت کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا تھا، معمولات کی ادائیگی اور معاشرتی زندگی کے وسیلے سے انسانی تمدن کو فروغ عطا کرنا تھا۔ مختصر یہ کہ نبیٔ آخر الزماں کی زندگی کے پہلوؤں کا بیان وقت اور زندگی کا احاطہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت چاہتا ہے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام معمولات کے لئے وقت نکالنے کے ساتھ ساتھ گھر والوں کے حق کو پوری طرح ادا کیا۔ آپ ازواجِ مطہرات اور اپنی صاحب زادیوں اور ان کی اولادوں کو وقت دیتے، ان سے پیار کرتے، ان کی دلچسپیوں کا لحاظ کرتے۔ ازواجِ مطہرات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ انہیں قصہ کہانی تک سناتے۔ اس سے یہ بات ہمارے سامنے آتی کہ امہات المومنین کی زندگی میں ایسی گھڑیاں آتیں جب یہ سب حضورِ اکرم کے ساتھ ہوتیں۔ ان کے اوقات مقرر تھے اور ان اوقات کے ساتھ یک جا نشینی بھی ان کی زندگی کا حصہ تھی۔

یہ اس بات کا موقع نہیں کہ ہم قصے کی افادیت اور حقائق کے ابلاغ میں اس کی

اہمیت کا ذکر چھیڑیں۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے قصے بیان فرمائے ہیں اور سورۃ یوسف کو احسن القصص قرار دیا ہے۔ غار والوں کے قصے (کہف) میں کتنے عظیم حقائق بیان فرمائے گئے ہیں۔ احادیث میں کتنے ہی قصے موجود ہیں۔ قصہ، حقیقت کی ایک ایسی ترتیب کا نام ہے جس میں حقائق کے نشانات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات اپنی ازواجِ طاہرات کو ایک قصہ سنایا۔ کیسا عظیم تھا وہ سنانے والا اور کیسی بابرکت تھیں وہ سننے والیاں۔ امہات المومنین میں سے کسی نے یہ قصہ سن کر کہا کہ اس میں حیرت کے عناصر ہیں اور یہ تو حدیثِ خرافہ ہے۔ خرافہ ایک شخص تھا جو عہدِ جاہلیت میں کافی عرصے تک جنات کے ساتھ رہا اور پھر انسانوں کے درمیان واپس آکر عجیب وغریب کہانیاں اور واقعات انہیں سناتا تھا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھئے تو حدیث خرافہ کے معانی ہوئے حیرت انگیز باتیں۔ نظر بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ حکایت میں کوئی عجیب بات نہیں، لیکن امہات المومنین کے نزدیک یہ بات بھی عجیب تھی کہ عورتیں اپنے شوہروں پر بے تکلف تبصرہ کریں۔

اس کہانی میں کنائے اور اشاروں کا استعمال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر موضوعِ گفتگو اتنا ہی نازک ہو جیسا بیویوں کا اپنے شوہروں کا ذکر کرنا تو بیان میں لطیف اشاریت لازم ہے۔ اس کہانی میں بیویوں نے اپنے شوہروں کے مزاج اور عادات پر تبصرے کئے ہیں مگر بڑی بلاغت کے ساتھ، مگر یہ ذکر بھی امہات المومنین کے لئے تعجب کا باعث تھا۔ اس سے ان کی سادگی اور پاکیزہ نفسی ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس باب میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں جن میں خواتین کو بتایا گیا ہے کہ خلوت اور پردے کی باتیں ایک دوسرے سے نہ کریں اور اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو جائے تو اندازِ بیان حجاب جیسا ہو۔ وہ جس کا اخلاق ربِ العزت کی منشا اور رضا کے مطابق تشکیل پایا تھا، اس کے اخلاق کا عکس اس کے حلقۂ تربیت کے ہر گروہ، ہر فرد کی زندگی کو منور کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہما کی زندگی کا ہر باب اللہ کے رنگ سے سجا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ سادگی میں رہتی دنیا تک مسلمان عورت بلکہ دنیا کی ہر عورت کے لئے نمونہ ہیں۔ ان

کے پاس اور صحابیات کے پاس زیورات تھے مگر سونے چاندی کا مصرف ان کے نزدیک انہیں صدقے میں دے دینا تھا۔ حضرت فاطمہؓ کے سامنے ان کے کسی زیور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو انہوں نے فوراً صدقہ کر دیا، ان کا اصل کہنا تو ان کا حسنِ اخلاق تھا۔ حلال اور جائز چیزوں کے استعمال کی مسلم و مسلمہ کو اجازت ہے مگر محسن ومحسنہ کی دنیا ہی اور ہے۔ وہ حلال اور جائز پر نظر نہیں رکھتے بلکہ اپنے رب کی مرضی کو عزیز جانتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک ریشمی صدری تھی جس پر غالباً کام بھی بنا ہوا تھا۔ مدینے کی اکثر شادیوں میں دلہن والے اس صدری کو دلہن کے لئے مستعار لے جاتے تھے۔ اس میں حصولِ برکت کے علاوہ مدنی معاشرے کی سادگی کو بھی دخل تھا۔

کنیزوں اور گھر میں کام کرنے والیوں کے ساتھ صحابیات کا تعلق بہنوں جیسا تھا۔ مالکہ اور خادمہ مل جل کر کام کرتیں، ایک ساتھ کھانا کھاتیں، عمر میں اگر خادمہ بڑی ہوتیں تو اپنی مالکہ کو مفید مشورے دیتیں۔ مشاورت کا عمل ہر سطح پر جاری تھا۔ کسی معاشرے کے عمومی اخلاقی رجحانات اور کیفیت کے تعین اور تفہیم کے لئے یہ ساری باتیں اہم ہیں۔ اس سلسلے کی اہم ترین اور اساسی بات یہ ہے کہ کسی معاشرے کے اخلاق کا اندازہ کسی ایک طبقے یا اس کے بہترین اور چنے ہوئے افراد سے نہیں کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ معاشرے میں ہر فرد، معاشرے کے مزاج کا پیمانہ تھا۔ اسی بات کا ایک پہلو افرادِ معاشرہ کی مساوات ہے۔ اسی لئے اگر مسلمان کنیز بھی کسی کو پناہ دے دیتی تو اس پناہ کو سب کی طرف سے سمجھا جاتا اور پناہ یافتہ شخص محفوظ و مامون ہو جاتا۔ عورت کو اجتماعی زندگی میں یہ حیثیت کسی دور میں کسی بھی مذہب یا معاشرے نے عطا نہیں کی تھی۔

اس سلسلے میں اس نکتے کو بھی سامنے رکھئے کہ کتنے ہی معاشرتی احکام عورتوں کے اکرام اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لئے آئے۔ بہتان کی حد، گھروں میں داخلے کے آداب، نگاہوں کی نگہداشت، آزادانہ اختلاط کی ممانعت یہ سارے احکام عورت کی سربلندی اور اس کی شخصیت کی نشوونما سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس مرحلے پر اسلامی نظام کی ایک خصوصیت کا ذکر کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے جو صرف

اسلام کا امتیاز ہے اور دنیا کا کوئی نظام اور کوئی مذہب اس کا حریف نہیں۔ اسلام ہر برائی کی اخلاقی بنیادوں پر نشان دہی کرتا ہے۔ ہر برائی گناہ ہے، چھوٹا یا بڑا اور اس سے انسانی معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ پھر سنگین تر برائی کو ''جرم'' قرار دیا جاتا ہے اور اس پر حد جاری ہوتی ہے یا تعزیر، اور حد کے بغیر بھی اس برائی کے نتائج و عواقب کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ گناہ یا جرم کسی معاشرتی اور اجتماعی ناہمواری اور فساد کا سبب بنتا ہے اور اس سے دوسروں کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔ اسلام اس پہلو کی طرف سب سے پہلے مسلمانوں کو متوجہ کرتا ہے۔ وہ ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم گناہ (اور جرم) کے اخلاقی پہلو پر غور کریں اس کے بعد قانونی پہلو یا سزا کی نوبت آتی ہے۔ نفسِ انسانی کا ارتقا اسلام کو مطلوب ہے۔ ان معاشرتی قوانین اور ضوابط کا، جو عورتوں سے متعلق ہیں، مقصود یہ ہے کہ معاشرے میں کسی سطح پر شک وشبہ اور غلط گمانی کا امکان پیدا نہ ہو، اور انسانی نسب محفوظ رہے۔ تمام گناہوں اور برائیوں (جو جرم بھی ہیں) سے روکتے ہوئے قرآنِ حکیم یہ فرماتا ہے کہ یہ احکام اس لئے دئے جا رہے ہیں تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ تا کہ تم فلاح پا سکو، تا کہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو۔ اور تقویٰ نام ہے خوفِ الٰہی، ضبطِ نفس، اور خود احتسابی کی بنیاد پر ان مضر باتوں سے اجتناب کا جو انسانی ذات کے امکانات کی تکمیل کے راستے میں حائل ہوں۔ وہ سود جسے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا گیا اور اس کے بارے میں ابتداً ارشاد ہوا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O (۴)

اے ایمان والو! بڑھا چڑھا کر سود نہ کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پا سکو۔

''بڑھا چڑھا کر'' اس لئے نہیں فرمایا گیا کہ سودِ مفرد، جائز ہے بلکہ یہ بات غزوۂ اُحد کے پس منظر میں بیان کی گئی کہ جس میں مال و دولتِ دنیا کے لالچ میں تیر اندازوں نے ٹھکانا چھوڑ دیا تھا۔ حُبِّ دنیا، دل کا بہت بڑا روگ ہے اور سود اسی روگ کی پیداوار ہے۔

۴۔ آلِ عمران: ۱۳۰

یہ اخلاقی برائیاں (اور جرائم) ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں۔ شراب جوئے پر اور جوا شراب پر اکساتا ہے۔ اتفاقات سے دولت کمانے کے کھیل، پانسہ اور فال یہ سب ایک دوسرے کے مدد و معاون ہیں اور آج بھی آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے ہر برائی کس طرح دوسری برائی کو پروان چڑھاتی ہے۔ عالمی عیاشی کے اڈوں میں یہ سب جرائم ایک ساتھ مل کر آدمی کو اپنے آپ سے بے گانہ بناتے ہیں۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ O (۵)

اے ایمان والو! بے شک شراب اور جوا اور بتوں کے آستانے اور پانسے (فال نکالنے کے پانسے کے تیر) یہ شیطان کے گندے کھیل ہیں۔ پس ان سے بچتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔

اور اگلی ہی آیت (آیت نمبر ۹۱) میں ان شیطانی کھیلوں کے نقصانات کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے۔ شراب اور جوئے سے آدمی اپنے آپ ہی سے دور نہیں ہو جاتا بلکہ ایک دوسرے سے لڑنے لگتا ہے، دشمنی پروان چڑھتی ہے۔ اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس کی واضح نشانی یہ ہے کہ یہ گندے شیطانی کام اسے نماز سے روک دیتے ہیں۔

اسلام کے اخلاقی احکام فلاح حاصل کرنے کا راستہ ہیں۔ ان احکام کے ذریعے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جماعتِ مسلمین پر رحم کیا جائے اور وہ تقوے کے اس مرتبے پر فائز ہوں یہ دوسروں کی رہنمائی کر سکیں۔

۵۔ المائدہ: ۹۰

مدنی معاشرے کے دوسرے پہلو اور اخلاقیات

مدینہ منورہ کی شہری ریاست میں بازار میں کس طرح تجارت کو اجتماعی اخلاق کے سنوارنے کا ذریعہ بنایا گیا اور گھریلو زندگی میں کس طرح اخلاقِ حسنہ کو فروغ حاصل تھا، صفحات گزشتہ میں اس کا سرسری خاکہ پیش کیا گیا۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرام کے ساتھ باغوں میں تفریح کے لئے جاتے تھے اور اس ''تفریح'' کو بھی تربیتِ اخلاق کے لئے استعمال کیا جاتا۔ اخلاق تو اس کُل کا نام ہے جسے ہم انسانی زندگی کہتے ہیں اور زندگی کے ہر شعبے میں اخلاق رچا بسا ہوتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ اخلاق ایک اوپری چیز ہے۔ اخلاق اعمالِ صالحہ کا جز ہے اور اچھے اعمال اخلاق کے پرتو سے جگمگاتے ہیں۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چال بھی آپ کے اخلاق کے اظہار کا ایک رُخ تھی اور صحابۂ کرام آپ کی وضع کی طرح آپ کی چال کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی رفتار بھی آپ کی نبوت کی ایک ظاہری شہادت تھی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق آپ یوں چلتے جیسے زمین آپ کے لئے لپیٹی جا رہی ہو اور ہم صحابۂ کرام آپ کے ساتھ چلنے میں مشقت کے عمل سے گزرتے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ آدمی کی رفتار اور چال بھی اسے جہاد، جدوجہد اور مشقت کے لئے تیار رکھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کا انداز یہ تھا کہ جیسے آپ بلندی سے اُتر رہے ہوں، یعنی آپ کے چلنے میں ہلکا سا جھکاؤ ہوتا تھا جو تواضع کی نشانی اور علامت ہے۔ اکڑ کر چلنا تکبر اور شیخی کی علامت ہے، بالکل اسی طرح جیسے چیخ کر، اور چلا کر بات کرنا۔ اس کائنات کا نظام اور یہ کارخانۂ قدرت ہر قدم پر ہر

باب میں میانہ روی کا مطالبہ کرتا ہے۔ میر تقی میر نے اس کائنات کی ''نزاکت'' اور احتیاط و اعتدال کو کس حُسن کے ساتھ پیش کیا ہے

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ہمیں اس زمین پر اور اس دنیا میں میانہ روی کو اپنانا ہے اور انگریزی کے محاورے کے مطابق اس طرح نہیں رہنا ہے جیسے شیشے اور چینی کے برتنوں کی دوکان میں کوئی بیل گھس آئے۔

Bull in a china shop

سورۂ لقمان میں ارشاد ہوتا ہے (حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت فرما رہے ہیں)

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ O وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ O (۱)

لوگوں کے سامنے (اور ان کی تذلیل کے لئے) اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اترا کر نہ چل۔ کسی متکبر اور شیخی خورے کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔ اپنی رفتار اور چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ۔ یقیناً آوازوں میں بدترین آواز گدھے کی آواز ہے۔

جس طرح انسانی جسم ایک وحدت ہے اور مختلف اعضا کے اعمال ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی رکھتے ہیں، اسی طرح اخلاق بھی ایک وحدت ہے کہ ایک عمل دوسرے عمل کی تصدیق کرتا ہے۔ آج کل اخباروں اور برقی ذرائع ابلاغ پر ایک اصطلاح کا چلن اور رواج ہے ''body language'' یعنی حرکات و سکنات ایک زبان کا درجہ رکھتی ہیں۔

باڈی لینگویج سے معلوم ہوتا ہے کہ وزیرِ اطلاعات جھوٹ بول رہے ہیں
باڈی لینگویج سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ میچ فکسڈ (نورا کشتی۔ طے شدہ) تھا

۱۔ لقمان: ۱۸، ۱۹

''گال کو پھلانا'' اور ''اترا کر چلنا'' بھی جسم کی زبان کا درجہ رکھتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے سورۃ لقمان کی ان آیات میں حرکاتِ جسمانی کی زبان کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو زبان کے اس مشہور مصرع میں بھی یہی حقیقت پیش کی گئی ہے۔

تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

''جسم کی زبان'' دراصل ذہن، روح اور پوری انسانی شخصیت کا ''عکس'' ہوتی ہے، اور چال تو اندازِ زیست کا اشاریہ ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا O (۲)

اور خدائے رحمان کے حقیقی بندے وہی ہیں جو زمین پر آہستگی اور عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب بے علم اور جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) خطاب کرتے ہیں تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ کھانا تناول فرمانا بھی اخلاق کی تربیت کے سلسلے میں ہدایات اور قرینے کا مستقل باب تھا۔ کھانا سادہ ہوتا، اکثر جو کی روٹی ہوتی، آٹا بیشتر بغیر چھنا ہوا ہوتا، زیتون کو مستقل ''سالن'' کا درجہ حاصل تھا۔ غذا میں بھی اعتدال کو ملحوظِ خاطر رکھا جاتا۔ ایسی غذا ہوتی جس میں سادگی کے ساتھ ساتھ نشاستہ، روغنیات، پروٹین، فائبر سب ہی اجزا ہوتے۔ گوشت کے ساتھ سبزی بالخصوص لوکی کو شامل کیا جاتا۔ پھلوں کو غذا میں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ کھجور، خربوزے، تربوز اور ککڑی کا استعمال عام تھا۔ جب کسی نئے پھل کی فصل شروع ہوتی تو صحابہ وہ پھل اپنے صاحب اور آقا علیہ السلام والصلاۃ کی خدمت میں پیش کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے کے باغات اور پھلوں کی فراوانی کے لئے دعا فرماتے، اور آپ ﷺ وہ پھل محفل میں موجود سب سے چھوٹے بچے کو دے دیتے۔ اس سے امت کو یہ سبق ملتا ہے کہ بچوں کا اکرام اور ان سے محبت و شفقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور ہر دور میں اسلامی معاشرے میں اسے سنتِ جاریہ کا درجہ

۲۔ الفرقان: ۶۳

حاصل ہونا چاہئے۔ اس سنت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معصوم بچوں کی خوشی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا وسیلہ ہے اور اس سے ربِ جلیل کی نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

رزقِ حلال وطیب اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ بھوک، خواہ پیٹ کی ہو خواہ جنس کی، بیشتر انسانی گناہوں اور معاشرتی خرابیوں کی سبب ہے۔ زبان کی لذت کی خاطر آدمی حلال اور حرام کے امتیاز کو بھول جاتا ہے۔ آج مغرب کے غیر اسلامی معاشرے میں رہنے والے کتنے ہی مسلمانوں نے غیر ذبیحہ گوشت کو اپنے لئے حلال کر لیا ہے اور ''فتوے'' حاصل کر لئے ہیں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے آداب بڑی وضاحت کے ساتھ ہمیں عطا فرمائے ہیں۔ آپ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کھانا کا آغاز فرماتے اور اس دعا پر کھانا ختم فرماتے۔

الحمد للہ الذی اطعمنا و سقانا و جعلنا مسلمین (۳)

تمام ثنا اور تعریف اس ذات کے لئے جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور اسلام کی دولت عطا کی

ہر مسئلے میں، زندگی کی ہر سرگرمی میں اللہ کی یاد اور اس کا ذکر ساری انسانی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ ہے کہ یوں ہی اخلاقِ الٰہی زندگی میں عملی طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ طہارت اور پاکیزگی اسلامی نظام اور انسانی اخلاق کا ایک حصہ ہے۔ جسمانی اور ظاہری پاکیزگی اور صفائی انسان میں روحانی، اخلاقی اور باطنی پاکیزگی پیدا کرتی ہے۔ مسنون دعاؤں میں یہ دعا بھی شامل ہے کہ اے اللہ! تو میرے باطن کو میرے ظاہر سے زیادہ پاکیزہ بنا دے، کھانا کھانے سے پہلے ہاتھوں کو دھونا اسلامی اخلاق و آداب میں شامل ہے۔ مسلمان جب مل کر کھانا کھاتے تھے تو اکثر ایک ہی برتن سے کھاتے تھے، اسی لئے ہر کھانے والے کا فرض تھا کہ وہ اس طرح کھائے کہ اس برتن سے دوسرے کھانے والوں میں ناگواری یا کراہیت نہ پیدا ہو۔ بیٹھنے کے انداز میں نفاست ہو، ہاتھ کے ناخن اچھی طرح صاف اور کٹے ہوں، آدمی اپنے سامنے سے کھائے، برتن میں اِدھر اُدھر ہاتھ نہ ڈالے۔ اگر وہ گوشت کھا رہا ہے تو اچھی بوٹیاں خود نہ چن

۳۔ ترمذی: ج ۵، ص ۲۸۴، رقم ۳۴۶۸

لے بلکہ ساتھیوں کا خیال رکھے۔ سنت میں سب باتیں شامل ہیں اور کتب احادیث میں ان کی تفصیل ملتی ہے۔ بڑی باتوں کا شعوری طور پر اختیار کرنا اور ان کی نمائش آسان بات ہے، لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا اور ان پر اس تواتر سے عمل کرنا کہ وہ عادت بن جائیں اخلاقِ عالیہ کی تعمیر کا وسیلہ ہے اور اسی اخلاق کو ہر شعبۂ زندگی میں مسلمان کی شناخت بنا دینا کارنامۂ رسالت ہے۔ ہزاروں سلام اور لاکھوں درود اس ذاتِ کریم پر جس کے اسوۂ حسنہ کا مقصد ہمیں بہترین انسانی گروہ بنانا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم

مسجدِ نبوی، صحابہ کرام کی زندگی کا مرکز

مدینہ منورہ کے بازاروں میں اسلامی اخلاق کی خوشبو پھیلی رہتی۔ دوکان دار اور گاہک ایک دوسرے پر سلامتی کے تحفے نچھاور کرتے، کوئی غل اور دھوکا نہ تھا، چیزیں اپنے وزن اور پیمائش میں پوری ہوتیں۔ صحابہ کے گھروں میں بزرگوں کی شفقت اور چھوٹوں کا ادب آمیز و ادب آموز رویہ زندگی کے حُسن کا استعارہ تھا۔ مدینۂ منورہ کے باغوں میں کھجوروں اور چھوں کی شیرینی کے ساتھ ساتھ گفتگو کی مٹھاس دنیا کو جنت آثار بنا دیتی، لیکن مدینۂ منورہ میں مسلمانوں کی زندگی کا مرکز مسجدِ نبوی تھی۔ صُفّہ ہمہ وقت آباد رہتا۔ کم و بیش ستر جانثارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم صُفّہ پر تلاوت، نماز اور ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے۔ پنج وقتہ نمازوں میں ان قدسی نفس انسانوں کو ہادیٔ اعظم اور امامِ ہر زماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت، رفاقت اور صحبت میسر آجاتی۔ جمعہ کے علاوہ مقررہ دنوں میں آپ ﷺ کے وعظ اور تذکیر سے وہ اپنے قلوب کو منور کرتے۔ مسلمانوں کے مسائل اور اجتماعی معاملات میں یہی مسجد دارالشوریٰ تھی۔ زندگی کا ہر راستہ اسی مسجد کی طرف آتا تھا۔ صحابۂ کرام اپنے رہنما اور رہبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کہیں سفر پر جاتے تو آغازِ سفر اسی مسجد سے ہوتا، سفر سے لوٹتے تو گھر جانے سے پہلے مسجد نبوی میں اپنے رب کے حضور دوگانہ ادا کرتے۔ یہ بھی ضبطِ نفس کی تربیت کی صورت تھی کہ گھر میں بیوی اور بچے اپنے شوہر اور باپ کو دیکھنے کے لئے بے چین ہیں مگر وہ اپنے رب کے گھر میں حاضری کو ترجیح دے رہا ہے۔ طوفان آتا، تند و تیز ہوائیں چلتیں اور برق و باراں کی شدت منظر اور حدِ نظر پر چھا جاتی تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مسجد نبوی میں اپنے

ب

سے عافیت طلب کرتے۔ یہ لوگ موت کے اندیشوں کو خاطر میں نہ لاتے مگر ہر ایسے تغیر سے پناہ مانگتے کہ کہیں یہ عذاب الٰہی کی شکل نہ ہو۔ باہر سے آنے والے وفود کا استقبال مسجد نبوی میں کیا جاتا اور یہیں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے منبر رکھا جاتا تا کہ وہ زبانِ شعر میں حمدِ الٰہی اور ثنائے خواجہ پیش کریں۔ شاعری نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبے سے فروتر تھی، جب کہ عربوں کی نظر میں شعر نطق و بیان کی معراج تھا۔ کلام اللہ کی بے مثال تاثیر کے پیش نظر انہوں نے ''آپ کے کلام'' (مشرکین قرآن کو کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے) کو شاعری قرار دیا حالانکہ شعر و سخن کے یہ ''متوالے'' خوب جانتے کہ یہ کلام ''چیزے دیگر ست''۔ قرآن مجید نے اس ''الزام'' کی بہت پرزور انداز میں تردید کی ہے۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ (۱)

اور ہم نے اپنے رسول کو شعر نہیں سکھایا اور شعر ان کے قابل نہیں۔ اور یہ کلام تو ذکر و نصیحت اور قرآن مبین ہے۔

قرآن کریم کی اس تردید کو اس کے مضامین کی روشنی میں دیکھئے اور شعر محض حسن بیان کا نام نہیں بلکہ مبالغہ، تخیلاتی مضامین اور افراط و تفریط اجزائے شاعری ہیں اور قرآن حکیم کا ان عناصر سے شمہ بھر تعلق نہیں۔ یہ دائمی حقائق کی کتاب ہے۔ یہ بات بھی ایک معجزے کا درجہ رکھتی ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شعر کے نہایت عظیم ناقد ہونے کے باوجود اکثر موزوں شعر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ یہ امر رب تھا۔ آپ سے یہ شعر منسوب ہے۔

انا النبی لا کذب

انا ابن عبد المطلب

ادب شعر کا ہر طالب علم اس حقیقت سے باخبر ہے کہ شعر شاعر کے قصد کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایسے موزوں کلام اکثر ہماری گفتگو میں ہماری زبان سے بے ارادہ ادا ہو جاتے ہیں، جنہیں کسی طور شعر نہیں کہا جاتا۔ اس حقیقت کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبیٔ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم شعر کی تاثیر، افادیت اور معاشرہ سازی میں اس کی حقیقت سے بدرجۂ کمال واقف

۱۔ یٰسین: ۶۹

تھے۔ مسجدِ قبا، مسجد نبوی کی تعمیر اور غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کی کھدائی کرتے ہوئے آپ ﷺ اشعار کی ادائیگی میں صحابۂ کرام کے ہم نوا ہو جاتے تھے تا کہ مشقت میں نشاط کا رنگ شامل ہو سکے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عموماً فجر کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک مسجد نبوی میں تشریف فرما رہتے۔ قدرے آرام فرماتے، صحابہ سے گفتگو فرماتے اور صحابہ سے اشعار سنتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ شعرا میں امیہ بن ابی الصّلت، حضرت لبیدؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حسان بن ثابتؓ تھے۔ حضرت ابن رواحہؓ فتح مکہ کے وقت مسجد الحرام میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور شعر ان کے لب پر تھے۔ ''خلوا بنی الکفار عن سبیلہ'' حضرت لبید نے مسلمان ہونے کے بعد شعر گوئی ترک فرما دی تھی اور حضرت حسانؓ تو شاعر دربار نبوت تھے۔

ذکر ہو رہا تھا مسجد نبوی میں (بالعموم) نماز فجر کے بعد کی محفلوں کا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں آپ کی محفلوں میں سو بار سے زیادہ شریک ہوا۔ ان محفلوں میں اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم ترنم کے ساتھ اشعار پیش کیا کرتے تھے۔

كان اصحابهٗ يتناشدون الشعر (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب شعر گایا کرتے تھے۔

اس سے مسلمان کی تفریحات میں ترنم کے ساتھ شعر خوانی کی اجازت بلکہ اس کے استحسان کا پہلو موجود ہے

مسجد نبوی میں (اور باہر بھی) سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب رضی اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ یوں بیٹھتے کہ آپ کے لئے کوئی امتیازی جگہ یا امتیازی فرش نہ ہوتا، اور اجنبی کو حاضری کے وقت سوال کرنا پڑتا کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون سے ہیں'' یا ''محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہاں ہیں''۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح مشقت کے اجتماعی کاموں میں اپنے لئے کسی رعایت کو پسند نہیں فرماتے تھے، اسی طرح کسی معاشرتی امتیاز کے قائل نہیں تھے۔ یہ

۲۔ ترمذی: ج ۵، ص ۱۴۰، رقم ۲۸۵۰

دوسری بات ہے کہ صحابۂ کرام آپ کے حضور اس ادب سے بیٹھتے جیسے ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہوں۔ اور وہ اپنی آوازیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پست رکھتے کہ کہیں ان کے اعمال حبط نہ ہو جائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ضابطۂ اخلاق میں دل سے تعظیم اور احترام کا اعتبار ہے محض احترام کے اظہار کا نہیں۔ آپ اپنی تشریف آوری پر بھی صحابہ کے اُٹھ کر تعظیم بجالانے کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے۔ اخلاق تو انسان کے خَلق اور سرشت میں داخل اور شامل ہو کر اس کو بہتر انسان بناتا ہے اور ''تکلف'' کے معانی یہ ہیں کہ شائستہ اندازِ نشست و برخاست، اندازِ کلام، اندازِ تبسم اور کھانے پینے کے آداب اس کی ذات کا حصہ نہیں بن سکے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلوں میں یہ محسوس ہوتا کہ یہ وقت ہے شگفتن گل ہائے ناز کا۔ مسجد نبوی میں آپ کی محفل میں قہقہے بلند نہ ہوتے، بلند آواز میں گفتگو نہیں ہوتی لیکن دل ایک انبساط ضرور محسوس کرتا، دل اور ذہن کی فضا پر آپ کی کریمی کا ترشح ہوتا تھا اور دل کی زمین میں حقیقی مسرت کے گل بوٹے اگتے رہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہنسی، تبسم تک محدود رہتی اور تبسم گوشہائے لب سے آگے نہ بڑھتا اور آپ کی پاک آنکھیں بھی اس تبسم میں شریک محسوس ہوتیں۔ یہ تبسم آپ کے اخلاق کا جز تھا۔ حضرت عبداللہ بن الحارثؓ نے فرمایا:

> مارأیتُ احداً اکثر تبسماً مِن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (۳)
>
> میں نے رسول اللہ علی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مسکرانے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔

اور آپ کے ''تبسم'' کی رعنائیوں کو اپنی نگاہِ تصور سے دیکھتے ہوئے اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ یہ وہ ذات تھی جسے ساری امت اور ساری انسانیت کا ''غم'' تھا، جو جاگتی آنکھوں سے آنے والے زمانوں کے فتنوں اور آزمائشوں کو دیکھ رہی تھی۔

مزاح انسان کے اخلاق کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ جذباتی آدمی، ممکن ہے کہ معمولی

۳۔ مسند احمد: ج ۴، ص ۱۹۱

باتوں پر رو پڑے اور ایسا رونا طبیعت کی کمزوری کی دلیل تو ہو سکتا ہے مگر اخلاقی کمزوری کی نہیں، لیکن گھٹیا اور نازیبا باتوں پر ہنسنا یا مسکرانا اخلاقی عیب ہے۔ ہمارے معاشرے میں لوگ دوسرے اندازِ کلام، تکیۂ کلام یا کسی جسمانی عیب کو ہنسنے کی چیز سمجھتے ہیں مثلاً کسی کا لنگ، یا ہکلاہٹ۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی نظام میں شدید عیب ہے۔

مزاح کے لئے موقع محل اور حد ضروری ہے۔ مزاح محفل یا گفتگو پر چھا نہ جائے۔ عربی محاورے کے مطابق مزاح کھانے میں نمک کی طرح ہے۔ المزاحُ فی الکلام کالملح فی الطعام۔ نمک ذرا سا زیادہ ہو جائے تو کھانا بگڑ جاتا ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہت زیادہ اور مسلسل گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حفظِ لسان مسلمان کی ایک پہچان ہے۔ گفتگو با مقصد ہو، گفتگو اچھے کاموں کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہو۔ ویسے ایک دوسرے کی دل دہی بھی کارِ ثواب ہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اور تیز تیز گفتگو نہیں فرماتے تھے۔ اس نکتے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہم اور بنیادی موضوعات پر احادیث کے راویوں میں اختلافِ لفظی اتنا کم کیوں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام بہت صاف اور واضح ہوتا تھا۔ موضوعِ کلام میں خلط مباحث نہ ہوتا۔ ایک مضمون یا موضوع کو آپ سننے والے کے ذہن نشین فرما دیتے۔ جو بات اہم ہوتی اسے تین بار دہراتے۔

بعض احادیث کی مختلف روایتوں میں ایک لفظ کا اختلاف ملتا ہے۔ آج علمائے بلاغت مرادف یا مترادف کے چنداں قائل نہیں لیکن یہ بھی معجزہ ہے کہ ایسی احادیث میں نبی اکرمؐ کے دو مترادف لفظوں میں معانی کی ہم رنگی (shades of meaning) نہایت درجے مکمل اور ہمہ جہتی ہوتی ہے۔ اس کا یہ سبب ذہن میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کی محفل میں عرب کے مختلف علاقوں اور قبائل کے لوگ ہوتے تھے۔ ان کی لغت اور ذخیرۂ الفاظ اور محاورے میں فرق ہوتا تھا۔ جس کسی لفظ یا محاورے کے استعمال پر سامعین میں سے کسی کے چہرے پر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اجنبیت کا احساس ہوتا تو آپ اس لفظ یا اظہار کو بدل دیتے۔ الترغیب والترہیب کے مطالعے سے ہمارے اس قیاس بلکہ علمی نتیجے کو تقویت ملتی ہے۔

مدنی معاشرے میں ہر طرف رسول اللہ ﷺ کا نقشِ قدم

دنیا کے کم و بیش سارے قائد، رہنما اور ارباب سیاست لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے ہیں، کیونکہ زیادہ قربت سے ان کی شخصیت کے خدوخال ان کے ماننے والوں کے سامنے آجائیں گے، اور جو رہنما لوگوں سے زیادہ میل جول رکھتے ہیں وہ بھی اپنے اتباع کرنے والوں سے اپنے ہی بنائے ہوئے ماحول میں ملنا پسند کرتے ہیں۔ اپنے آشرم میں، اپنی کٹیا میں، اپنے حجرے میں۔ یوں وہ ایسی ''مقدس'' یا ایسی ''مصنوعی'' فضا تیار کرتے ہیں جو ارادت مندوں کی عقیدت میں اور اضافہ کرے۔ اس اعتبار سے انسانی تاریخ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال پیش نہیں کرسکتی کہ ایک بے بس اور بے سہارا بڑھیا بھی اپنے کام سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے جاسکتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر و بیشتر اپنے اصحاب کے گھر تشریف لے جاتے تھے اور ان کے درد، دکھ میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے گھروں میں استراحت فرماتے اور ان کے گھروں کو بابرکت بنانے کے لئے ان میں نماز ادا فرماتے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی نظر میں رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کو اپنے نفوس سے بھی عزیز تر اور قریب تھے۔ جماعتِ مومنین آپ کے ابدی پیغام یعنی وحیٔ الٰہی اور قرآنِ حکیم اور آپ کے اسوۂ حسنہ سے وجود میں آئی تھی۔ اسی لئے ضروری تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے تمام پہلو، تمام کیفیات، مختلف واقعات پر آپ کا ردعمل، آپ کی معاشی، اخلاقی اور تبلیغی جدوجہد، آپ کا طرزِ استراحت غرض کہ ہر چیز امت

کے سامنے ہو کہ یہی وہ بہترین نمونہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بلکہ پوری انسانیت کو عطا فرمایا۔ اپنی امت کے غریب ترین فرد کا پاسِ خاطر آپ کو عزیز تھا۔ آپ کسی ہدیے کو قیمت کی میزان میں نہیں تولتے تھے بلکہ اخلاصِ قلب کا احترام فرماتے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر مجھے بکری کا ایک کھر (کراع) بھی ہدیتاً پیش کیا جائے تو میں اسے قبول کرلوں گا۔ کوئی صحابی اگر بیمار ہوتا تو عیادت کے لئے آپ کسی سواری کا انتظار نہ فرماتے بلکہ پا پیادہ تشریف لے جاتے۔

مدینۂ منورہ کے اسلامی معاشرے کے اُفق پر ہر طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا سورج چمکتا نظر آتا ہے۔ صحابۂ کرام سے اس قربت کے بغیر اسلامی طرزِ حیات کا صحیح تصور اور اندازہ قائم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آپ کی راتیں عبادت میں گزرتیں، تہجد آپ پر فرض تھا، نفلی نمازوں کی ایک رکعت میں آپ طویل ترین سورۃ کی تلاوت فرماتے۔ آپ کا ساتھ دینے کے لئے جو صحابہ شریکِ نماز ہوتے انہیں اپنی نماز مختصر کرنی پڑتی۔

زندگی کی ہمہ گیری کو دیکھئے اور پھر اس حقیقت کو کہ اللہ کا عظیم ترین رسول ہر جگہ ہماری پیشوائی کرتا نظر آتا ہے اور آج بھی آپ کی عملی قیادت ہماری راہیں ہموار کرتی نظر آتی ہے۔ اس ہمہ گیری کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ اسلام میں ثنویت (dualism) کا تصور نہیں۔ یہاں دین دنیا سے اور دنیا دین سے الگ نہیں۔ یہاں اس اندازِ فکر کی گنجائش نہیں کہ قیصر کا حق قیصر کو دیدو اور خدا کا حق خدا کو۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کے پاس مسلمانوں کی ایک جماعت آئی تو اس نے فرمائش کی کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ بتائیے۔ حضرت زیدؓ نے جواب میں فرمایا کہ ''ماذا اُحدثکم'' ۔ میں کیا کیا بتاؤں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن آپ ﷺ کا اخلاق تھا۔ حضرت زیدؓ سے سوال کرنے والے آپ کے مشاغل اور دلچسپیوں کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے تھے، اس لئے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ''میں کیا کیا بتاؤں۔ میں آپ کا پڑوسی تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تو مجھے بلا بھیجتے اور میں وہ وحی لکھ دیتا تھا۔ جب ہم دنیا کی باتیں کرتے تو آپ بھی (ہمارے ساتھ) دنیا کی باتیں کرتے۔ جب ہم آخرت کی باتیں کرتے تو آپ بھی آخرت کے ذکر سے

ہمیں سرفراز فرماتے۔ جب ہم کھانے کی باتیں کرتے تو آپ بھی کھانے کی باتیں کرتے۔ تو میں تم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیا باتیں کروں"۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کے اس بیان میں کیسے کیسے نکات آگئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سے ان کی دلچسپی کے موضوعات پر گفتگو فرماتے اور ان مجالس میں انسانی زندگی اور اخلاق کے ہر پہلو پر اسلامی نصب العین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامعین کے سامنے آجاتا۔

مسجد نبوی میں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری محفلوں اور مجمعِ صحابۂ کرام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر شخص کی باتیں توجہ سے سنتے اور ہر شخص یہ سمجھتا کہ آپ کی نظرِ التفات اور توجہ خاص اس کی طرف ہے۔ ہر انسان کی تالیفِ قلب آپ کو عزیز تھی۔ آپ کا یہ کرم صرف توجہ اور گفتگو تک محدود نہ تھا بلکہ آپ کے رویے میں حد درجے نرمی، شفقت اور محبت تھی۔ آپ کی رحمۃ للعالمینی کا یہ سماجی پہلو تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نرمی، عفو و درگزر کا ایک مستقل باب تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ دس برس آپ کے خادمِ خاص رہے اور اس طویل عرصے میں آپ نے انہیں سرزنش نہیں کی، نہ ہی خفگی کا اظہار فرمایا۔ کمی زندگی میں آپ نے اپنے بدترین دشمنوں کے ساتھ بھی شائستگی، نرمی اور درگزر کا معاملہ فرمایا، اور اس طرح کہ فریضۂ تبلیغ سے ایک لمحے کے لئے غافل نہیں ہوئے۔ یہ انسانی زندگی کی معراج اور اخلاقِ انسانی کا کمال ہے کہ زندگی کی تقویم ایک لحظے کی غفلت سے بھی محفوظ رہے۔

ہجرت کے بعد یثرب کو مدینۃ النبی بنانا ایک مسلسل عمل تھا۔ معاہدے، مواخاۃ، غزوات کا مسلسل سلسلہ، صلحِ حدیبیہ، فتح خیبر اور اسی کے ساتھ ساتھ ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حجروں میں مسلسل رشد و ہدایات کا اجرا، انسانی رشتوں کے مفاہیم سے ازواجِ مطہرات، رشتہ دار خواتین اور صحابیات کو آگاہ فرمانا۔ قریش سے صلح حدیبیہ اور یہودیوں کی شکست کے بعد بھی غزوات اور عسکری مہمات کا سلسلہ جاری رہا۔ غزوۂ وادی القریٰ، غزوۂ ذات الرقاع اور ۷ھ میں کئی سرایا اور عسکری مہمات اور انہیں مصروفیات کے ساتھ ساتھ عمرۃ قضا۔ صلح حدیبیہ سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خواب میں اپنے آپ کو اور اپنے صحابہ کو طواف کرتے دیکھا تھا۔ نبی کا خواب بھی نبوت کا حصہ ہوتا ہے۔ صداقت ہی صداقت۔ ذی قعدہ

کے مہینے میں آپ نے اس خواب کی تعبیر کے طور پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ وہ عمرے کے لئے تیاریاں کریں۔ لیکن کفار نے آپ کو حدیبیہ سے آگے نہ جانے دیا، پھر اگلے سال ذی قعدہ ۷ھ میں آپ نے حکم دیا کہ حدیبیہ میں شریک ہر صحابی عمرۃ قضا ادا کرے۔ جب کاروانِ رسالت عمرے کے لئے مدینۂ منورہ سے نکلا تو اصحابِ حدیبیہ کے علاوہ اور کچھ اصحاب بھی اس سفرِ سعادت میں ہم رکاب ہوگئے۔ خواتینِ اسلام کی دل دہی اور معاشرے میں ان کے صحیح مقام اور اہمیت کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ اہمیت دی۔ مسلمان خواتین تو غزوات میں بھی شامل رہیں اور ان فرائض میں مصروف جو عورت ہی بہتر طور پر انجام دے سکتی ہے۔

آج ہمارے عہدِ انتشار کے معاشرے کو دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا کہ آقائے نامدار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مسلمان عورت کو کیا رتبہ اور معاشرتی اہمیت عطا فرمائی۔ آج افراط و تفریط میں گھرا ہوا مسلمان اور انسان اس معاشرتی اعتدال کو سمجھنے سے قاصر ہے جسے مکارمِ اخلاق کی تکمیل کرنے والے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں ممکن بنایا۔

عمرۃ القضا میں دو ہزار صحابیوں کے ساتھ صحابیات اور مسلمان بچے بھی شامل تھے۔ بچے، خواتین، نوعمر افراد، جوان، ادھیڑ عمر اور ضعیف صحابہ۔ اس مسلسل انسانی زنجیر نے نسلی خلا (Generation gap) کے اندیشوں سے مدنی معاشرے کو محفوظ رکھا۔ نسلی خلا کا مسئلہ آج ہمارے لئے بڑا اخلاقی مسئلہ ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہر عمر کے شہریوں کی ترجیحات مختلف ہیں اور ان میں کوئی ذہنی اور فکری رابطہ نہیں ہے۔ مختلف عمروں کے افراد کی سرگرمیوں میں فرق ضرور ہوگا لیکن اگر اسلام کے اخلاقی اور معاشرتی رابطے قائم ہوں اور اسوۂ حسنہ نظر کے سامنے ہو تو پورے معاشرے میں فکری اور ذہنی ہم آہنگی ہوگی۔

مدینے سے نکل کر ذوالحلیفہ کے مقام پر عمرے کا احرام باندھا گیا اور فضا لبیک اللّٰھم لبیک کی صدا سے گونج اٹھی۔ آج بھی مدینۂ منورہ سے عمرے کے لئے روانہ ہونے والے افراد اور گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی اس صدا کو سن سکتے ہیں۔ شرط صرف تعلق بالرسول کی ہے۔ یہ تعلق جو صدیوں کو ہم رشتہ کر دیتا ہے اور ہمیں اس کاروانِ سعادت کا راہی بنا دیتا ہے۔

احتیاط، حفاظتی تدبیر اور دشمن کی فطرت سے باخبری بھی انسانی وجود اور اخلاق کے دائرے میں شامل ہے۔ قریش کی بدعہدی اور اچانک حملے اور مزاحمت کے خیال سے ہتھیار ساتھ لے لئے گئے اور جب یہ قافلۂ سعادت وادیٔ یاجج میں پہنچا تو سارے ہتھیار دو سو صحابہ کی نگرانی میں وہاں رکھ دیئے۔ ان محافظوں کی تعداد کے پیش نظر اہلِ مکہ کسی یورش اور کسی حملے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہمراہیوں کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے۔ اب صحابۂ کرام کی تلواریں معاہدے کے مطابق نیام میں تھیں اور لبیک کی صدائیں ان کے لبوں سے نکل کر فضا میں ایک جوئے نور کی طرح دائرے بناتی ہوئی رواں تھیں۔ مسلمانوں کے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ وہ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے پہلے تین چکر دوڑ کر لگائیں۔ یہ اس نبی کا حکم تھا جس نے ہمیشہ اپنے اصحاب کو یہی حکم دیا تھا کہ زمین پر چلتے ہوئے آہستہ روی اور تواضع کا خیال رکھیں۔ آپ نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اہلِ مکہ کو باور کرایا تھا کہ ''یثرب'' کے موسم، وہاں کے بخار اور آب و ہوا نے مسلمانوں کو کمزور کر دیا تھا۔ کفر اپنے آپ کو کس کس طرح سے خود فریبی میں مبتلا کرتا ہے، حالانکہ اہل قریش کئی مرتبہ میدانِ کارزار میں مسلمانوں کی قوت دیکھ چکے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لئے مشرکینِ مکہ نے مسجدِ حرام کے باہر قطار بندی کر رکھی تھی۔ وہ اپنے تجسس کو چھپانے میں کامیاب نہ ہو سکے تھے اور اس وقت یہ بات ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ بہت جلد یوں ہی خانۂ کعبہ میں آپ کے حضور کھڑے ہو کر عافیت طلبی کر رہے ہوں گے۔ جب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ کا طواف کر رہے تھے تو ان کے آگے آگے حضرت عبداللہ بن رواحہ رجزیہ انداز میں شعر خوانی کر رہے تھے۔ ان اشعار میں اسلام کی قوت کا ذکر تو تھا اور کافروں کے لئے تنذیر بھی تھی لیکن مفاخرت کا وہ انداز اور اپنی برتری کے اظہار کا وہ اسلوب نہ تھا جو عرب شاعری کا چلن تھا۔ ابن رواحہ کے بول کفار کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو رہے تھے:

خلوا بنی الکفار عن سبیلہ
خلوا فکل خیر فی رسولہ

اے کفر زادو! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا راستہ چھوڑ دو، ہٹو،
راستہ چھوڑو، کہ ساری بھلائی اور سارا خیر اللہ کے رسول میں ہے۔

حضرت عمرؓ جیسے جری شیر پر حرمِ کعبہ کی عظمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام اس درجے طاری تھا کہ انہوں نے ابن رواحہؓ سے کہا کہ تم اللہ کے رسول اور خدا کے گھر کے سامنے شعر پڑھ رہے ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ عمرؓ! ان کو نہ ٹوکو۔ یہ اشعار کفار کے دل کے لئے تیر سے زیادہ کاری ہیں۔

یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کا وہ اخلاق پوری قوت کے ساتھ سامنے آ گیا جو آپ کی تعلیمات کی پیروی اور وحیٔ الٰہی کے اتباع نے ان میں پیدا کیا تھا اور جس کا ذکر عمرۃ القضا سے پہلے ہی صلحِ حدیبیہ کے موقع پر سورۃ فتح میں ہو چکا تھا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۖ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝ (۱)

اس آیت کو صلحِ حدیبیہ کے سیاق و سباق میں پیش کیا جا چکا ہے۔ اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام پر اس کے اثرات کے سلسلے میں ان آیات میں جو نکات پیش کئے گئے ہیں ان میں سے اہم تر نکات یہ ہیں:

۱۔ محمد رسول اللہ اور ان کے ساتھی (الذین معہ) ایک دوسرے سے وابستہ اور پیوستہ ہیں۔

۲۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاقی صفات ان کے اصحاب میں پوری

۱۔ الفتح: ۲۹

طرح موجود ہیں۔ سابقون الاولون میں یہ اخلاقی رنگ زیادہ گہرا ہے۔ اس کا تعلق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی معیت کی مدت سے ہے۔ جو زیادہ عرصے آپ کے ساتھ رہا اس کے کردار اور ذات میں اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پرتو اسی قدر زیادہ روشن ہے۔

۳۔ ان اخلاقی صفات میں دو اجتماعی طور پر زیادہ اہم ہیں۔ ایک تو کفر کے مقابلے میں ان کی شدت اور دوسرے آپس میں ان کی قربت، اخوت اور رحم دلی جس سے معاشرے کی تعمیر ہوتی ہے۔ کفر کے مقابل شدت سے وہ راز آشکار ہوتا ہے جو لا الٰہ الا اللہ میں مضمر ہے۔ کفر کیا ہے؟ معبودانِ باطل کے سامنے سر جھکانا۔ اور ان معبودوں کی نفی کے بغیر آدمی معبودِ حقیقی کی بارگاہ میں نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کو پا لینے والے افراد، ایک معاشرے میں داخل ہو کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ مدینے کی شہری ریاست کا معاشرہ اس کا ثبوت ہے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا ایک پہلو عبادات ہیں۔ عقائد و عبادات، اخلاقی صفات (اخوت، ہمدردی وغیرہ) اور معاملات یہ ایک دوسرے کے تار و پود کا درجہ رکھتے ہیں۔ رکوع و سجود کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کا حصول ہے اور اعلیٰ ترین اخلاقی صفات کے پیدا ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو گیا ہے، یوں افراد کی تعمیر، معاشرے کی تعمیر کی بنیاد بن جاتی ہے۔

اس نکتے کو سمجھے بغیر ہم اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست قائم نہیں کر سکتے۔ اللہ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے، احادیث کی صورت میں اسلامی معاشرے کے خدوخال کی تفصیلات بھی ہمارے سامنے ہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور اسوۂ حسنہ کو اپنائے بغیر منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ نعروں اور جدید سیاست کے حربوں سے اسلامی معاشرے کا قیام اور افراد و اجتماعی زندگی میں اسلامی اخلاق کا نفوذ ممکن نہیں۔

جنگ موتہ، فوق البشر عسکری معرکہ

ارنبوی سے صحابۂ کرام کی اخلاقی تربیت اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نقشے کے مطابق شروع ہو گئی تھی۔ ظلم کا مقابلہ صبر کے ہتھیار سے، گالیوں کا مقابلہ سلامتی کی دعاؤں سے، تمسخر کا مقابلہ متانت اور وقار سے۔ وہ جو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے آیا تھا جو انسانی نفوس کو بدل رہا تھا، اس کی تعلیمات ایسی قوتِ محرکہ تھیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی سانگی، انسانی تاریخ کا ایک عجوبہ اور معجزہ بن گئی۔ جبلت کی یہ تسخیر نہ تو اس سے پہلے کبھی دیکھی گئی تھی اور نہ اس کے بعد۔ آج بھی نفسِ انسانی میں یہ تغیر کبھی رونما ہوتا ہے تو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی سے۔

جنگِ موتہ کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت تھا۔ ایلچی کو قتل کرنا اس عہد میں بھی ایک شدید جرم تھا اور رسولِ رحمت جو رسولِ ملحمہ بھی تھا اس نے اس جرم کی سزا دینے کے لئے تین ہزار کا لشکر مرتب فرمایا جو جمادی الاولیٰ ۸ھ میں اس علاقے کی طرف روانہ کیا گیا اور اسی شام میں بلقا کے قریب موتہ کے مقام پر یہ معرکہ پیش آیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس معرکے کی کئی باتوں سے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اور ان کی شہادت کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ کو لشکر کا امیر مقرر فرمایا، اور ان کی شہادت کی صورت میں لشکرِ اسلام کو اجازت دی کہ جسے چاہیں سالار مقرر کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کو یہ ہدایت فرمائی کہ جس مقام پر حضرت حارث بن عمیر شہید کئے گئے تھے اس مقام پر پہنچ کر وہاں کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کرنا۔ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو یہ تمہارے لئے اللہ کا انعام ہوگا اور بہ صورتِ دیگر اللہ کے راستے میں ان سے جہاد کرنا۔

جنگ ہر دور میں انسانوں کے لئے بڑی آزمائش رہی ہے۔ بادشاہوں نے اپنی ہوسِ ملک گیری میں انسانی بستیوں کو مقتل بنادیا اور یوں تاراج کیا کہ وہ کھنڈر بن گئیں۔ لوگوں کی زندگی، عزت و ناموس سب غارت ہوگیا۔ اس کا نہایت جامع احاطہ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا خط پانے کے بعد اپنے امراوعمائدینِ دربار سے ان الفاظ میں کیا۔

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَادَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ
اَذِلَّةً ۚ وَکَذٰلِکَ يَفْعَلُوْنَ (۲)

اس (ملکہ) نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی میں (فاتحانہ) داخل ہوتے ہیں تو اسے اجاڑ دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کردیتے ہیں اور یہ لوگ بھی ایسا ہی کریں گے۔

ملکۂ سبا کو یہ علم نہیں تھا کہ سلیمان نبی ہیں صرف بادشاہ نہیں۔ بادشاہوں، حکمرانوں کا آج بھی وہی عالم ہے جو ملکہ نے بیان کیا۔ امریکہ نے پورے ویت نام کو ایک وسیع و عریض قحبہ خانہ بنادیا۔ یہ ملک گیری میں مبتلا لوگ اور قومیں جنگ کو صرف میدانِ جنگ تک محدود نہیں رکھتیں۔ یہ دور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کا ہے اور آج اکیسویں صدی میں تہذیب کے ''زمانۂ عروج'' میں افغانستان اور عراق میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے جمہوریت کی فتح اور عوام کے حصولِ حقوق کا نام دیا جا رہا ہے۔ عراق میں ہر ماہ دس ہزار شہری مارے جا رہے ہیں اور وہ بھی امن کے فروغ کے نام پر۔ یہی روش عہدِ قدیم کے فاتحوں کی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کو نہایت بلند اخلاقی اصولوں کے تابع کردیا۔ فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر آپ اسلامی لشکر کو واضح ہدایت عطا فرماتے تھے۔ موتہ کی جنگ

۲۔ النمل: ۳۴

کے لئے روانہ ہونے والے لشکر کو بھی آپ نے یہ ہدایات دیں۔

۱۔ کسی مرحلے پر بدعہدی نہ کی جائے۔

۲۔ ہر طرح کی خیانت سے بچا جائے۔

۳۔ جو شریکِ جنگ نہ ہوں یعنی عورتیں، بچے، انتہائی بوڑھے لوگ اور کلیسا میں عبادت کرنے والے راہبوں سے تعرض نہ کیا جائے، ان کو قتل نہ کیا جائے۔

۴۔ کسی درخت، بالخصوص پھل دار درخت کو نہ کاٹا جائے۔

۵۔ کسی عمارت کو منہدم نہ کیا جائے۔

جب اسلامی لشکر اردن کے علاقے معان میں پہنچا تو مسلمانوں کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ قیصرِ روم ہرقل ایک لاکھ کے لشکر کے ساتھ بلقا کے قریب خیمہ زن اور جنگ کے لئے تیار ہے۔ ان ایک لاکھ سپاہیوں کے ساتھ قبائل کے بھی ایک لاکھ فوجی موجود ہیں۔ مسلمان اس صورتِ حال کے لئے تیار نہ تھے۔ دو لاکھ کے لشکر کے مقابلے میں تین ہزار سرفروش۔ جنت کے عوض اپنی جانیں فروخت کرنے والے یہ اہلِ ایمان بہر حال انسان تھے۔ اس صورتِ حال نے انہیں پریشان بھی کیا اور حیران بھی۔ معان میں دو راتیں باہمی مشاورت میں گزریں۔ بہت سے صحابہ کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے اور مزید کمک بھیجنے کی درخواست کی جائے، لیکن دوسرے صحابہ نے کہا کہ اس سے بڑی اسلامی فوج اس سے پہلے کسی معرکے کے لئے ترتیب نہیں دی گئی، پھر فتح و شکست کا تعلق تو ہماری تعداد سے نہیں اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت سے ہے۔ ہمارا کام تو لبیک کہنا اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے اپنے جذبات کا اظہار اشعار کی زبان میں فرمایا:

لکننی اسال الرحمان مغفرة
و ضربة ذات فرع تقذف الزبدا (۳)

میں تو اللہ رحمٰن سے مغفرت کا سوال کرتا ہوں اور اس کے ساتھ تیز دھار تلوار کے زخم کا سوال کرتا ہوں، جس سے جھاگ والا خون بہہ نکلے۔

۳۔ ابن ہشام: ج ۴، ص ۰۷

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے جن جذبات کو شعر کا پیکرِ جمال عطا کیا وہی جذبات قرآنِ حکیم کی تعلیمات اور آیات کی روشنی میں دوسرے صحابہ کے دلوں میں بھی موج زن تھے۔ یہ وہ تھے جو موت کو وہ پل سمجھتے تھے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔ وہ دوست جو قرآنِ حکیم کی آیات کے ذریعے ان سے ہم کلام ہے اور یہ ہم کلامی ہر دور میں مسلمانوں کے دلوں کو راہِ حق میں ثبات عطا کرتی رہے گی۔ ربِ جلیل کی آواز معرکۂ موتہ کے شرکائے عظیم کو اپنا فرض یاد دلا رہی تھی اور وہ اپنے رب کے حضور دعا کر رہے تھے۔

رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ O (۴)

اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور ہم سے اپنے کاموں میں جو زیادتی ہوئی ہے اسے معاف فرمادے اور ہمارے قدموں کو ثبات عطا فرما اور ہمیں کافروں کی قوم پر نصرت عطا فرما۔

معرکۂ موتہ کے مجاہدین، بالخصوص بدری اصحاب کو معرکۂ بدر شدت سے یاد آ رہا ہوگا جب اللہ نے میدانِ بدر میں مجاہدین کو شیطانی وسوسوں پر غالب کیا، ان کے دلوں کو مضبوطی عطا کی اور ان کے قدم جما دیئے۔ (۵)

ابتدائی دور میں اسلام لانے والے صحابہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سفرِ طائف یاد آ گیا جب دو اہلِ ایمان ایک پوری بستی کے کافروں اور ان کے گماشتوں، اوباشوں اور سنگ دل ساتھیوں کے مظالم کا نشانہ بنے تھے۔ ان دونوں نے صرف اپنے رب سے فریاد کی اور کسی انسان کی طرف نہ دیکھا اور جب رسول کے نعلین خون سے چپک گئے اور اس کے جسم سے خون بہہ کر پتھروں کو سرخ کر رہا تھا تو پہاڑوں کے فرشتے نے اجازت طلب کی کہ وہ اس بستی کو پہاڑوں کے درمیان پیس کر نابود کر دے، لیکن انسانیت کے مستقبل پر یقین رکھنے والے رحمتِ عالم نے فرمایا کہ نہیں۔ ان شاء اللہ انہیں ظالموں اور ان کی آنے والی نسلوں کے دلوں میں

۴۔ آل عمران: ۱۴۷

۸۔ الانفال: ۸

اسلام کی کونپل پھوٹے گی اور سرسبز درخت میں بدل جائے گی۔

بیعتِ رضوان میں شریک صحابہ کو درخت کے نیچے اپنے رسول کے ہاتھوں پر اپنی بیعت یاد آ گئی۔ آخری سانس تک اسلام کی خاطر جہاد کرنے کی بیعت، بیعتِ رضوان کی وجہ بھی تو ایک مسلمان کے ناحق خون کی خبر (جو دراصل افواہ تھی) تھی اور یہ بیعت ان ایمان والوں نے کفر کے مرکز کے دامن میں کی اور اس عالم میں کہ ان کے پاس تلواروں کے علاوہ کوئی ہتھیار نہ تھا۔ نہ نیزے، نہ ڈھالیں، نہ خود، نہ زرہ بکتر، مگر یہ مسلمان دنیاوی اسباب اور نتائج کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے اور انہیں یہ قوت ان کے رسول نے عطا کی تھی جس نے اپنے ساتھیوں کو توکل علی اللہ کی عظیم ترین مثال بنا دیا تھا۔ یہ وہ تھے کہ جنہیں صرف یہ یاد آیا کہ ان کا فرض کیا ہے اور نتیجے کی انہیں کیوں فکر ہوتی کیونکہ نتائج تو ان کا رب مرتب فرماتا تھا۔ سلام اور درود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کے ساتھیوں پر۔

معرکۂ موتہ میں شریک ہونے والے مجاہدوں نے ان باتوں کو اپنے ذہن میں دہرایا اور ایک دوسرے کو اپنی فکر میں شریک کیا اور یہ طے کیا کہ وہ اپنا فرض انجام دیں گے اور کفر کے اس سیلاب سے ٹکرا کر انسانیت کے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔

صحابۂ کرام کا دل ٹھہر گیا اور معان میں دو راتیں گزارنے کے بعد اس لشکر نے رومیوں کی طرف پیش قدمی شروع کی، یہ پیش قدمی کوہسار پر تتلی کی یلغار کی طرح تھی، اور اس وقت کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ یہ رومی شہنشاہیت کے خاتمے کا دیباچہ ہے۔ انسانی اخلاق فولاد اور آہن سے ٹکرا کر انسانیت کو سرخ رو کرنے جا رہا تھا۔

بلقا کے مقام مشارف میں ہرقل کی فوجیں اور مختصر سا اسلامی لشکر دونوں آمنے سامنے تھے۔ مسلمان ''موتہ'' کی جانب خیمہ زن ہوئے اور تین ہزار مجاہدوں نے دو لاکھ لشکریوں کے مقابل صف آرا کی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش بینی کے مطابق لشکرِ اسلام کے سالارِ اول حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے، اور شہادت یوں پائی کہ جیسے انہوں نے عروسِ اجل کو گلے سے لگا لیا۔ وہ دشمن کی صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے قلبِ لشکر میں گھس گئے۔ نیزے ان کے جسم میں گھس گئے۔

ادھر مدینۂ منورہ میں اللہ تعالیٰ اس معرکے کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں دکھا رہا تھا کہ سارے فاصلے سمٹ گئے تھے اور جنگ کی تفصیلات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم یوں دیکھ رہے تھے جیسے انسان اپنے کفِ دست کی لکیروں کو دیکھتا ہے۔ اسلامی پرچم کو زید رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے سنبھال لیا اور یوں دادِ شجاعت دی کہ جوانانِ روم کے قدم اکھڑنے لگے۔ جب جنگ میں شدت آئی تو حضرتِ جعفرؓ نے اپنے گھوڑے کی کوچیں کاٹ دیں اور گھوڑے سے کود پڑے کہ کہیں گھوڑا جنگ کی تاب نہ لاکر راہِ فرار اختیار نہ کرے۔ دشمنوں پر وار کرتے ہوئے اان کے واروں کو روکتے ہوئے حضرت جعفرؓ کا داہنا ہاتھ کٹ گیا اور انہوں نے جھنڈا اپنے بائیں ہاتھ میں سنبھال لیا۔ جب اللہ کے شیر کا بایاں ہاتھ بھی کٹ گیا تو اسلامی پرچم کو سرنگوں ہونے سے بچانے کے لئے جعفر رضی اللہ عنہ نے پرچم کو کسی طرح اپنے سینے سے لگایا اور جب انہیں وہ زخم لگا جو ان کی شہادت کا سبب بنا تو پرچم کو گرنے سے پہلے حضرت عبداللہ بن رواحہ نے سنبھال لیا۔ ادھر مدینۂ منورہ میں جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو بتا رہے تھے کہ لو جعفر بھی اپنے خالق کے حضور پہنچ گئے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جنگِ موتہ کے غازیوں میں شامل تھے۔ صحیح البخاری کی کتاب المغازی میں ان کی روایت ہے کہ میں نے غزوۂ موتہ میں جعفر کی لاش پر کھڑے ہو کر ان کے زخم کا شمار کیا تو ان کے جسم پر پچاس زخم تھے اور ان میں سے کوئی زخم پشت پر نہیں تھا۔ (۶)

ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (اور آپ کے صحابہ) کے اخلاق کے اس مطالعے میں واقعاتی تفاصیل سے گریز کیا ہے لیکن غزوۂ موتہ کے فوق البشر معرکے کی کچھ تفصیل اس لئے پیش کی جا رہی ہے کہ اس کے بغیر نہایت بلند اخلاقی اوصاف، ثابت قدمی، توکل علی اللہ اور اللہ و رسول کی اطاعت اور ان صفات کے اجر کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حضرت جعفر کو اللہ تعالیٰ نے یہ اجر عطا کیا تو انہیں بہشت میں دو بازو عطا کئے اور ان بازوؤں کی مدد سے وہ جنت کی فضاؤں میں پرواز کرتے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں ذوالجناحین اور جعفر طیار کا لقب مل گیا۔ دنیا

۶۔ بخاری: کتاب المغازی۔ باب ۵۱۲

میں بھی حضرت جعفر کا یہ لقب ان کا نشان ٹھہرا، صحیح البخاری میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

كَانَ ابن عمر اِذَاحيَّا ابن جعفر قَالَ السلامُ عليکَ يا ابنِ ذِی الجنا حَين (۷)

حضرت ابنِ عمر (رضی اللہ عنہٗ) جب جعفر (رضی اللہ عنہ) کے بیٹے کو سلام کرتے تو کہتے اے ابنِ ذی الجناحین (دو بازوؤں والوں کے بیٹے) آپ پر سلام ہو۔

اور ان جانثاروں کی شہادت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی شہادتوں کے منظر معجزے کے طور پر دکھائے گئے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے جاتے تھے کہ اب علَم زید کے ہاتھوں میں ہے اور اب زید شہید کر دیے گئے۔ اب علَم جعفر کے ہاتھوں میں ہے، اور جعفر بھی شہید ہو گئے۔ اب ابن رواحہ نے علَم اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ پھر وہ بھی شہید ہو گئے اور پھر علَم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے، یہاں تک کہ اللہ نے ان کے ہاتھ پر فتح عنایت کی۔ صحیح البخاری کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فان اخذ الرأية سيفٌ من سيوفِ اللهِ حتى فتح الله عليها (۸)

اور پھر علم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالد بن ولید) نے علَم اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور اللہ نے اس ہاتھ پر فتح عنایت فرمائی۔

غزوۂ موتہ کے نتائج اور اثرات کے بارے میں واقعات کے بیان کے بعد ہم گفتگو کریں گے، لیکن اس حدیث کی روشنی میں یہ کہنا درست ہوگا کہ غزوۂ موتہ میں بھی مسلمانوں کو آخرالامر فتح حاصل ہو گئی اور یہ فتح اسی نوعیت کی تھی جیسے صلح حدیبیہ کو ربِ جلیل نے ''فتح مبین'' قرار دیا تھا۔ صلح کے موقع پر حکمتِ صلح حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابیٔ کبیر پر بھی روشن نہیں

۷۔ بخاری: کتاب المغازی۔ باب ۵۱۲

۸۔ ایضا

ہوئی تھی۔ بعد کے واقعات کے سلسلے نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو واضح کر دیا۔

اب آیئے غزوۂ موتہ کے واقعات کی طرف۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے لشکرِ اسلامی کی کمان سنبھالتے ہی ذاتی شجاعت اور فنِ حرب میں مہارت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ انہیں اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے جرنیل اور کمان دار کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سارے دن رومیوں کے مقابل قتال کرتے رہے، اور اس شان سے کہ رومی سپاہی ان کے سامنے آنے سے کترا رہے تھے۔ خالد بن ولیدؓ اپنی موت کے تصور سے بھی بے نیاز ہو کر دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے۔ حضرت خالدؓ سے حضرت قیس بن ابی حازم نے روایت کیا ہے کہ غزوۂ موتہ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں جہاد کرتے ہوئے ٹوٹی تھیں، اور میرے ہاتھ میں یمن کی بنی ہوئی چوڑے پھل کی تلوار رہ گئی تھی۔ (۹)

حضرت خالد بن ولیدؓ رومیوں کو جہنم پہنچاتے رہے اور ان کا ذہن مسلسل یہ سوچ رہا تھا کہ کس طرح مسلمانوں کو میدانِ جنگ سے نکالیں، اور اس طرح کہ دشمن کو تعاقب کی ہمت نہ پڑے۔ جنگِ احد میں جب خالد بن ولیدؓ قریش کے لشکر میں تھے تو انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ قریش جنگ کو اپنے حق میں نہ موڑ سکے اور یہ عجب ماجرا ہوا کہ بظاہر شکست خوردہ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا۔

مومن اللہ کے نور میں چیزوں کو دیکھتا ہے، اور خالد کے ذہن میں ایسی حکمتِ عملی آئی کہ تباہی سلامتی میں بدل گئی۔ دوسرے دن جب جنگ شروع ہوئی تو حضرت خالدؓ مقدمہ کی جگہ ساقہ کو لے آئے، یعنی پہلی صفوں میں جو سپاہی تھے ان کی جگہ پچھلی صفوں کے سپاہیوں نے لے لی اور اسی طرح آپ نے میمنہ کے سپاہیوں کو میسرہ میں بھیج دیا اور میسرہ کے سپاہی میمنہ میں آ گئے۔ نئے چہروں کو دیکھ کر رومی پریشان ہو گئے۔ اللہ جل جلالہ نے ان کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب اور دبدبہ قائم کر دیا اور وہ سمجھے کہ مسلمانوں کی مدد کے لئے تازہ دم فوج آ گئی۔ تھوڑی دیر کی جنگ کے بعد اپنی صفوں کو درست اور قائم رکھتے ہوئے حضرت خالد نے اپنے لشکر کو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانا شروع کر دیا۔ رومی سمجھے کہ یہ مسلمانوں کی عسکری چال ہے اور شاید ان کے مزید سپاہی پیچھے

۹۔ بخاری: کتاب المغازی

موجود ہیں کہ یہ ان کے ساتھ مل کر زبردست حملے کرنے جا رہے ہیں، یا پھر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ رومی صحرائی علاقے میں آ جائیں۔ کیونکہ عرب صحرائی جنگ میں ان پر یقیناً سبقت رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رومی اپنے علاقے کی طرف سمٹ گئے اور اسلامی لشکر بحفاظت مدینۂ منورہ پہنچ گیا۔

جنگ میں فتح و شکست کا اندازہ نتائج و عواقب سے لگایا جاتا ہے۔ رومی اس عہد کی عالمی سپر پاور تھے اور مسلمان ان سے جا ٹکرائے اور وہ بھی ان کے علاقے میں۔ پھر عددی تفاوت پر نظر ڈالئے۔ دو لاکھ کے مقابلے میں تین ہزار سپاہی۔ یعنی کچھ کم سات سو رومی سپاہیوں کے مقابل ایک مسلمان سپاہی۔ دنیا کی عسکری تاریخ نے ایسا معرکہ نہیں دیکھا تھا۔ نتیجتاً دور و نزدیک کے علاقوں میں غزوۂ موتہ کی داستانیں اور مسلمانوں کی شجاعت کے قصے پھیل گئے۔ ویسے بھی کافر کا دل موت سے لرزتا ہے۔ خود عرب کے مشرک اور عیسائی کانپ اٹھے اور انہیں اپنا مستقبل نظر آنے لگا۔ معرکۂ موتہ مستقبلِ قریب میں مسلمانوں کی وسیع اور متواتر فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

جنگوں کا فیصلہ محض اسلحۂ جنگ اور عددی برتری سے نہیں ہوتا بلکہ جنگیں اخلاق کی قوت سے جیتی جاتی ہیں۔ اللہ مسلمانوں کی نگہبانی فرماتا ہے اور ان کے ذریعے عالمِ اسباب میں اپنی مشیت نافذ فرماتا ہے۔

جنگِ موتہ کے کئی اور پہلو اخلاقی نقطۂ نظر سے مطالعے کے مستحق ہیں۔ پہلی بات تو شجاعت کے انداز اور نمونے (Pattern) کی ہے۔ اس معرکے میں مسلمان شہدا کی تعداد بارہ ہے جس میں تین سالارانِ لشکر بھی شامل ہیں۔ اس سے ہمیں مسلمان سرداروں اور سربراہانِ شعبۂ جات حیات کی اس اخلاقی صفت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ خطروں کے مواقع پر سب سے آگے ہوتے تھے اور اپنے ساتھیوں اور ہمراہیوں تک خطرات کو آنے سے روکتے تھے، ورنہ اُس عہد کے معرکوں کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آج کی طرح سالار اپنے سپاہیوں کی حفاظت میں اگلی صفوں سے پیچھے ہی رہتے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے ان کے ماتحت اور سپاہی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے تھے۔ جنگِ موتہ میں مسلمان امیرانِ لشکر نے اس بے خوفی اور جگر داری سے دادِ شجاعت دی کہ رومی فوجی ان میں ہی الجھ کر رہ گئے، اور حضرتِ جعفرِ

طیارؓ کی نعش کی کیفیت کی بیان کردہ تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ان کے جسم پر زرہ بکتر نہیں تھی۔ شہادت کی موت کے ان عاشقوں سے بھلا کون بازی لے جا سکتا ہے۔ جانثاری کی یہ روایت غزوۂ بدر ہی سے شروع ہو گئی تھی جب حضرت عوف بن حارث رضی اللہ عنہ نے شوقِ شہادت میں اپنی زرہ اتار دی اور دشمن کی صفوں میں گھس کر جنگ کرتے ہوئے شہادت پائی۔

جنگِ موتہ کے رومی مقتولین کی تعداد ہمیں نہیں معلوم، لیکن اس بات سے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس دن حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں سے نو تلواریں ٹوٹیں، اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی شجاعت اور حکمتِ عملی سے رومی فوج نے پیش قدمی کی جگہ پیچھے ہٹنے میں عافیت جانی۔

جب غزوۂ موتہ کے مجاہد مدینۂ منورہ واپس پہنچے تو صحابۂ کرام کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکلے۔ جب غزوۂ موتہ کے مجاہد شہر میں داخل ہونے لگے تو کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ میدانِ جنگ سے بھاگ کر آنے والے ہیں۔ اس پر زبانِ رسالت سے یہ کلمات بلند ہوئے کہ یہ بھاگ کر آنے والے نہیں بلکہ پلٹ کر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ ''فراری'' نہیں بلکہ ''کراری'' ہیں۔ آپ کے یہ الفاظ غزوۂ تبوک کی پیش بینی اور پیش گوئی کا درجہ رکھتے ہیں۔ معرکۂ موتہ کے بعد غزوۂ تبوک نے دنیا کی سپر پاور روم کی ہیبت و سطوت کے قلعوں میں شگاف ڈال دیئے اور بعد میں سلطنتِ روما نے حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمانوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کی عظمت و ''کبریائی'' داستانِ پارینہ بن گئی اور معرکہ موتہ اور غزوۂ تبوک کی ایسی ہم رشتگی کی بنا پر فتح مکہ کے ذکر سے پہلے غزوۂ تبوک کا ذکر (تاریخی تسلسل کو قدرے مجروح کرتے ہوئے) مناسب معلوم ہوتا ہے۔ غزوۂ تبوک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی محاسن اور اُبھر کر سامنے آئے۔ عسرت اور سختیوں کا مقابلہ کیسے کیا جاتا ہے؟ اور صدق کی وسعتیں اور اہمیت کیا ہے؟ یہ غزوۂ تبوک سے پوچھئے۔ صحابہ کی یہ پامردی اور صدق شعاری نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی تقلید کا کامل نمونہ ہے۔

غزوۂ تبوک

انفاق فی سبیل اللہ کی لافانی مثالیں

غزوۂ موتہ نے اسلام کو عالمی باطل قوتوں کا مقابل بنا دیا۔ اس کے فوراً ہی بعد فتحِ مکہ نے اسلام کو جزیرہ نمائے عرب کی غالب ترین قوت بنا دیا، اگرچہ مرتے ہوئے کفر کی حرکتِ مذبوحی نے جارحیت کا لبادہ اوڑھ کر غزوۂ حنین کو اسلامی تاریخ کا حصہ بنایا۔ جنگِ موتہ کے بعد رومیوں کو شدت سے احساس ہوا کہ اسلام اب پیش قدمی کے مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ تین ہزار سپاہیوں نے دو لاکھ رومی فوجیوں کے مقابل سرخ روئی حاصل کر کے ان کی ساکھ کو نقصان پہنچایا تھا۔ اللہ کے ان سپاہیوں کو اس بات پر بھی یقین کامل تھا کہ ان معرکوں کا مقصد یہ ہے کہ اسلام تقدیرِ کائنات اور تقدیرِ انسان بن کر رہے اور دوسرے تمام نظاموں پر غالب آ کر رہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝ (۱)

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ ہر دین (اور نظام) پر غالب آ کر رہے۔ اور اس حقیقت پر گواہی دینے کے لئے اللہ کافی ہے۔

۱۔ الفتح: ۲۸

ہمارے ہاں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسلام مذہب نہیں دین ہے، اور دوسرے نظام، مذہب ہیں۔ قرآنِ حکیم اس حقیقت پر شاہد ہے کہ دوسرے باطل نظام بھی ''دین'' ہیں۔ وہ راستے جو ہر معاملے میں اللہ کے عطا کردہ دین کی مخالفت کرتے ہیں۔

یہ ایک ضمنی مگر بنیادی بات جملۂ معترضہ بن کر آگئی۔ رومیوں نے اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کے پیشِ نظر یہ حقیقت سمجھ لی کہ اسلام ایک سیلِ زمیں گردِ جہاں گیر بننے والا ہے، اور اس کے اثر ونفوذ کو اس وقت نہ روکا گیا تو پھر اس کا مقابلہ ممکن نہ ہوگا۔ جنگِ موتہ نے رومی سرحدوں میں روم کے اقتدار کو للکارا تھا۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر قیصرِ روم نے جنگِ موتہ کے چند مہینوں کے بعد ہی ایک فیصلہ کن جنگ کی ٹھان لی۔ اس معرکے کے لئے اس نے عرب کے عیسائی قبائل کو بھی آمادہ کیا۔ شام کے علاقے سے واپس آنے والے تاجر رومیوں کی تیاری کی خبر لے کر آتے تھے۔ مدینے کی شہری ریاست میں خبرداری اور جاسوسی کا نظام خاصا منظم تھا، اسی لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رومیوں، آلِ غسان اور دوسرے قبائل کی عسکری تیاریوں اور سرگرمیوں کی خبریں مل رہی تھیں۔ اس پر اضافہ کیجئے منافقوں کی کدورتوں اور سازشوں کا جس کی علامت مسجدِ ضرار ہے۔ اُدھر مسلمان رومیوں کے خطرے سے عہدہ برآ ہونے کی تدابیر کر رہے تھے اور ادھر منافقوں نے اپنے گمان کے مطابق اسلام میں انتشار پیدا کرنے کے لئے ایک مسجد کی تعمیر شروع کی اور یہ سازش بہت گہری تھی۔ انہوں نے باہمی مشورے سے یہ بات طے کی کہ مسجد میں پہلی جماعت کی امامت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں تاکہ اہلِ مدینہ میں مسجد کا اعتبار قائم ہو اور پھر یہ مسجد ابو عامر ''راہب'' کے حوالے کردی جائے اور اس میں اسلحہ جمع کیا جائے کہ ایک طرف رومی مدینے پر حملہ کریں تو دوسری طرف خانہ جنگی کا آغاز ہو، لیکن وہ یہ بھول گئے کہ ربِ محمد ﷺ ان کے سینوں میں چھپی ہوئی ہر سازش اور ہر تدبیر سے باخبر ہے۔

موسم سخت تھا۔ مدینے میں خاصے دنوں سے بارش نہیں ہوئی تھی اور عسرت وتنگ دستی کے زمانے میں کھجوروں کی فصل تیار تھی۔ کھجوروں کو توڑنے، انہیں خشک کرنے اور ذخیرہ کرنے کے اہم کام درپیش تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کی تیاری کا اعلان فرمادیا اور یہ اعلان بہت صاف تھا۔ آپ نے جہاد کی تیاری کرنے والوں کو بتادیا کہ تبوک کا سفر کرنا ہے اور

رومیوں کو ان کی سرحدوں پر روک کر ان کے خلاف پیش قدمی کرنی ہے۔ اس سے پہلے آپ کی سنت یہ تھی کہ لشکر کی منزل اور راستے کے بارے میں اخفا فرماتے تھے، لیکن شام کی سرحد تک سفر بہت مشکل اور کٹھن تھا اسی لئے شرکائے جہاد کو تمام نشیب وفراز اور آنے والی آزمائشوں سے باخبر کرنا ضروری تھا۔ اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ مجاہدوں کی جاں فروشی اور شوقِ شہادت کھل کر سامنے آجائے اور وہ ثبات وحوصلے کے ساتھ رومیوں سے جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیں۔ مدینہ، مدینے کی مضافاتی بستیوں اور مکہ معظمہ میں بھی اہلِ ایمان کو اس ہونے والے معرکے کی اطلاع دے دی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاریوں کے لئے مسلمانوں سے سامانِ جنگ، رسد اور ہر قسم کے عطیات کی اپیل کی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ ہر طرف سے مسلمانوں کے قبائل مدینۂ منورہ میں جمع ہونے لگے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ بھی ساتھ لے آئے اور انصار ومہاجرینِ مدینہ نے اللہ اور رسول کی خوشنودی کے لئے مال ودولتِ دنیا کو ''بتانِ وہم وگماں'' سمجھتے ہوئے راہِ خدا میں قربان کردیا۔ یہ اُس نبی کے شیدائی تھے جس نے دنیا کی ساری دولت کو ایک مسلمان کے چہرے پر پیدا ہونے والی مسکراہٹ سے کم سمجھا۔ اسلام نے اقتدار، تفاخر اور دولت کے بتوں کو مسلمان کے خانۂ دل سے نکال دیا۔ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی مسلمان کی نظر آخرت پر رہتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے بار بار اس دنیا کی زندگی کو دھوکہ اور فریبِ نظر اور فریبِ فکر قرار دیا ہے۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ مسلمان کاروبارِ حیات سے کنارہ کش ہوجائے۔ مفہوم یہ ہے کہ نظر عاقبت پر رہے اور اس حقیقت پر کہ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ دنیا تو ایک آزمائش ہے، کافر اسی دنیا اور اس کے عیش وآرام میں گم ہوجاتا ہے اور مومن اس دنیا میں ہر جدوجہد آنے والی زندگی کے لئے کرتا ہے۔ اس دنیا کا مال ومتاع اسے اپنی منزل سے بے خبر نہیں کرتا اور وہ اپنے اصل ٹھکانے کو نہیں بھولتا۔ ویسے اس دنیا کی لذتوں میں گم ہوجانا بہت سہل ہے، صرف اللہ کی محبت اور خیالِ عقبیٰ ہی اس سے بچا سکتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ

الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ

وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ O (۲)

انسانوں کے لئے مرغوباتِ نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، (اعلیٰ نسل کے) چنے ہوئے گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنائی گئی ہیں (مگر یہ سب اسی چند روزہ) دنیا کا مال ومتاع اور سامان ہیں اور بہتر ٹھکانا تو اللہ کے پاس ہے۔

اور اسی سلسلۂ کلام میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس بہتر ٹھکانے کی نشان دہی کرائی ہے۔ وہ ٹھکانا تقوے سے حاصل ہوتا ہے۔ جنت کے باغوں میں آبِ رواں ہے اور ہیشگی کی زندگی۔ اس ہیشگی کی زندگی میں پاکیزہ بیویاں رفاقتِ ابدی کے لئے ہیں اور اللہ کی رضائے مسلسل ان جنتیوں کے لئے اور اس ہیشگی کی جنت کے مقابل

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ O (۳)

اور اس دنیا کی زندگی کیا ہے، سوائے دھوکے کی ٹٹی کے اور ظاہر فریبی کے۔

اور دھوکا ہونے کے ساتھ ساتھ اس دنیا کا سارا سرمایہ جو فساد فی الارض، ناہمواریوں، مناقشات کا سبب بنتا ہے کتنا چھوٹا اور کم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ربانی پیغام لے کر انسانیت کی طرف آئے اس کی اصل واساس دنیا کی یہی بے وقعتی ہے۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِیْلًا O (۴)

اے رسول کہہ دیجئے کہ دنیا کا سرمایہ اور پونجی بہت مختصر ہے اور آخرت تقویٰ اختیار کرنے والے کے لئے بہت بہتر ہے اور تم پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ آل عمران: ۱۴

۳۔ آل عمران: ۱۸۵

۴۔ النساء: ۷۷

تقویٰ مومن کے مجموعی طرزِ حیات وعمل کا نام ہے۔ اس دنیا اور اس کی زینتوں سے دل اُٹھائے بغیر تقویٰ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے حصول کے نسخے کا جزوِ اعظم انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ انفاق تزکیے کا راستہ ہے جس میں خرچ کی جانے والی دولت، بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ اس کو قرآنِ حکیم نے کھیتی کی مثال کے ذریعے پیش کیا ہے۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْۢبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ ؕ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ O اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ O (۵)

جو لوگ اپنے مال اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں، اور ہر بالی میں سو دانے ہوں اور اللہ جس (عمل اور چیز) کو چاہتا ہے فراوانی عطا کرتا ہے اور بڑھا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کشادگی والا اور علیم ہے۔ جو لوگ اپنا مال ومتاع اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور پھر نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ (کسی کو) ایذا دیتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ تو خوف ہوگا اور نہ حزن وغم گیتی۔

ان آیات میں انفاق کی برکات، اس کے اخلاقی پہلو اور معاشرے پر اس کے اثرات سب سمٹ آئے ہیں۔ زکوٰۃ، انفاقِ فی سبیل اللہ کا ایک جز ہے جسے اسلام کے ارکان میں شامل کردیا ہے۔ یوں انفاق شرائطِ ایمان میں بھی شامل ہے اور مسلمان کی اخلاقی صفات میں بھی۔ ان آیات میں اخلاقی پہلو کو یوں اُبھارا گیا ہے کہ اللہ کے راستے میں مال خرچ کرنے والے نہ تو کسی پر احسان جتائیں اور نہ ایذا رسانی کریں۔ احسان جتانا خود ایذا رسانی ہے کیونکہ احسان جتانے والا دوسرے کی عزتِ نفس سے کھیلتا ہے، اور انفاق کا بنیادی رشتہ خود اپنی ذات کے

۵۔ البقرہ: ۲۶۱، ۲۶۲

استحکام سے ہے کیونکہ یہ کائنات انفاق کے عمل سے مومن کی ذات میں گم ہو جاتی ہے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غزوے کے لئے مسلمانوں کو سامانِ جنگ، وسائل حمل ونقل، اجناس اور دوسری ضروریات کی فراہمی کے لئے تعاون کی دعوت دی تو یوں لگا کہ انفاق کی گھٹا برسنے کے لئے آسمانِ اخلاق پر تُلی کھڑی تھی۔ ہر طرف سے عطیات کی بارش ہونے لگی۔ یہ دل کے غنی افراد کا معاشرہ تھا اور مال و دولتِ دنیا کو خاطر میں نہ لانے والوں کا معاشرہ تھا۔ آسودہ دل اور حاجات سے بے نیازی کا مرقع تھا۔ بے نیازی سے مراد یہ ہے کہ افراد کا سرمایہ، معاشرے کا سرمایہ تھا۔ ہر شخص رسول کی دعوت پر سب کچھ لے کر یوں دوڑا آیا جیسے دنیا میں غرق معاشروں میں عزت لینے کے لئے دوڑتے ہیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے شام بھیجنے کے لئے ایک تجارتی قافلہ تیار کیا تھا۔ قافلے میں دو سو اونٹ تھے۔ سامانِ تجارت خریدنے کے لئے حضرت عثمانؓ نے کم وبیش تیس بتیس سیر چاندی الگ کر دی تھی۔ انہوں نے یہ اونٹ اور چاندی اپنے رسول کی خدمت میں پیش کر دی۔ اس کے بعد اس امت کے غنی رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ اور خرید کر غزوے کے لئے پیش کیے اور ایک ہزار دینار حضور کے قدموں میں لا کر رکھ دیئے۔ اس عمل سے دیناروں کا سونا اور بھی چمکنے لگا۔ عثمانِ غنیؓ یوں ہی سامان جمع کرتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے رہے یہاں تک کہ سونے چاندی کے سکوں کے علاوہ آپ نے مجاہدوں کے لئے نو سو اونٹ اور سو گھوڑے فراہم کر دیئے۔ نبی مکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرے پر خوشی کی کرنیں یوں چمکنے لگیں کہ مدینہ منورہ کا منور ماحول اور بھی روشن اور پرنور ہو گیا۔ جو ذاتِ مقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لئے متاعِ دنیا کو ایسا بوجھ سمجھتی تھی کہ کاشانہ نبوت میں اگر نہایت معمولی مقدار میں سونا پڑا رہ جاتا تو آپ اس وقت تک سو نہیں پاتے تھے جب تک اسے راہِ مولائے کریم میں صدقہ نہ کر دیتے۔ اس دن حضرت عثمان غنیؓ کے پیش کردہ دینار، ان کی چمک اور ان کی جھنکار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس درجے بھلی لگ رہی تھی کہ آپ ان کو اپنے دامن سے فرش پر ڈالتے جاتے اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مرتبے پر اپنے اصحاب کو باخبر کرتے جاتے۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے بعد عثمانؓ کے کسی عمل کا

نقصان انہیں نہیں پہنچے گا۔ اس جملے میں حضرت عثمانِ غنیؓ کے اخلاق اور کردار پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد بھی ہے اور آپ کی دعا بھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت عباس، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم نے دل کھول کر عطیات پیش کئے تھے۔ حضرت عاصم بن عدی نے ۱۵ ہزار سیر کھجور کے ذخائر مجاہدوں کے لئے پیش کر دیئے۔ مدینۂ منورہ کی مومن عورتوں کے پاس جو زیور تھے وہ انہوں نے پیش کر دیئے۔ عورت کی فطرت میں آرائش وزیبائش کا جو شوق ہے اس کو نظر میں رکھئے تو اس ایثار کی پنہائیوں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ حضرت ابو عقیل انصاری رضی اللہ عنہ نے رات بھر ایک کھیت کو کنویں سے پانی نکال کر سینچا اور رات بھر کی اس مشقت کے معاوضے کے طور پر انہیں چار سیر خشک کھجوریں ملیں۔ دو سیر کھجوریں وہ بیوی بچوں کے لئے چھوڑ آئے اور دو سیر کھجوریں آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کھجوروں کو قیمتی مال واسباب کے اوپر رکھ دو تاکہ برکت ہو یا آپ نے فرمایا کہ انہیں تمام عطیات کے اوپر بکھیر دو۔ یہ تھا ایک غریب صحابی کے خلوص کا اعتراف۔ سچ ہے کہ خلوص ہی اعمال کے وزن کا پیمانہ ہے۔ اسی موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے اثاثے کا آدھا حصہ خدمتِ نبوی میں پیش کر دیا اور حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنا مکمل سرمایہ اور اثاثہ اپنے نبی کے قدموں میں رکھ دیا۔ یہ عظیم مثال، تاریخ میں بے مثال ہے اور اسے علامہ اقبال نے اپنے بے مثال اسلوب میں نظم کر دیا، اس طور پر کہ پوری صورتِ حال آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے:

اک دن رسولِ پاک نے اصحاب سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مال دار
ارشاد سن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اُٹھے
اس روز ان کے پاس تھے درہم کئی ہزار
دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا قدم آج میرا راہوار
لائے غرض کہ مال رسولِ امیںؐ کے پاس

ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار
پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے ''اے عمر!
اے وہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار
رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا؟
مسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار
کی عرض نصف مال ہے فرزند زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار
اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار
لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار
مِلکِ یمین و درہم و دینار و رخت وجنس
اسپ قمر سم و شتر و قاطر و حمار
بولے حضور چاہئے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار
اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار
پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول ﷺ بس

عطیات وصدقات اور مالی تعاون سے قطعِ نظر مدینۂ منورہ اور مدینے کی قریبی بستیوں سے مسلمانوں کے ہجوم مدینے کا رخ کر چکے تھے۔ ان میں سے بہت سے نئے مسلمان تھے لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں نے ایک بار بھی شرکت کرنے والوں کے قلب ونظر کی دنیا بدل دی تھی۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے اور جان دینے کو یہ نسخۂ بقائے دوام سمجھتے

تھے، لیکن تبوک تک کے طویل سفر کے لئے مسلمانوں کے پاس سواریاں نہیں تھیں۔ بیماروں اور ضعیفوں کے علاوہ زادِ سفر نہ رکھنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس سفر جہاد میں شریک نہ ہو سکنے والے کے بارے میں فرمایا کہ ان پر اعتراض کی گنجائش نہیں، اور جن کے لئے سواریاں مہیا نہ کی جا سکیں اُن کے اخلاق واخلاص اور اسلامی کردار کو قرآنِ حکیم نے ایک آیت میں یوں سمیٹ لیا ہے کہ ایک آیت بیان کا دفتر بن گئی ہے۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ O (۶)

اور ان لوگوں پر بھی تنقید اور اعتراض کی گنجائش نہیں جنہوں نے خود حاضر ہو کر آپ سے سفر کے لئے سواریوں کی درخواست کی اور جب آپ نے کہا کہ تمہارے لے جانے کے لئے سواریاں نہیں تو وہ لوٹ گئے اور اس طرح کہ ان کی آنکھوں سے رنج والم کے آنسو جاری تھے (اور وہ اس بات پر افسردہ تھے) کہ وہ اپنے طور پر جہاد میں شرکت کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔

اور ایک گروہ وہ بھی تھا کہ ان کے پاس دولت اور وسائل تھے لیکن انہوں نے پیچھے رہ جانے اور اپنے گھروں میں بیٹھے رہنے کو پسند کیا۔ قرآن پاک نے ان کے بارے میں واشگاف انداز میں فرمادیا کہ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر ٹھپا لگا دیا اور وہ اس حقیقت تک نہ پہنچ سکے کہ ان کا رویہ کس طرح اور کس حد تک ان کی تباہی کا سبب ہوگا۔ (۷) یہ لوگ اپنے نفاق میں اس درجے جری تھے کہ بہانے کر کے اور عذر تراش کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہ جانے کی اجازت طلب کرتے۔ اللہ کا رسول ان کی منافقت سے خوب واقف تھا اور انہیں گھروں پر رہ جانے کی اجازت دے دیتا۔ اس پر یہ بڑی ڈھٹائی سے

۶۔ التوبہ:۹۲

۷۔ التوبہ:۹۳

دوسروں کومشورہ دیتے کہ اس گرمی میں گھروں ہی میں رہنے میں عافیت ہے۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝ (۸)

یہ پیچھے رہ جانے والے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانے کے بعد اپنے گھروں میں بیٹھے رہنے پر خوش ہیں۔ انہوں نے اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرنے کو ناپسند کیا اور انہوں نے دوسروں سے بھی کہا کہ اس گرمی میں (جہاد کے لیے) مت نکلو۔ ان سے کہہ دیجیے کہ جہنم کی آگ تو اس سے کہیں زیادہ شدید اور گرم ہے۔ کاش یہ لوگ (اپنے نفع نقصان کو) سمجھتے ہوتے۔

غزوۂ تبوک کی بڑی اہمیت اس نکتے میں بھی ہے کہ منافقوں کے بارے میں تواضع کو اختیار کرنے والے رسول سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ آپ ان میں سے کسی کے لئے استغفار نہ فرمائیں، کسی کی نمازِ جنازہ ادا نہ فرمائیں اور کافروں کے ساتھ ساتھ منافقوں پر بھی شدید ہو جائیں (۹) سورۂ توبہ کی تفہیم غزوۂ تبوک کے حوالے کے بغیر ممکن نہیں۔ اور رب ذوالجلال نے ان مومنوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے جو محنت مزدوری کر کے اپنے معاوضے اور یافت کو ملت کی بہبود کے لئے پیش کر دیتے تھے۔ ایک انصاری صحابی کی دو سیر کھجوروں کے عطیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر دانی اور اعتراف خلوص کا واقعہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ منافق اس خلوص کا مذاق اُڑاتے اور نتیجتاً اللہ تعالیٰ نے ان کی جڑ کاٹ دی۔ ان منافقوں نے غزوۂ تبوک سے جان ''چھڑانے'' کے لئے جو عذر تراشے ان میں ڈھٹائی، بے حیائی کے ساتھ ساتھ تمسخر کا بھی پہلو تھا۔ اور تمسخر بھی کس کے ساتھ؟ اللہ کے رسول کے ساتھ۔ جب غزوۂ تبوک کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ بنوسلمہ کے جد بن

۸۔ التوبہ: ۸۱

۹۔ التوبہ: ۷۳

قیس سے کہا کہ کیا تم رومیوں سے جہاد کا ارادہ رکھتے ہو۔ اس بد بخت نے جواب دیا کہ ''یا رسول اللہ! مجھے معاف رکھیں۔ مجھے فتنے میں مبتلا نہ کریں۔ واللہ! میری قوم جانتی ہے کہ عورتوں سے مجھے جتنی رغبت ہے کسی دوسرے کو نہیں۔ جب رومیوں کی گوری گوری عورتوں کو دیکھوں گا تو صبر نہیں کر سکوں گا اور گناہ میں مبتلا ہو جاؤں گا۔''

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا تقاضا تھا کہ رومیوں کا مقابلہ کرنے جو لشکرِ اسلام جا رہا تھا اس کا ہر سپاہی اخلاق کی بلندی، بے غرضی، حبِ الٰہی اور اطاعتِ رسول کی تصویر ہو، اس میں کوئی دنیاوی لالچ اور غرض نہ ہو، اس لئے منافق اور مذبذب اور ایمان کے کمزور مسلمان بھی جھٹک کر الگ کر دیئے۔ ہم نے معرکۂ موتہ اور غزوۂ تبوک کو ہم ردیف بنانے کے لئے تاریخی ترتیب بدل دی، مگر قارئین کرام غزوۂ حنین کو یاد کریں جب، کہ مسلمانوں کے ذہن میں اپنے مشن کی عظمت اور دین حق کی حقانیت اور مقصد کی سربلندی کی جگہ اپنی عددی برتری کا غرور پیدا ہو گیا تھا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جب ہم تعداد میں کم تھے اور ہمارے ہتھیار بھی کافروں کے اسلحۂ جنگ سے معیار میں کم تر تھے تو بھی کافروں کو مسلسل شکست ہوتی رہی اور آج ہمارا کون مقابلہ کرے گا۔ وقتی طور پر مسلمان یہ نکتہ بھول گئے تھے کہ فتح تو اللہ کی خوشنودی سے حاصل ہوتی ہے اور مسلمان کا کام تو فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر اپنا فریضہ انجام دینا ہے۔ تبوک کے راہی وہ تھے جو اپنے اللہ اور اپنے رسول کے فرمان پر لبیک کہتے ہوئے اس سفرِ شوق و جہاد پر مدینۃ الرسول سے نکلے تھے۔ اگرچہ شمسی تقویم کے مطابق وہ اپریل (۶۳۰ء) کا مہینہ تھا، سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ تیس ہزار قدسی نفس انسانوں کا لشکر مدینۂ منورہ سے اس عالم میں تبوک کی طرف چلا کہ اونٹ اور گھوڑے تعداد میں اتنے کم تھے کہ تقریباً بیس سپاہیوں کے لئے ایک اونٹنی تھی رسد و اجناس کی حد درجے کمی تھی۔ پانی راستے میں کم یاب اور اکثر منزلوں میں نایاب تھا سواریوں کے لئے اونٹوں کی کمی کے باوجود ان اونٹوں میں سے بھی کچھ اونٹوں کو ذبح کرنا پڑتا تاکہ ان سے پانی حاصل کیا جائے۔ اونٹ ایسا جانور ہے جو کئی دنوں کے لئے اپنے جسم میں پانی ذخیرہ کر لیتا ہے۔ پانی کی اس شدید قلت کو اس بات نے شدید تر بنا دیا کہ مدینۂ منورہ سے تبوک کے سفر میں ایسے مقامات آئے جو مغضوب قوموں کے انجام کی زندہ شہادت کا

درجہ رکھتے تھے۔ ان مقامات میں قومِ ثمود کی بستی بھی شامل تھی۔ قومِ ثمود نے پہاڑوں کے جگر تراش کر اپنے سنگین اور مستحکم مکانات تعمیر کئے تھے۔ ان مکانوں کے مضبوط ہونے پر انہیں اتنا یقین تھا کہ زلزلوں اور طوفانوں کو افسانہ سمجھتے تھے مگر جب عذابِ الٰہی نے انہیں آن پکڑا تو خود افسانہ بن کر رہ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہمراہیوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ اس مغضوب علاقے سے استغفار برلب اور بردل تیزی سے گزر جائیں۔ یہاں آرام کے لئے نہ ٹھہریں اور نہ یہاں کا پانی پئیں۔ پانی کی شدید قلت میں عذابِ الٰہی کی یاد اور اس کا خوف۔ کیا انسانی تاریخ ایسی کوئی دوسری مثالیں پیش کر سکتی ہے؟

تبوک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیس دن قیام فرمایا۔ بعض روایتوں کے مطابق یہ مدت ایک ماہ تھی۔ رومیوں تک اس لشکر کی خبریں برابر پہنچ رہی تھیں۔ مسلمانوں کے عزم اور ارادوں کو دیکھ کر رومیوں نے پیش قدمی اور اسلام کی سرزمین میں اسلام کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور سرحدوں سے اور پیچھے ہٹ گئے۔ یقیناً اس فیصلے میں معرکۂ موتہ کی یاد بھی شامل ہوگی۔ تین ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ فوج کی پیش قدمی کے آگے بند باندھ دیا تھا اور اب تو تیس ہزار مسلمان روم کی سرحد پر صف آرا تھے، پھر ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے۔ اس سے بڑھ کر اور کون سی طاقت مسلمانوں کے حوصلوں کو بلند کر سکتی تھی۔

ان غیر معمولی حالات میں بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ السلام نے مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی تربیت جاری رکھی۔ تبوک میں ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس خطبے کے ہر لفظ اور ہر فقرے کی معنویت چودہ سو سال میں واضح تر ہوگئی اور نئے معانی ہم پر آشکار ہوتے رہیں گے۔ آپ کے عہد سے دوری اگرچہ ہمارے لئے ایک محرومی بھی ہے مگر اس میں ہمارے لئے تسکین کا پہلو یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے جو پہلو ہم پر روشن ہوئے ہیں وہ بھی آپ کی رسالت کی ابدیت پر گواہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ خطبہ ملاحظہ کیجئے:

اللہ کی کتاب ہر کلام سے بڑھ کر ہے (ابدی صداقتوں کی امین کتاب) اور کلمۂ تقویٰ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد بات ہے۔ ملتِ

ابراہیم سب ملتوں سے بہتر ہے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ اور روشِ حیات سب طریقوں سے بہتر ہے۔ اللہ کا ذکر ہر ذکر سے زیادہ صاحبِ شرف ہے۔ قرآن تمام بیانات سے پاکیزہ تر ہے۔ اولوالعزمی کے کام سب سے بہتر ہیں۔ جو نئی بات نکالی گئی (بدعت) ہمارے کاموں میں بدترین ہے۔ سب سے اچھی روش (اور راہ) انبیا کی روش ہے۔ شہدا کی موت موتوں میں سب سے بہتر ہے۔ دل کا بدترین اندھا پن ہدایت کے بعد گمراہی ہے، عملِ نافع اعمال میں سب سے بہتر ہے، جس پر لوگ (آسانی سے) چل سکیں بہترین روش وہ ہی ہے، دل کا اندھا پن بدترین اندھا پن ہے، اوپر والا ہاتھ (دینے والا ہاتھ) نیچے والے ہاتھ (لینے والا) ہاتھ سے بہتر ہے، تھوڑا مگر کافی مال اس بہت سے مال سے بہتر ہے جو انسان کو غفلت میں ڈال دے، جاں کنی کے وقت کی توبہ بدترین توبہ ہے، قیامت کے دن کی ندامت بدترین ندامت ہے، لوگوں میں سے کچھ جمعہ کی نماز کے لئے آتے ہیں مگر ان کے دل پیچھے (دنیا میں) لگے رہتے ہیں، اور بعض لوگ (یوں ہی) کبھی کبھی اللہ کا ذکر کر لیا کرتے ہیں، جھوٹی زبان (جھوٹ) بدترین خطا (گناہ) ہے، بہترین دولت دل کی دولت (اور تونگری) ہے، بہترین توشہ (اور زادِ راہ) تقویٰ ہے، خوفِ الٰہی دانائی کا جوہر ہے، یقین، دل میں جگہ پانے والی بہترین چیز ہے، شک، کفر کی شاخ ہے، بین کرنا، جاہلیت کا کام ہے، چوری (اور دھوکہ) جہنم کی آگ ہے، نشے میں بدمستی آگ میں قیام ہے، (برا اور سفلی جذبات بھڑکانے والا) شعر، ابلیس کا (ترکہ) ہے، شراب گناہوں کا مجموعہ ہے، بدترین روزی یتیم کا مال کھانا ہے، سعادت مند وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے، اصل بدبخت (شقی) وہ ہے جو پیدائشی شقی ہو، عمل کا ماحصل

اس کا بہترین انجام ہے، جھوٹا خواب بدترین خواب ہے، جو بات ہونے والی ہے وہ بہت قریب ہے (قیامت یا موت)، مومن کو گالی دینا فسق ہے، مومن کا قتل کفر ہے، مومن کا گوشت کھانا (اس کی غیبت کرنا) اللہ کی نافرمانی اور معصیت ہے، مومن کا مال اسی طرح حرام ہے جیسے اس کا خون، جو اللہ تعالیٰ کے سامنے بڑائی اختیار کرے اللہ اسے جھٹلا دیتا ہے، جو دوسروں کی عیب پوشی کرتا ہے اللہ اس کی عیب پوشی کرتا ہے، جو دوسروں کو معاف کرتا ہے اسے معاف کر دیا جاتا ہے، جو غصے کو ضبط کر لیتا ہے اللہ اسے اجر دیتا ہے، جو نقصان پر صبر کرتا ہے اللہ اس کے نقصان کی تلافی فرما دیتا ہے، جو چغلی کرتا ہے اور اسے پھیلاتا ہے اللہ اس کو لوگوں میں رسوا کر دیتا ہے، جو صبر کرتا ہے اللہ اسے بڑھاتا ہے، جو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ اسے عذاب دیتا ہے۔

اور اس خطبے کے بعد سرورِ دیں ﷺ اور ہادیٔ سبل ﷺ نے تین مرتبہ استغفار کیا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے چھ باتوں میں دوسرے انبیا پر فضیلت حاصل ہے۔ اور آپ نے ان فضیلتوں کا ذکر کرتے ہوئے سب سے پہلے جوامع الکلم کا ذکر فرمایا:

اعطیت بجوامع الکلم

مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے۔

راقم الحروف نے جوامع الکلم کے سلسلے میں ایک سلسلۂ مضامین شائع کیا تھا اور اب یہ سلسلہ بہت سے اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع ہوگا۔ حافظ فضل الرحمن صاحب بھی جوامع الکلم کا ایک مجموعہ شائع کر چکے ہیں۔ میں نے اپنے سلسلے کو ''قطرے میں سمندر'' کا عنوان دیا تھا۔ لفظ کے ایک قطرے میں سرورِ دو عالم نے معانی کے سمندر پیش کر دیے۔ خطبۂ تبوک کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوا کہ خطبۂ تبوک، جوامع الکلم کا معجزنما مجموعہ ہے۔ ہر فقرہ ایک بڑے خیال کا جامع ہے۔ متفرق فقرے بھی بڑی بات ہوتے لیکن جوامع الکلم کے

خطبات اور الامین صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو میں ان کی کثرت نے انہیں جاودانی معجزہ بنا دیا ہے۔ ''اشرف الحدیث ذکر اللہ''۔ اس کلمے اور دوسرے کئی کلمات کے ترجمے کی بھی ضرورت نہیں۔ عالم اسلام کے ملکوں اور زبانوں میں یہ کلمے مقامی زبانوں سے ہم آہنگ ہو کر خوب سمجھے جاتے ہیں اور ضرب المثل کے درجے پر فائز ہیں۔ ذکرِ الٰہی تمام کلموں اور باتوں سے افضل ہے۔ یہ ذکر ہمارے قلوب کو اطمینان عطا کرتا ہے۔ اسمائے حسنیٰ ذکرِ الٰہی کا وسیلہ ہیں اور یوں یہ ذکر ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کا احاطہ کر لیتا ہے۔ ان کا دائرہ اور تفہیم، ذاکر کے علمی پس منظر کے ساتھ تخلیق و تکوینِ کائنات کی گہرائیوں تک ذاکر کو پہنچا دیتا ہے۔

خیر السنن سنة محمد

سب طریقوں میں سب سے بہتر طریقہ اور روش محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہے۔

''سنت'' کا لفظ اور اس کی جمع سنن اردو میں مستعمل ہیں۔ ہم ''فرائض و سنن''، سننِ رسول اور سنتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سننِ موکدہ جیسے الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ سنت کا لفظ روش، طریقِ حیات، دستور کے معانی میں اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ حیات کے علاوہ یہ لفظ اللہ کے دستور، قاعدے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ اللہ کے قانون اور روش دائمی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشِ حیات (آپ کی گفتگو، آپ کی حکمت، آپ کا رہن سہن، آپ کا اندازِ تبلیغ، آپ کے بیان کردہ عبادات کے طریقے وغیرہ وغیرہ) بہترین ہے اور آپ ﷺ کے نمونے کی اتباع میں ہماری حیات اور نجات ہے۔ یہ سب باتیں جنہیں بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور بیان کی جاتی ہیں، اس ایک کلمے میں آ گئی ہیں۔

خیر الغنی، غنی النفس

سب سے بہتر تو انگری، دل کی تو انگری ہے۔

یہ ایک کلمہ نفسِ انسانی اور حیاتِ انسانی کی ایک بڑی صداقت کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ہم ہر دن دیکھتے ہیں کہ اقتدار کے بھوکے اقتدار کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے، وعدے

کرتے ہیں اور انہیں بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی سے توڑ دیتے ہیں، سیاسُت دان اپنی سیاسی وفاداریاں بدل دیتے ہیں، اپنے الفاظ کی تاویل لفظ ومعانی کے ہر اصول کو توڑ کر کرتے ہیں۔ کوئی رشتہ انہیں اقتدار سے زیادہ عزیز نہیں ہوتا، بھائی کو قتل کرا کے بہن خوش ہوتی ہے کہ اس کی کرسی سلامت رہی۔ سرمایہ دار دولت کے ڈھیر لگاتا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے کولہو کے بیل کی طرح دولت کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ اس کے لئے دولت کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ نہیں ہوتی بلکہ اس کی معبود بن جاتی ہے، اور وہ اس خدائی وعید کو بھول جاتا ہے کہ اسی دولت، اسی سونے اور چاندی سے اس کی پیشانی، اس کے پہلو اور اس کا جسم داغا جائے گا۔ قارون اسی نفسی کیفیت کا ترجمان اور سمبل (Symbol) ہے۔ اخلاقِ نبوی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد وتقویٰ اور آپ کا اسوۂ کریمہ، بندۂ مومن کے دل کو ہر دو جہاں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

صدق کی وسعتیں

خطبۂ تبوک حیاتِ مومن کا ایک جامع منشور ہے اور تعلیماتِ قرآن کا خلاصہ ہے۔ غزوۂ تبوک اللہ تعالیٰ پر توکل، اسلام پر جان اور مال کو قربان کرنے اور اسلامی ضابطۂ اخلاق کو اپنانے کے سلسلے میں آزمائشوں کی کامل مثال ہے، خاص طور پر ایک اخلاقی وصف ''صدق'' کی قدر و قیمت اور اہمیت۔ پیچھے رہ جانے والے تین سچے مومنوں کی آزمائش سے اس طرح اُبھر کر آئی کہ آج تقریباً پندرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی یہ مثال سچائی کے راستے اس طرح اجالتی ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کا ذہن اور اس کا وجود روشن ہو جاتا ہے۔ ''صدق'' اور ''امانت''۔ یہ دونوں اوصاف نبوت سے پہلے بھی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شناخت اور آپ کا امتیاز تھے اور نبوت کے بعد تو آپ کے صدق، آپ کے اصحاب باصفا اور امتیوں کی میراث بن گیا۔ آپ کا چلنا صدق تھا، آپ کا بیٹھنا صدق تھا، آپ کا سونا اور خواب صدق تھا، آپ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ صدق تھا، آپ کی خاموشی صدق تھی، غرض کہ زندگی کا ہر لمحہ صدق تھا اور اس صدق کو صحابۂ کرام، ازواجِ مطہرات اور اہلِ بیت نے اس طرح اپنا لیا کہ اُن کی زندگی کے تابندہ لمحے قیامت تک انسانوں کو راستہ دکھاتے رہیں گے۔ سچائی، فلاح اور نجات کا راستہ۔

منافقوں اور عذر تراش دیہاتیوں کے علاوہ تین سچے، مخلص اور اسلام کو اپنی زندگی کا جواز جاننے والے مسلمان بھی غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے۔ منافقوں اور بہانہ باز اعراب نے غزوۂ تبوک سے واپسی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے جھوٹے عذر پیش

کئے اور مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جھوٹے عذر ''قبول'' فرمالئے۔ ذرا اس اخلاقی بلندی کو تو دیکھئے کہ منافقت کی علامت ''مسجدِ ضرار'' کو تو آگ لگادی گئی لیکن منافقوں کو شرمندہ نہیں کیا گیا۔

یہ تین سچے اور پکے مومن تھے کعب بن مالک، بلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہم۔ ان تینوں نے کوئی عذر پیش نہیں کیا بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی کوتاہی کا اعتراف کرلیا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن کعب کی ایک طویل روایت موجود ہے جس میں حضرت کعب بن مالکؓ کی کیفیت ان کی زبانی پیش کی گئی ہے۔ ہم اس روایت کو بہت اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ روایت کی تفصیلات ترک کردی گئی ہیں۔

''غزوۂ تبوک کے وقت میری حالت بہت اچھی تھی۔ اللہ گواہ ہے کہ اس سے پہلے میرے پاس کبھی دو سواریاں جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاریاں شروع کیں تو ایسے دن تھے جب کھجور پک رہی تھی اور سائے میں بیٹھنا اچھا معلوم ہوتا تھا، میں یہ سوچتا رہا کہ کسی وقت بھی جہاد میں شرکت کی تیاری کرلوں گا کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوگئے۔ میں نے سوچا کہ اس لشکر کو راستے میں جا پکڑوں گا (کہ کئی دن گزر گئے)۔ اب سب لوگ دور نکل چکے تھے۔ میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ آپ سے جاملوں مگر یہ تقدیر میں نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانے کے بعد جب میں مدینۂ منورہ میں چلتا پھرتا تو مجھے یا تو منافق نظر آتے یا کمزور اور ضعیف۔ مجھے بہت افسوس ہوتا تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لارہے تھے تو میں نے سوچا اور خاندان کے لوگوں نے بھی مشورہ دیا کہ کوئی ایسا بہانہ ہاتھ آجائے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غصے سے بچ سکوں۔ لیکن جب آپ مدینے کے بالکل قریب آگئے، تو بہانہ سازی کا خیال میرے دل سے نکل گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے آکر مسجد نبوی میں تشریف فرما ہوئے تو پیچھے رہ جانے والے آپ کے پاس آکر عذر پیش کرنے لگے اور آپ قبول کرتے جاتے۔

میں نے حاضر خدمت ہو کر سلام پیش کیا تو آپ نے غصہ آلود تبسم کے ساتھ سلام کا

جواب دیا۔ آپ نے میرے پیچھے رہ جانے کا سبب پوچھا تو میں نے کہا کہ اگر آج میں جھوٹ بول کر آپ کو راضی بھی کرلوں تو کل اللہ تعالیٰ آپ کو مجھ سے ناراض کردے گا اس لئے میں سچ ہی بولوں گا۔ اللہ کی قسم میں قصوروار ہوں۔ اللہ تعالیٰ میرا شاہد ہے اسی سے مجھے مغفرت کی امید ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ تم نے صحیح بات بیان کردی۔ اچھا جاؤ اور اپنے بارے میں اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ مجھے معلوم ہوا کہ مرارہ بن ربیع اور بلال بن امیہ نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا ہے۔ یہ دونوں بدری صحابہ تھے۔ یہ سن کر مجھے سکون حاصل ہوگیا کہ میں ان کا ہم قسمت ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کوئی ہم سے کلام نہ کرتا۔ یوں محسوس ہوا کہ کوئی ہمیں جانتا نہیں۔ زمین و آسمان بدل گئے۔ میرے دو ہم قسمت تو گھر بیٹھ رہے مگر میں ہمت کر کے مسجدِ نبوی میں نمازِ باجماعت میں شریک ہوتا مگر کوئی مجھ سے بات نہ کرتا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سلام کرتا تو یوں لگتا جیسے آپ کے ہونٹ ہل رہے ہوں مگر آپ بلند آواز میں جواب نہ دیتے۔ ایک دن میں بازار سے گزر رہا تھا کہ شام سے آنے والا ایک عیسائی تاجر میرے پاس آیا اور اس نے مجھے غسان کے عیسائی بادشاہ کا خط دیا۔ اس نے لکھا تھا کہ تمہارے رسول تمہیں ذلیل کررہے ہیں۔ ہمارے پاس آجاؤ ہم تمہیں بڑی عزت سے رکھیں گے۔ میں نے سوچا کہ (اللہ اکبر) اب کافر میرے ایمان کی قیمت لگا رہے ہیں۔ میں نے خط کو ایک تندور کی آگ میں جھونک دیا کہ یہ ہے میرا جواب۔

وہ پچاسواں دن تھا۔ میں فجر کی نماز کے بعد اپنے گھر کے پاس بیٹھا سوچ رہا تھا کہ زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے اور زمین کی وسعت میرے لئے تنگ ہوگئی ہے کہ کوہِ سلع سے بلند ہو کر کسی کی آواز مجھ تک پہنچی کہ کعب تمہیں بشارت دی جاتی ہے۔ اللہ نے تمہاری غلطی معاف کردی ہے۔ یہ سنتے ہی میں سجدے میں گر گیا۔

اس صبح قرآنِ مجید کی وہ آیات نازل ہوئیں جن میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ اور انصار و مہاجرین کے حال پر اپنی توجہ فرمانے کے بیان کے بعد ان ''تینوں'' کو بھی اپنے کرم

سے نوازنے کا اعلان فرمایا ہے۔ نوید معافی کی آیت یہ ہے:

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ O (۱)

اور اللہ نے ان تینوں کے حال پر بھی توجہ فرمائی جن کا معاملہ ملتوی کر دیا گیا تھا یہاں تک کہ ان کی پریشانی کا یہ عالم ہوا کہ زمین اپنی فراخی و وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہونے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اللہ کی پکڑ سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے۔ بیشک اللہ بہت توجہ فرمانے ولا (توبہ قبول کرنے والا) اور بہت رحیم ہے۔

ان آیات ربانی کی صداقت، تینوں سچے مسلمانوں نے دیکھ لی جو پیچھے رہ گئے تھے۔ کعب بن مالک، ہرارہ بن ربیع اور بلال بن امیہ رضی اللہ عنہم جن سے پچاس دنوں تک کسی ساتھی، کسی دوست اور کسی عزیز نے بات تک نہیں کی تھی، اور چالیس دنوں کے بعد جن کی بیویوں کو ان سے الگ رہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان تینوں کی زندگی کو جس مقاطعے کا واسطہ پڑا اس کی کوئی مثال شاید انسان کی طویل تاریخ میں نہیں ملتی اور جب اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے سجدے، اس کی فریاد اور ان کا رجوع ہونا قبول ہو گیا تو زندگی یکسر بدل گئی۔ مدینے کے سارے مومنوں کے چہرے کھل اٹھے، ہر ایک کا رخ انہی تینوں کے گھروں کی طرف تھا۔ مسلمان ان تینوں کو اور ایک دوسرے کو تحفے دے رہے تھے۔ عیدین کے علاوہ ایسا جشن مدینے کی فضاؤں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اس عظیم واقعے سے کردار اور معاشرے کی تعمیر میں صدق کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ انسانی اخلاق میں صدق اولین صفت ہے اور اس کے بعد ہی دوسری اخلاقی صفات آتی ہیں، بلکہ

۱۔ التوبہ: ۱۱۸

سچ تو یہ ہے کہ ان میں بیشتر صدق سے ہم رشتہ ہیں اور اس کا ثمرہ یا نتیجہ ہیں۔ صدق قول تک محدود نہیں بلکہ عمل کی دنیا بھی بدل دیتا ہے اور کون سا انسانی عمل ایسا ہے جو صدق سے الگ ہو کر کوئی اہمیت یا معنویت رکھتا ہو۔ معاملات کی دنیا کی اساس صدق پر ہے۔ رشتوں میں صدق نہ ہو تو مقدس اور قریب ترین رشتے بھی محض لفظ بن جاتے ہیں۔ صدق اخلاق الٰہی کا حصہ ہے اور اس نے اپنے کرم سے انسان کو بھی یہ علوی رنگ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔

اللہ کا قول سچا ہے، اللہ کے وعدے سچ ہیں، وہ اللہ ہی ہے جو اپنے رسولوں کے خواب کو سچا کر دکھاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے ساتھ خانہ کعبہ کے طواف کا جو خواب دیکھا اس کی تعبیر صلحِ حدیبیہ کے بعد عمرۃ القضا کی صورت میں سامنے آئی، اللہ نے رسول اور مسلمانوں سے اسلام کی نصرت کا جو وعدہ کیا وہ مختلف صورتوں میں مختلف مواقع پر متشکل ہوا۔ کبھی فرشتوں کے نزول کی صورت میں، کبھی مسلمانوں کی بے مثال پامردی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی فتح کی شکل میں اور کبھی مسلمانوں کے اکھڑتے ہوئے قدموں کو پہاڑوں جیسی استقامت عطا کر کے۔ اس دنیا کے معاملات کے علاوہ ہمارے اعتقادات کی دنیا کے بعض عقیدوں اور صداقتوں کا تعلق اللہ کے صدق سے ہے۔ قیامت کے برپا ہونے اور یوم حساب کی صداقت پر ہمارے اسلام کی بنیاد قائم ہے کیونکہ اس کا رشتہ اللہ پر ایمان اور زندگی کے تسلسل پر یقین سے ہے۔ ہمارے دور کے علوم میں مستقبلیات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس علم کی بنیاد اسلام نے رکھی۔ آنے والی زندگی پر ہمارا ایمان اتنا ہی مستحکم ہے کہ اچھا مسلمان اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے آنے والی دنیا اور زندگی کو دیکھ لیتا ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا O (۲)

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تم سب کو قیامت کے دن جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ (اور کوئی شک) نہیں اور اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا اور کون ہو گا (اور کون ہو سکتا ہے)۔

۲۔ النساء: ۸۷

اللہ تعالیٰ کے اس صدق کو عالمِ انسانی میں انبیائے کرام علیہم السلام اجمعین نے پھیلایا اور اپنی مثال سے انسانوں کو بتایا کہ قول و عمل اور معاملات میں صدق کے دائرے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں، صدق کے امکانات کتنے وسیع ہیں اور صدق کس طرح مومن اور کافر کے درمیان خطِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دو ساتھیوں نے صدق کی خاطر جس طرح معاشرے میں تنہائی کے عذاب کو جھیلا اور پھر صدق ہی نے انہیں مدینۂ منورہ کے معاشرے میں ہر نظر کا محبوبِ نظر بنا دیا اور وہ صبح کتنی درخشاں ہوگی جب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نظریں تینوں کے چہروں پر پڑی ہوں گی اور دیدۂ مصطفیٰ ان کے سچ کی روشنی کا گواہ بنا ہوگا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کے عمل اور زندگی کو دیکھ کر فرشتوں کے سامنے انبساط محسوس کرتا ہے، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی صدقِ رسول کو اپنے صحابہ میں منتقل ہوتے ہوئے دیکھ کر کس درجہ کی مسرت حاصل ہوئی ہوگی۔

یہ صدق، کذب اور منافقت کے نشان مسجد ضرار کے انجام کے سامنے اور چمک اٹھا۔ یہ مسجد منافقوں نے اسلام کو ضرر پہنچانے کے لئے تعمیر کی تھی تاکہ یہ دارالاسلام میں کفر کی حمایت کا گڑھ بن سکے۔ منافقوں نے چاہا کہ تبوک جاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مسجد میں نماز ادا کرلیں تاکہ اسے ''تقدس'' حاصل ہوسکے اور مسلمان ان کے مکر اور سازش کا شکار ہوسکیں مگر نورِ نبوت سے بے خبر منافقوں کو کیسے یہ بات معلوم ہوسکتی تھی کہ رسول، اللہ کے نور سے چیزوں اور انسانوں کو دیکھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تبوک سے واپسی پر دیکھا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے تو وحیٔ الٰہی نے منافقوں کی چال اور سازش کا پردہ چاک کردیا۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ
اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○ (۳)

اور ان میں وہ بھی ہیں جنہوں نے ایک مسجد (مسلمانوں کو) ضرر

۳۔ التوبہ: ۱۰۷

پہنچانے کے لئے بنائی ہے، کفر (کو تقویت پہنچانے) کی غرض سے اور مومنوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے کی غرض سے اور اس غرض سے کہ جو شخص اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول سے لڑ چکا ہے اس کے لئے کمین گاہ کا کام کرے۔ اور یہ لوگ قسم کھائیں گے کہ ہمارا مقصد سوائے بھلائی کے کچھ اور نہیں اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

جس شخص کی طرف اس آیتِ مبارکہ میں اشارہ ہے وہ ابو عامر راہب تھا جس کا تعلق بنی خزرج سے تھا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ''جنگ'' کی شہادت قرآنِ کریم نے دی ہے۔ وہ مدینۂ منورہ کے منافقوں اور یہودیوں کا دماغ تھا۔ وہ دماغ جو ہر وقت اسلام کے خلاف منصوبے بناتا رہتا۔ اس کے مکۂ معظمہ کے مشرکین سے گہرے روابط تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قیصرِ روم سے اس کے تعلقات اسلام دشمنی کی بنیادوں پر استوار تھے۔ یہ شخص اسلام کے خلاف ان قوتوں کے اتحاد سے ایک ''گرینڈ اسٹریجی'' (عظیم حکمتِ عملی) وضع کر رہا تھا اور مسجدِ ضرار کو اس اسٹریجی کا مرکز بنانا مقصد تھا، لیکن ربِ جلیل کی حکمت اور تدبیر کے آگے منافقوں اور کافروں کا مکر تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ بودا ہوتا ہے۔ آخر وحیٔ الٰہی کی روشنی میں اس مسجد کو ڈھا دیا گیا اور اس کو آگ لگا دی گئی۔ مسجد ضرار کی مثال سے یہ نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اسلام کے خلاف بعض سازشیں بہت مقدس نقابوں میں ملفوف ہوکر ہمارے سامنے آسکتی ہیں اور دانشِ ایمانی کا تقاضا ہے کہ ہم ایسی ہر سازش سے باخبر رہیں۔ یہ سازشیں ''جہاد'' کے مقدس نام کا سہارا لے کر پروان چڑھ سکتی ہیں یا اسلام کے خلاف سازش کو اعتدال پسندی اور روشن خیالی اور کی خوبصورت اصطلاحات کے نام پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ

الفاظ کے پھندے میں الجھتا نہیں ''مومن''

مغرب کے مسیحی اور یہودی منصوبہ ساز شدت سے یہ گھناؤنا کھیل، کھیل رہے ہیں اور اب اس میں مسلمان ملکوں کے حکمراں اور دانش فروش (نام نہاد دانش ور) بھی شامل ہوگئے ہیں۔ دانشِ نورانی اسلامی اخلاق کا ایک جز ہے جس کی مدد سے ایسی سازشوں کو ختم کیا گیا ہے اور کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

اسلام کی فتح مبین۔ فتح مکہ

صلح حدیبیہ کے موقع پر سورۃ الفتح نازل ہوئی تھی۔ یہ مومنوں کے لئے سورۂ سکینہ تھی جو صلح حدیبیہ کو اپنی ''پسپائی'' سمجھ کر بددل ہو گئے تھے۔ ان حوصلہ شکن حالات میں خالق ارض وسما اور خبیرِ مطلق نے مسلمانوں کو فتح کی نوید سے حوصلہ بخشا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واقعات نے اپنی معنویت کو مسلمانوں پر اور دنیا پر آشکار کرنا شروع کیا اور وہ بات جو واضح تھی، واضح تر ہو گئی کہ قرآنِ کریم اللہ کی کتاب ہے۔ اس کے وعدے، اس کی پیشین گوئیاں، اس کی تنذیر، یہ سب علمِ الٰہی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔

انا فتحنا لک فتحاً مبینا ایک معرکے میں مسلمانوں کی فتح کی خبر نہیں ہے، بلکہ یہ اسلام کی فتح کی نوید ہے۔ اس فتحِ مبین کا سلسلہ صلحِ حدیبیہ سے شروع ہوا، اسی فتح کے اگلے مرحلے کا نام فتح خیبر ہے۔ یہ فتحِ قریب، صلح حدیبیہ کا ضمیمہ تھی، اسی لئے اس میں صرف اصحابِ بیعتِ رضوان کو شرکت کی اجازت دی گئی اور فتح مکہ اسی فتح مبین کا تکملہ تھی کیونکہ اس کا رشتہ صلح حدیبیہ کی شرائط میں سے ایک شرط اور صلح کی ایک دفعہ کی خلاف ورزی سے ہے۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے مطابق قبائلِ عرب کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور قریشِ مکہ میں سے جس کے چاہیں حلیف بن سکتے ہیں۔ بنو بکر قریش کے ساتھ شریکِ عہد ہو گئے اور بنوخزاعہ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وابستگی کو چن لیا۔ ان دونوں قبائل کے درمیان عرصۂ دراز سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ بنو بکر نے اپنے غلط اندازوں کے مطابق قریش کے ساتھ اپنے عہد کو بنوخزاعہ سے بدلہ لینے کا موقع سمجھا۔ ان کا اندازہ تھا کہ مسلمان ان کی اور قریش اور

دوسرے حلیف قبائل کے خوف سے بنوخزاعہ کی مدد سے گریز کریں گے۔ ان کے اس قیاس کی وجہ شاید صلح نامۂ حدیبیہ کی تحریر کے وقت سہیل بن عمرو کے بیٹے حضرت ابو جندلؓ کا واقعہ ہو گا۔ ابو جندل رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے تھے اور سہیل نے انہیں بیڑیاں پہنا کر زنجیروں میں جکڑ دیا تھا۔ حضرت ابو جندلؓ کسی طرح حدیبیہ پہنچ گئے۔ سہیل نے کہا کہ معاہدے کے مطابق ہمارے آدمی کو ہمارے حوالے کر دو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی صلح نامہ پر دستخط نہیں ہوئے ہیں اور صلح نامہ مکمل نہیں ہوا ہے، مگر سہیل نے کہا کہ بصورت دیگر معاہدے کو منسوخ سمجھا جائے۔ مسلمانوں کے لئے یہ بات سخت ناگوار تھی۔ مسلمانوں کے دل تو ایک ساتھ دھڑکتے ہیں۔ وہ ایک مسلمان کی اسیری اور اس پر جبر کے مقابل کسی صلح پر تیار نہ تھے۔ مسلمانوں کے جذبات ان کے تیور اور چہرے سے آشکار تھے، مگر اللہ کے نور میں واقعات کو دیکھنے والے رسول نے سہیل کی بات مان لی اور ابو جندل سے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں۔ اللہ تمہارے لئے کوئی صورت پیدا کر دے گا۔ سہیل نے ابو جندل رضی اللہ عنہ کے چہرے پر کیکر کی ایک شاخ توڑ کر ضرب لگائی۔ اس پر مسلمان رونے لگے۔ یہ ضرب ابو جندلؓ کے چہرے پر نہیں لگی تھی بلکہ بیعتِ رضوان میں شریک ہر فرد نے اس کی اذیت اپنے چہرے پر محسوس کی، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام اور آپ ﷺ کے حق پر ہونے کے یقین نے انہیں خاموش کر دیا تھا۔ نظم وضبط اور اطاعتِ رسول اخلاقی صفت ہی نہیں بلکہ ایمان کا حصہ ہے۔

صلح حدیبیہ کے غالباً اسی واقعے نے بنی بکر کو بنی خزاعہ پر حملہ کرنے کی جرأت عطا کی۔ مسلمان اپنے عہد و پیمان کی حد درجہ پاس داری کرتے تھے۔ صلح نامہ پر دستخط تو نہیں ہوئے تھے مگر دفعاتِ صلح پر فریقین کا اتفاق ہو چکا تھا اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو جندلؓ کو صبر کی تلقین فرمائی اور شرائطِ صلح کا احترام فرمایا۔ صلح حدیبیہ شرائط نامہ کی شرائط کی ایسی پاس داری کو، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، بنی بکر نے مسلمانوں کی کمزوری سمجھتے ہوئے ان کے حلیف بنی خزاعہ پر حملہ کر دیا۔ بنوخزاعہ قتیر نامی مقام پر آباد تھے۔ بنو بکر نے ان کے مسکن پر شب خون مارا۔ کئی آدمی مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس حملے میں قریش کے چند سربرآوردہ افراد بھی شریک تھے اور قریش نے بنو بکر کو اسلحہ بھی مہیا کیا۔ بنوخزاعہ نے حرم میں پناہ لی

مگر بنوبکر نے حرم کی حرمت کو پامال کرتے ہوئے وہاں بھی بنوخزاعہ کے افراد کو قتل کیا۔ اس عہد شکنی کے واقعے اور ہنگامے کے بعد عمر بن سالم خزاعی اور اس کے ساتھیوں نے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر فریاد کی اور سارے واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور عرض کیا کہ معاہدے کے مطابق ہماری مدد فرمائی جائے۔ معاہدے اور عہد و پیان کو پورا کرنا تو اسلامی اخلاق کی بنیادوں میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں اسے مسلمانوں کی شناخت قرار دیا ہے اور اس کی فرضیت کو آشکار کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں ایفائے عہد کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ سورۃ المائدہ کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (۱)

اے ایمان والو اپنے عہد و پیان پورے کرو۔

قرآن کریم ایک زندہ اور جاوداں معجزہ ہے۔ اس کا ہر لفظ ایک جہانِ معانی اپنے دامن میں رکھتا ہے اور اس کا ترجمہ ناممکن ہے، ہاں اس کے مفاہیم کی ترجمانی اللہ کی مدد سے کی جاسکتی ہے۔ عقد کے معانی میں پختہ عہد و پیان کا معنی شامل ہے۔ عہد کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں عہدِ الست بھی شامل ہے۔ وہ عہدِ بندگی جو ساری انسانی ارواح نے اپنے رب سے کیا تھا۔ اس کے معانی میں احکامِ الٰہی بھی شامل ہیں جو کہ پورا کرنے اور پیروی کرنے کے عہد کا دوسرا نام ایمان ہے اور اس میں وہ تمام عہد اور معاہدے شامل ہیں جو انسان ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ ہر شریف قوم اور انسان کو ان معاہدوں کی پابندی کرنی چاہیے، مگر اہلِ ایمان کو تو اس کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ کے ہر حکم کی بجا آوری دائرہ ایمان میں داخل ہے۔ عقد کے لفظی معنی کے مطابق عقد (جمع عقود) وہ بندش ہے جس کے اہلِ ایمان پابند ہوتے ہیں اور یہ پابندی وہ اپنی جان کی قیمت پر بھی پوری کرتے ہیں۔ عہد کی پابندی، ایمان کی بنیادی شرائط سے ایک ہے اور اسے پورا کیے بغیر کوئی مسلمان، محسن اور متقی کے درجے پر فائز نہیں ہوسکتا۔ سورۃ البقرہ میں نہایت وسیع پس منظر میں مسلمانوں کی دوسری اخلاقی صفات کے ساتھ پابندیٔ عہد کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری صفات ہم رشتہ ہیں اور ان ساری صفات کی نمود

۱۔ المائدہ:۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات میں اس طرح ہوئی ہے کہ وہ ابدی طور پر اسوۂ حسنہ کی صورت میں اہلِ ایمان کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (۲)

ساری نیکی مشرق اور مغرب کی طرف منہ کر لینے میں نہیں بلکہ حقیقی نیکی تو اس شخص میں ہے جو اللہ پر، یومِ قیامت پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب (کتابوں) پر اور انبیا پر ایمان لایا، اور جو مال سے محبت کے باوجود اہلِ قرابت، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دے، اور جو اپنی دولت غلاموں کو آزاد کرنے پر صرف کرے، اور نماز کو قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے اور جب (کسی سے کوئی) عہد کرے تو اسے پورا کرے اور تنگ دستی اور تکلیف میں اور جنگ کے ہنگام پر صبر کرے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے سچ کو اختیار کیا اور جو متقی ہیں۔

اس آیتِ شریفہ نے اس حقیقت کو نکھار کر پیش کر دیا ہے کہ یہود اور نصاریٰ جو اپنے اپنے قبلے کو بڑی اہمیت دے رہے تھے اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں تھا اور بیت اللہ کو مسلمانوں کا قبلہ بنانا بھی دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر تھا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ اب امامتِ اقوام حضرت اسماعیلؑ کی نسل کے رسولِ آخر کے توسط سے مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ اب قبلہ تو امت کی یک جہتی کا نشان ہے ورنہ اصل اہمیت تو ایمان، عقائد، اخلاق اور

۲۔ البقرہ:۱۷۷

معاملات کو حاصل ہے، اور پھر ربِ جلیل نے ان ایمانی اور اخلاقی صفات کو بیان کیا ہے تو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔ ان صفات میں ایفائے عہد کو اتنی بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا گیا ہے، ایفائے عہد کا حکم دیا گیا ہے اور اسے اخلاقِ حسنہ کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انہیں عہدوں میں عہدِ رضوان بھی شامل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ غالب و کار آفریں پر جن لوگوں نے بیعت کی اور حق کی سربلندی کے لئے جان قربان کرنے کا عہد کیا ان کے حق میں فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰہَ ؕ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡہِمۡ ۚ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِمَا عٰہَدَ عَلَیۡہُ اللّٰہَ فَسَیُؤۡتِیۡہِ اَجۡرًا عَظِیۡمًا ۝ (۳)

وہ لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔ پس جو شخص عہد شکنی کرے، دراصل وہ اپنے نفس (اور اپنی ذات) سے عہد شکنی کرتا ہے اور جو اپنے اس عہد کو پورا کرے جو اس نے اللہ کے ساتھ کیا ہے۔ اللہ عن قریب اسے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔

اس آیت میں عہد اور ایفائے عہد کو شخصی اخلاق کے ساتھ ساتھ اجتماعی اخلاق کے طور پر بھی پیش کیا گیا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ معاشرہ تشکیل فرمایا کہ آپ کا اخلاق معاشرے کے افراد اور پورے معاشرے میں جھلک اٹھا ہے۔

عمرو بن سالم کی فریاد اور امداد طلبی کو سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے تاب ہو گئے اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ نے فرمایا نُصِرتَ نُصِرتَ۔ تیری مدد کی گئی، تیری مدد کی گئی، آپ ﷺ کے ان الفاظ نے قریش کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ یہ ربِ جلیل کا فیصلہ تھا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا۔

بنو خزاعہ کا وفد مطمئن ہو کر لوٹ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی

۳۔ الفتح: ۱۰

اللہ عنہا سے فرمایا کہ خاموشی کے ساتھ سفر کا سامان درست کر دیں۔ ادھر قریش مکہ کو معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا، انہوں نے مجلس مشاورت منعقد کی کہ کس طرح معاہدے کی خلاف ورزی کا ازالہ کیا جائے۔ انہوں نے ابوسفیان کو تجدید معاہدہ کے لئے مدینۂ منورہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں کو بھی اس بات کا پختہ یقین تھا کہ سفیر اور ایلچی مسلمانوں کے درمیان محفوظ رہیں گے خواہ حالات کتنے ہی سنگین ہوں۔

حضرت ابوسفیانؓ مدینۂ منورہ آئے اور ناکام لوٹ گئے، اس سفر کے ایک واقعے کا ذکر ضروری ہے کہ وہ اخلاق وطرزِ مومن کی زندگی کا ایک باب ہے۔ ابوسفیان مدینۂ منورہ پہنچتے ہی اپنی بیٹی حضرتِ ام حبیبہؓ کے مکان میں آئے اور بستر پر بیٹھنا چاہا مگر ام المومنین حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے بستر ان کے نیچے سے گھسیٹ لیا اور کہا کہ یہ اللہ کے پاک نبی کا بستر ہے اور آپ کافر اور نجس ہیں اس لئے اس بستر پر نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ چھوٹا سا واقعہ اخلاقی، ایمانی اور انسانی سطحوں پر کتنا تہ دار اور بامعنی ہے۔ اصل طہارت خوبصورت اور صاف ستھرے لباس سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ پاکیزگی ایمان، عملِ صالحہ اور عمومی رویے کا نام ہے۔ پھر ایمانی سطح پر یہ بات سامنے آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ ایمان کو اپنے ماں باپ، اولاد، سارے انسانوں بلکہ اپنی ذات سے بھی عزیز ہوتے ہیں اور اس کے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا۔ اخلاقی اور انسانی سطح پر یہ بات ہم پر واضح ہوتی ہے کہ جب ایسا کوئی معاملہ پیش ہو تو جھوٹا اخلاق اور حسنِ تکلم ایمان کے منافی ہے اور یہی حقیقی اخلاق ہے کہ اس کی بنیاد صدق ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو عسکری تیاری کا حکم دیتے ہوئے انہیں بتا دیا کہ مکہ معظمہ پر فوج کشی کا ارادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب سے دعا کی کہ اہل مکہ کو آپ کے عزم اور اقدام کا علم نہ ہونے پائے اور آپ ان کے باخبر ہونے سے پہلے ان کے سر پر جا پہنچیں۔ عسکری تدبیر کے طور پر آپ نے رمضان ۸ھ کے آغاز پر چند صحابیوں کا ایک دستہ بطن اضم کی طرف بھیجا۔ قرب وجوار کے علاقوں میں یہ خبر گشت کرنے لگی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس علاقے کا رخ کرنے والے ہیں۔ ادھر یہ خبریں گشت کر رہی تھیں اور ادھر اسلامی لشکر اپنے سپہ سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں مکۂ معظمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

رب العزت نے اپنے رسول کی دعا قبول کی اور اہلِ مکہ کو دس ہزار صحابیوں پر مشتمل اس لشکر کے سفر اور ارادوں کی خبر نہ ہو سکی۔ جحفہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ملے جو اپنے خاندان کے ساتھ مدینۂ منورہ کی طرف گامزن تھے۔ پھر ابواء کے مقام پر ابوسفیان بن حارث اور عبداللہ بن امیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد اور پھوپھی زاد بھائی تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت اذیتیں پہنچائی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ اس پر حضرتِ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ قریبی رشتہ سے آپ کے بھائی ہیں اور رحمۃ للعالمین کی شفقت کے مستحق ہیں۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دونوں کو سمجھا دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پہنچ کر وہی کہنا جو حضرتِ یوسف علیہ السّلام کے بھائیوں نے ان سے معافی کی درخواست کرتے ہوئے کہا تھا۔

تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَاِنْ کُنَّا لَخٰطِئِیْنَ (۴)

اللہ کی قسم! اللہ نے تمہیں ہم پر برتری عطا کی اور سچ ہے کہ ہم ہی خطاوار تھے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تاریخ نے اپنے آپ کو دہرایا اور آپ نے اپنے دونوں بھائیوں کو وہی جواب دیا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو دیا تھا۔

لَاتَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ ؕ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ O (۵)

آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت کرے، تمہیں معاف کرے۔ وہی رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔

ہر نبی نے مکارم اخلاق کو عملی مثال سے اپنی قوم کے سامنے پیش کر لیا اور نبی رحمت

۴۔ یوسف: ۹۱

۵۔ یوسف: ۹۲

صلی اللہ علیہ وسلم تو مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس طرح کہ آپ کا اسوہ ہر دور کے انسانوں کے لئے ایک مثال کے طور پر زندہ رہے۔ تمام انبیا آپ کے اخلاق اور اسوۂ حسنہ کے تدریجی مراحل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فتحِ مکہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عفو درگزر اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شانِ کریمی میں حد درجہ مماثلت ملتی ہے اور لاتثریب علیکم الیوم کی کئی موقعوں پر تکرار انسانی تاریخ کے تسلسل کی ایک شہادت ہے اور یوں اللہ تعالیٰ نے آپ کی مثال سے حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر کو بھی اور رفعت عطا کی ہے۔

اسلامی لشکر ام القریٰ کی طرف تیزی سے بڑھتا رہا اور رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامیوں کی پیش قدمی کی خبروں کو قریش مکہ تک پہنچنے سے روکے رکھا، یہاں تک کہ یہ قافلۂ نو بہار وادیٔ فاطمہ میں پہنچ گیا۔ یہاں اسلامی لشکر نے پڑاؤ کیا۔ خیمے ایک دوسرے سے قدرے فاصلے پر لگائے گئے اور جب ان ہزاروں خیموں میں مشعلیں روشن کی گئیں اور کھانا پکانے کے لئے چولہے جلائے گئے تو مرالظہران، وادیٔ فاطمہ میں چراغاں پیدا ہو گیا اور اس چراغاں میں اہلِ ایمان کے چہروں اور دلوں کی روشنی بھی شامل تھی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہرے کے انصرام وانتظام پر مامور فرمایا۔ بنوخزاعہ کے قتل عام کے بعد اور مدینۂ منورہ سے ابوسفیان کی ناکام واپسی کے بعد سے قریش بہت پریشان تھے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان تک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جیش کی مکۂ معظمہ کی طرف پیش قدمی کی خبروں کو پہنچنے سے روک رکھا تھا مگر وہ راتوں کو مکۂ معظمہ کی حدود سے نکل کر حفاظتی گشت لگانے لگے تھے۔ اس رات بھی ابوسفیان اور بدیل بن ورقا مکۂ معظمہ سے باہر نکلے تو انہوں نے مرالظہران میں روشنیوں کا شہر دیکھا۔ ابوسفیان اور بدیل ایک دوسرے سے بات کرنے لگے کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ خیموں کی اتنی بڑی بستی اچانک کیسے وجود میں آ گئی۔ ادھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید خچر پر گشت کے لئے نکلے ہوئے تھے۔ انہوں نے ابوسفیان کی آواز سن کر اسے آواز دی کہ ابوحنظلہ! تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ ابوسفیان نے بھونچکے ہو کر کہا کہ ابوالفضل تم یہاں؟۔ حضرت عباس نے ابوسفیان اور بدیل کے قریب پہنچ کر کہا۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لشکر ہے اور یہ

تمہاری عہد شکنی اور بنوخزاعہ کی فریاد کا جواب ہے۔ ابوسفیان نے گھبرا کر کہا کہ اب کیا ہوگا؟ ہائے ہماری شامتِ اعمال۔ حضرت عباسؓ نے فرمایا کہ پہرہ چوکی کا انتظام عمر کے ہاتھ میں ہے۔ انہوں نے تمہیں پالیا تو گردن ماردیں گے۔ اپنے ساتھیوں کو واپس بھیج دو اور میرے پیچھے خچر پر بیٹھ جاؤ۔ حضرت عمرؓ نے ابوسفیان کو دیکھ لیا اور ان کی گردن مارنے کے لئے بے تاب ہوگئے۔ حضرت عباسؓ نے خچر کو ایڑ لگائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ مختصراً بات بتائی اور کہا کہ میں نے ابوسفیان کو پناہ دے دی ہے اور اسلام کی سطوت دیکھ کر اس کو بازی ہار جانے کا یقین ہوگیا ہے۔ عمرؓ نے بھی دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر ابوسفیان کے قتل کی اجازت مانگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو اپنے خیمے میں لے جاؤ صبح کو لانا۔ یوں حضرت عمرؓ کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ جب فجر کے وقت ابو سفیان خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو آقائے نام دار صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوسفیان! کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم جان لو کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں۔ یہ چھوٹا سا جملہ اخلاقِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن جاں بخشی کے لئے دربار میں حاضر ہے لیکن آپ اس صورتِ حال پر کوئی تبصرہ نہیں فرماتے۔ اس وقت بھی آپ نے ایسا بلیغ جملہ ارشاد فرمایا جو تبلیغ و دعوت کی پوری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ہارے ہوئے جرنیل کو آپ کوئی طعنہ نہیں دیتے بلکہ توحید کی طرف بلاتے ہیں اور اس صورتِ حال کو توحید اور اللہ کے معبودِ مطلق ہونے کی دلیل کے طور پر پیش فرماتے ہیں۔ ابوسفیان نے جو جواب دیا وہ آپ کے اخلاقِ کریمانہ پر بے ساختہ تبصرہ بھی ہے اور معبودانِ باطل سے یک گونہ انکار اور مایوسی کا اظہار بھی۔ ابوسفیان نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ کتنے کریم ہیں اور صلہ رحمی کا آپ کو کتنا پاس ہے۔ اگر اللہ کے علاوہ کوئی اور معبود ہوتا تو آج اپنے پرستاروں کے کام آتا۔ توحید کے اقرار کے بعد اب اقرارِ رسالت کا مرحلہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حد درجے حلیمی کے ساتھ فرمایا ''ابوسفیان! تم پر افسوس۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ تم جان سکو کہ میں اللہ کا رسول ہوں''۔ اس مرحلے پر ابوسفیان کی سچائی کی داد دینی ہوگی۔ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ اس کے جواب پر منحصر تھا۔ اس نے کہا ''میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ اس

بارے میں مجھے پوری طرح جمعیتِ خاطر ابھی حاصل نہیں ہے''۔ اس جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ کریمی، شانِ رسالت اور بردباری پر ایک دشمن کی شہادت اور یقینِ کامل بھی شامل ہے اور یہ نکتہ بھی روشن ہو جاتا ہے کہ اسلام کسی بھی مرحلے پر تلوار کے ذریعے نہیں پھیلا۔ اسلام اللہ اور رسول کی حقانیت پر دل و نظر کی شہادت کا نام ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان کے تذبذب کے جواب میں اسلام اور کفر کی مسلسل جنگ کے حوالے سے یہ نکتہ واضح کیا کہ اللہ نے تم لوگوں کی ساری سازشوں اور تدبیروں کو کس طرح الٹ دیا اور آج تم جنگ کے بغیر کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حاضر ہو۔ کیا اب بھی تمہارا تذبذب باقی ہے؟ ابوحنظلہ یہی وقت ہے کہ اللہ اور رسول کی حقانیت کا اعلان کردو ورنہ حالتِ کفر میں مر گئے تو عذابِ آخرت تمہارا مقدر بنے گا اور یہ عذاب دائمی ہوگا۔ آخر ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔

حضرت عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ''اے اللہ کے رسول! ابو سفیان کا اسلام لانا فتحِ مکہ کا دیباچہ ہے۔ ابوسفیان جاہ پسند اور خود پرست رہا ہے اس کی تالیفِ قلب کے لئے کچھ کرنا مناسب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ اعلان کر دیا جائے کہ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کے لئے امان ہے، جو بیت الحرام میں پناہ لے گا اس کے لئے امان ہے اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند رکھے گا وہ مامون رہے گا۔

امان کے اس اعلان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابوسفیان کے گھر کو دارالامان قرار دینا کوئی سیاسی مصلحت نہیں تھی۔ اس میں ابوسفیان کے اکرام کے ساتھ ساتھ مسجد الحرام اور بیت اللہ کی حرمت کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اسلام امن کا دین ہے اور مسجد الحرام اور بیت اللہ اس کا قائم رہنے والا نشان ہے جو اس میں داخل ہوا اس نے امن پالیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی جان کا یہ احترام دیکھئے کہ جس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کیا اسے امن مل گیا۔ یہ ایک بستی میں ایک رسول کا فاتحانہ داخلہ تھا۔ سورۃ النمل میں ملکۂ سبا کی زبان سے اس تاریخی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ جس بستی میں بادشاہ فاتح کے طور پر داخل ہوتے ہیں اس میں شریفوں اور عزت داروں کی آبرو خاک میں مل جاتی ہے لیکن ایک رسول جب کسی

شہر میں فاتح کے طور پر داخل ہوتا ہے تو اس شان سے کہ اس سر جھکا ہوتا ہے، اس کے لب پر اللہ کے شکر کے کلمات جاری ہوتے ہیں اور وہ مفتوحین کے چہروں پر نگاہ نہیں کرتا کہ انہیں اپنی شکست اور ذلت کا احساس نہ ہو۔

۱۷ رمضان ۸ ھ کی صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جیش اسلام مکہ معظمہ میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوئے۔ سارے اسلامی قبائل کی فوجیں نہایت منظم تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے ارشاد کے مطابق حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضرت ابوسفیان کو لے کر پہاڑ کے اس ناکے کے قریب کھڑے ہوگئے جہاں سے مسلمانوں کے فوجی دستوں کو گزرنا تھا۔ مختلف قبائل اپنے اپنے پرچموں کے ساتھ اس تنگنائے سے گزرنے لگے۔ پہاڑ کے پیچ وخم سے گزرنے والے فوجی ویسے بھی بہت پروقار معلوم ہوتے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی تندروندی بلند و پست کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے گزر رہی ہو۔ سپاہیوں کے ہتھیار سورج کی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ خود اور زرہ بکتریں قوت کا اظہار کررہی تھیں اور رنگ برنگے پرچم کثرت میں وحدت کی علامت تھے۔ جس جس قبیلے کا لشکر سامنے سے گزرتا حضرت عباسؓ حضرت ابوسفیانؓ کو بتاتے جاتے۔ ابو حنظلہ! دیکھو یہ بنو سلیم کے جاں باز ہیں۔ اور دیکھو مزینہ کے جوان تمہارے سامنے سے گزر رہے ہیں۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ابوسفیانؓ جو کتنے ہی معرکوں کا سالار رہے تھے حیرت اور دبے ہوئے خوف کے ساتھ اس دبدبۂ اسلامی کا مشاہدہ کرتے رہے یہاں تک کہ نبی اکرم علیہ السلام والصلوٰۃ انصار و مہاجرین کے جلو میں سامنے آئے۔ حضرت ابوسفیانؓ کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ آج زمین پر کون ہے جو محمد کے مقابل آسکے۔ اس کے خیال اور تصور میں اُحد کے لمحات آگئے ہوں گے جب اس کی آواز گونج رہی تھی۔ عمر کہاں ہیں؟ ابوبکر کہاں ہیں اور محمد کہاں ہیں اور صحابہ کی خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے نعرہ لگایا تھا کہ ہبل کی جے ہو اور اس کے جواب میں صحابۂ کرامؓ نے اللہ کی عظمت اور اور سربلندی کا نعرہ بلند کیا تھا۔

۱۷ رمضان ۸ ھ کی اس صبح اس منظر کو دیکھ کر ابوسفیان نے کہا عباسؓ! تمہارے بھتیجے کی بادشاہت کے کیا کہنے۔ کیسی مستحکم بادشاہی ہے محمد ﷺ کی۔ حضرت عباسؓ نے جواب دیا ابو سفیانؓ! اب تو سمجھ لو یہ بادشاہت کا جلوہ نہیں، نبوت کی سطوت ہے۔ نبوت کے سر پر اللہ تعالیٰ

کے جلال کا سایہ ہے۔

دس ہزار افراد کے لشکرِ اسلام میں جدید الاسلام بھی تھے، اس کے باوجود فیضانِ نبوت نے بیشتر لوگوں کو تنظیم کے سانچے میں ڈھال دیا تھا، لیکن مسلمانوں پر قریش کے مظالم بہت سے ذہنوں میں تازہ تھے۔ ان میں مہاجر بھی شامل تھے اور انصار بھی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ انصار کے پرچم بردار تھے اور جب انصار کا دستہ حضرت ابوسفیان کے سامنے سے گزرا تو حضرت سعدؓ کے ہونٹوں پر یہ بول آہی گئے۔

اليوم يوم الملحمة

اليوم تستحل الحرمة

آج کا دن خوں ریزی کا دن ہے۔ آج ہر حرمت حلال ہو جائے گی۔

ابوسفیان نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معاملہ کہہ سنایا اور حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے خدشات کا اظہار نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کا وہ دن ہے جس میں کعبے کی حقیقی تعظیم کی جائے گی۔ اس ایک جملے سے فتحِ مکہ کی حقیقی غایت آئینہ ہوگئی ہے۔ یہ کسی کی شخصی فتح نہیں ہوئی۔ ربِ ذوالجلال نے اپنے رسولِ برحق کے ہاتھوں ان کے جدِ مکرم حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت اللہ کی تعظیم قائم کردی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انصار کا پرچم حضرت سعد بن عبادہؓ کے صاحب زادے کے سپرد کردیا گیا۔ اخلاقِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ میں اپنے ساتھیوں کی دل دہی اور ان کی تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی کوتاہیوں سے صرفِ نظر بھی شامل ہے اور وہ بھی اس لطافت اور نزاکت کے ساتھ کہ عزتِ نفس کا آبگینہ جراحت سے محفوظ رہے۔ اخلاق کے اس پہلو کا ایک معلم کے اندازِ تربیت سے خاص علاقہ ہے اور قرآنِ حکیم نے اس کی شہادت دی ہے کہ آپ کے اندازِ تربیت میں نرمی کا پہلو غالب تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ کے گرد جانثاروں کا وہ مجمع نہ ہوتا جو کسی نبی کو حاصل نہ ہوا۔ صحابۂ کرامؓ میں اسی اندازِ تربیت سے اعتماد پیدا ہوا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ

لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (۶)

اللہ کی رحمت کے باعث آپ ان کے لئے (اپنے صحابہ پر) نرم دل ہیں۔ اگر آپ ان کے لئے سخت گفتار اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے چھٹ جاتے۔ آپ ان (کی کوتاہیوں) سے درگزر کریں اور ان کے لئے استغفار کریں اور باہمی معاملات میں ان سے مشاورت کریں۔

اسلامی لشکر بڑی تنظیم اور ترتیب کے ساتھ مکۂ معظمہ میں داخل ہوا۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ زیریں حصے سے شہر میں داخل ہوں۔ اس علاقے میں قریش سے مڈ بھیڑ کا اندیشہ تھا۔ حضرت خالدؓ کو ہدایت کی گئی کہ ان کا دستہ کسی حالت میں کسی فرد یا جتھے کے خلاف پہل نہ کرے لیکن ان کا راستہ روکنے والوں اور مزاحمت کرنے والوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ کوہِ صفا پر پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر عمل، ہر حکمتِ عملی اور ہر تدبیر میں کوئی نہ کوئی حکمت اور اخلاقی درس ہمارے لئے موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوتِ عام کا آغاز کوہِ صفا سے کیا تھا۔ یہیں ابولہب نے آپ کے خطبہ کو سن کر کہا تھا کہ تمہارا ستیاناس۔ ہمارا دن غارت کیا اور یہیں آج کے دن اس دعوت کی نصرت کے موقع پر مسلمانوں کو جمع ہونا تھا۔ کفر اپنے ہی مرکز میں پسپا ہو گیا تھا حضرتِ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کو مکے کے بالائی حصے سے شہر میں داخل ہونا تھا۔ ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم تھا۔ مکے کا بالائی حصہ وہ ہے جہاں آج رمضان المبارک میں جدہ سے عمرے کے لئے جانے والے اپنی گاڑیاں پارک کرتے ہیں۔ اس علاقے کا نام رمضان میں ہونٹوں پر گونجتا ہے۔ کداء کداء۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچم مکۂ معظمہ کے بالائی علاقے میں لہرا رہا تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے لشکر کے دو صحابی رستہ بھٹک کر لشکر سے الگ ہو گئے اور انہیں قریش نے شہید کر دیا۔ خندمہ کے مقام پر قریش نے سیف اللہ کا راستہ روکنا

۶۔ آل عمران: ۱۵۹

چاہا۔ جوابی کاروائی میں قریش کے بارہ آدمی مارے گئے اور قریش بھاگ کھڑے ہوئے۔ ان بھاگ کھڑے ہونے والوں میں عکرمہ بھی شامل تھے۔ آج کون تھا جو اسلام کی نصرت اور تقدیرِ الٰہی کا راستہ روک سکتا۔

حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ نے حجون پہنچ کر پرچم رسالت مآب نصب کیا۔ آپ کے قیام کے لئے ایک قُبہ بھی نصب کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں پہنچ کر کچھ دیر قیام فرمایا اور پھر ستاروں کے جلو میں مہتاب مسجدِ حرام میں داخل ہوا۔ یہ وہ انصار و مہاجرین تھے جنہوں نے حق کی سربلندی کے لئے سب کچھ قربان کرنے سے دریغ نہیں کیا اور جن کے عمل اور جذبۂ ایمان نے ان کے لئے بیت اللہ کے دروازے کھول دیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام میں داخل ہونے کے بعد کعبے کا رخ کیا۔ حجر اسود آپ کے بوسے کا کئی برس سے منتظر تھا۔ آپ نے حجرِ اسود کو بوسہ دے کر خانۂ کعبہ کا طواف شروع کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک کمان تھی۔ آپ اس کمان سے بیت اللہ شریف کے گرد موجود بتوں پر ضرب لگاتے جاتے اور قرآنِ حکیم کی یہ آیت آپ کے لبوں پر تھی۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝ (۷)

حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ یقیناً باطل تھا ہی نابود ہو جانے والا

جب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لئے مکۂ معظمہ سے مدینۂ منورہ کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو یہ کلماتِ قرآنی آپ کے لبوں سے دعا کی صورت میں جاری تھے۔

رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۝ (۸)

اے میرے رب جہاں بھی لے جا اچھی طرح لے جا اور جہاں سے نکال اچھی طرح نکال اور میرے لئے اپنی جناب سے غلبہ اور امداد عطا فرما۔

یہ دعائے نصرت سورۂ بنی اسرائیل کی ۸۰ ویں آیت ہے اور باطل کے نابود ہونے کا

۷۔ بنی اسرائیل: ۸۱

۸۔ بنی اسرائیل: ۸۰

ذکراسی سورت کی اکیاسویں آیت میں فرمایا گیا ہے۔ گویا ایام اللہ میں ہجرت اور فتح مکہ کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ ہجرت، قربانیوں اور جہد مسلسل کے یہ کٹھن اور جان لیوا دس سال تقویم الٰہی میں ایک ثانیے کے مثل ہیں۔ ہجرت اور فتح مکہ کا یہ متصل ذکر قرآنِ پاک کی توفیقی ترتیب کی گہرائیوں اور معنویت کی ایک مثال ہے۔ قرآن از الحمد للہ تا والناس اپنی موجودہ صورت میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اس کی ترتیب بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت ربی کے مطابق فرمائی۔ اس کتاب العجائب والغرائب کے رموز و نکات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سامنے آتے جائیں گے۔ یہ باب قیامت تک کے لئے کھلا ہے۔

اور یہ آیتِ قرآنی بھی اس موقع پر آپ ادا کر رہے تھے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُO (۹)

حق آچکا (سب پر ثابت ہو چکا)۔ باطل نہ تو پہلے کچھ کر سکا اور نہ (مستقبل میں) کر سکے گا۔

ان دونوں آیات کے اس موقع پر پڑھے جانے کی شہادت صحیح بخاری میں موجود ہے۔ (۱۰)

نبیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طواف اونٹنی پر بیٹھ کر کیا تھا اور آپ کے ہاتھ میں جو کمان تھی اس کی ضرب سے کتنے ہی بُت سرنگوں ہو گئے۔ طواف سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا کی بلندی پر تشریف لے گئے اور کعبے کی طرف رخ کر کے آپ دیر تک دعا میں مصروف رہے۔ آپ کی دعا میں اللہ تعالیٰ کا شکر بھی تھا کہ اس نے آج کفر کے جتھوں کو شکست دی اور اپنے بندے کو نصرت اور غلبہ عطا فرمایا۔ آپ کی یہی دعا آج بھی سعی کا آغاز کرنے سے پہلے عمرہ اور حج کرنے والے دہراتے ہیں۔ ہمارے اخلاق کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ فتحِ مکہ کا دن ہمیں یاد رہے اور ہم اسی جذبۂ شکر و عبدیت کا تجربہ کرنے کی کوشش کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات کو کس طرح دعا اور عبادات سے ہم آہنگ کر دیا، اس نکتے کو

۹۔ سبا: ۴۹

۱۰۔ بخاری: کتاب الجہاد۔ باب ازالۃ الاصنام من حول الکعبہ

جانے بغیر دعا کی طاقت اور اس کی نوعیت ہم پر آشکار نہیں ہو سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کلید بردارِ کعبہ کو بلا کر ان سے خانۂ کعبہ کی کنجی طلب فرمائی۔ کعبے کی دیواروں میں معبودانِ باطل کی تصویریں تھیں اور کعبے کے اندر ان کے بُت بھی رکھے ہوئے تھے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں میں فال کے تیر دکھائے گئے تھے۔ ان مجسموں کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان مشرکوں کو غارت کرے۔ ان عظیم المرتبت رسولوں نے کبھی تیروں کے ذریعہ فال نہیں نکالی۔ آپ نے تمام مجسموں اور بُتوں کو توڑنے اور تصویروں کو مٹا دینے کا حکم دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خانۂ کعبہ میں اللہ کی عبادت فرما کر جب کعبے سے باہر تشریف لائے تو مسجدِ حرام میں قریش صف بہ صف کھڑے تھے۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں اور دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اور دل کتنے ہی خدشات کی آماج گاہ تھے۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر اپنے بہیمانہ مظالم یاد آ رہے تھے۔ ان کے وجود لرز رہے تھے کہ یومِ مکافات آپہنچا ہے، لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے خطاب کرنے کے لئے زبان کھولی تو جیسے آپ کے ہونٹوں سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے بلکہ چشمۂ زمزم موج زن تھا۔ آپ نے قریش کے مظالم اور ماضی کا کوئی تذکرہ نہیں چھیڑا بلکہ انسان کی مساوات اور اخوتِ بنی آدم کا ذکر فرمایا۔ فرمایا کہ اے قریش! جاہلیت کا غرور اور انسان کُش روایات خاک میں مل گئیں۔ اب بنی آدم کی مساوات کا دور شروع ہونے جا رہا ہے، اور پھر آپ نے قرآنِ حکیم کی اس آیت کی تلاوت فرمائی جو مساواتِ انسانی کا منشور ہے۔ انسانی مساوات کے جو اعلان اور چارٹر انسان نے تصنیف کئے ہیں وہ سب مل کر اس منشورِ قرآنی سے فروتر ہیں۔ رنگ و نسل، قبائل اور کنبوں کو محض شناخت قرار دیا گیا، وجۂ امتیاز نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌO (۱۱)

۱۱۔ الحجرات: ۱۳

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے تخلیق فرمایا ہے اور تم کو قوموں قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ بیشک اللہ سب سے زیادہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

بنی آدم کی مساوات اور کردار وعمل کی برتری (تقویٰ) کے اس اعلان کے بعد کعبۂ معظم سے بُتوں کو بے دخل کرنے والے اور جہانِ نو کے معیارِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے سوال کیا کہ اے قریش والو! تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ آج کیا سلوک کرنے والا ہوں۔ یہ محض ایک خطیبانہ اندازِ تکلم ہی نہیں تھا بلکہ ایسا سوال تھا کہ قریش نبیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے بیس اکیس برسوں کے رویے اور برتاؤ کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ ظلم وستم کے یہ ماہ وسال ایک آن میں نظر کے سامنے سے گزر گئے، اور خجل انداز اور آواز میں قریش کا یہ جواب حرمِ پاک کی فضاؤں نے سنا کہ آپ کریم برادرزادے ہیں، اور آپ کی ذات بھی کریم ہے اور کریم ہی کرم کے انداز جانتا ہے۔ پھر حرم میں سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے اور خاموشی میں دلوں کے دھڑکنے کی آوازیں بھی جیسے سنائی دے رہی تھیں اور اس خاموشی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز نے توڑا۔ میں آج تم سے وہی کہنے جا رہا ہوں جو میرے بھائی یوسف نے صدیوں پہلے اپنے بھائیوں سے کہا تھا لاتثریب علیکم الیوم آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ اللہ کی شانِ کرم تاریخ میں ایک بار پھر نئے انداز سے اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا جواب جو قرآنِ مجید کی اس آیت میں آگیا ہے۔ عفو ودرگزر کی صدیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور پھر فتحِ مکہ کے پس منظر میں غور کیجئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتحِ عظیم کا یہ اعلان ہے **لا تثریب علیکم الیوم**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ کریمانہ کی بارش میں قریش نہا رہے تھے، اور اخلاق کے عظیم سلسلے کا ہر گوشہ تکمیل کا ہر سامان اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ قریش سے خطاب کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں بیٹھ گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو کتنے عزیز تھے، یہ بات تحریر میں کیسے اظہار پا سکتی تھی، اس کے بارے میں سوچا ہی جا سکتا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ آپ کے شفیق اور ''لاڈلے'' چچا تھے۔ مختلف روایتوں کے مطابق دونوں نے آپؐ سے خانۂ کعبہ کی کلید برداری کے اعزاز کے حصول کی درخواست کی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ عثمان بن طلحہ کہاں ہیں۔ وہ خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے کلیدِ کعبہ ان کے سپرد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ چابی تمہارے پاس مسلمانوں کی امانت ہے۔ آج کا دن نیکی اور وفاداری کا دن ہے۔ یہ چابی ہمیشہ کے لئے تمہارے (خاندان کے) سپرد کی جاتی ہے۔ یہ ایک امانت ہے جو تمہارے سپرد کی جاتی ہے اور جو اسے تم سے چھینے گا وہ ظالم ہوگا۔

فتح مکہ کے دن نو بڑے مجرموں کے قتل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جائز قرار دیا تھا۔ ان میں سے چند مکہ معظمہ سے فرار ہو گئے اور چند کی سفارش صحابہ کرامؓ نے کر دی جو آپ نے منظور فرمائی۔ جو بڑے مجرم سزا سے بچ گئے، ان میں عکرمہ بن ابی جہل اور کعب بن زبیر بھی شامل تھے۔ عکرمہ یمن بھاگ گئے تھے۔ ان کی بیوی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے لئے امان طلب کی اور ایمان لانے کے بعد عکرمہ کی زندگی کا ہر لمحہ اور ان کی موت بھی ان کے ایمان اور صداقت کی شاہد ہے۔ کعب بن زبیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر نعتیہ قصیدہ لے کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے اور رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا قصیدہ سماعت فرما کر انہیں ایک چادر عنایت فرمائی اور یہی قصیدہ قصیدۂ بردہ (اول) کے نام سے مشہور ہے۔

فتح مکہ کے دوسرے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان فرمانے کے بعد آپ نے مکۂ معظمہ کی حُرمت کا اعلان فرمایا۔ وہ حرمت جو قیامت تک قائم رہے گی، اس حرمت کے سارے ہی پہلو اخلاق سے متعلق ہیں۔ مکہ کی حرمت انسانوں اور جانوروں ہی کے لئے نہیں بلکہ نباتات کے لئے بھی اپنے دامن میں امن رکھتی ہے۔ اہلِ ایمان کے لئے حدودِ مکہ میں کسی کا خون بہانہ حرام ہے، حدودِ مکہ میں درخت کے کاٹنے کا حکم نہیں، انتہا تو یہ ہے کہ اذخر کے علاوہ کوئی دوسری گھاس بھی کاٹی نہیں جا سکتی۔ اذخر کے کاٹنے کی اجازت اس بنا پر دی گئی ہے کہ یہ دوا یا دوا کے جز کے طور پر استعمال

کی جاتی تھی اور لوہاروں کو اپنی پیشہ وارانہ ضرورت کے استعمال کے لئے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس سے اجازت یا منع کرنے کا یہ سبب واضح ہو جاتا ہے کہ جس چیز میں انسانوں کا نفع ہو وہ جائز ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ حقیقت بھی بیان فرمادی ہے کہ جس چیز میں منفعت ہو وہ زمین میں قائم رہتی ہے۔ اسلام کے نظامِ اخلاق میں ان محرکات اور اسباب کو قوت پہنچانا بھی شامل ہے جو انسان کو اعمالِ حسنہ پر ابھاریں اور نیکی کی فضا قائم کریں۔

فتح مکہ کے ساتھ ہی اسلام کے قانون صرف مدینۂ منورہ کی اسلامی ریاست تک محدود نہیں رہے بلکہ مکۂ معظمہ تک اسلامی ریاست کی حدود وسیع ہو گئیں۔ اسی موقع پر بنو مخزوم کی ایک بااثر خاتون فاطمہ مخزومیہ پر چوری کا الزام ثابت ہو گیا اور اس پر چوری کی حد (قطع ید) جاری کر دی گئی۔ یہ بات عرب معاشرے کے لئے عجیب تھی کہ امیر اور غریب دونوں پر قانون یکساں طور پر جاری کیا جائے۔ حضرت اسامہ نے فاطمہ مخزومیہ کی سفارش کی کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناگواری سے جواب دیا کہ پرانی قوموں کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ غریبوں کو جرائم کی سزائیں دی جاتیں اور سرمایہ داروں اور بااثر افراد پر قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس پر بھی حد جاری کی جاتی۔ اس انتہائی مثال سے قانون کے بارے میں ہر فرد کی برابری اور اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اسی واقعے کی بنا پر ناجائز سفارش سے بھی منع کر دیا گیا۔ جہاں اچھی سفارش کا اجر سفارش کرنے والے کو حاصل ہوتا ہے وہاں بری سفارش کا عذاب بھی سفارش کرنے والے پر پڑتا ہے اور اسے قبول کرنے والے پر بھی۔

فتح مکہ سارے مہاجرین اور انصار کے لئے عظیم خوشی کا عظیم موقع تھا۔ لات وہبل اور سارے معبودانِ باطل کعبہ سے بے دخل کر دیئے گئے اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس شہر حق کی جلالت وعظمت کا نشان بن کر واپس آئے جہاں سے آپ کو ہجرت کرنی پڑی تھی، لیکن اس موقع پر انصار کے دل ایک اندیشے سے بوجھل تھے اور انہوں نے چپکے چپکے ایک دوسرے سے اس اندیشے پر گفتگو بھی کی۔ اندیشہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب اپنے شہر

میں ہیں اور شاید آپ مدینے واپس نہیں جائیں۔ یوں ان کا شہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کی برکت سے محروم ہو جائے گا، مدینے کی فضائیں آپ کے وجود کی خوشبو کے بغیر کیسی بے کیف ہو جائیں گی اور مسجدِ نبوی کے محراب و منبر آپ ﷺ کے فراق میں گریہ وکناں رہیں گے۔ جب رحمتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کو انصار کے اس اندیشے کا علم ہوا تو آپ نے ان سے یہ فرمایا کہ اے گروہ انصار! میرا مرنا جینا تمہارے ساتھ ہے۔ آپ کے اس اعلان سے انصار کے چہروں پر ان کے دلی جذباتِ تشکر واطمینان رنگِ مسرت بن کر ہویدا ہو گئے۔ آپ کا یہ فیصلہ بھی آپ کے اخلاقِ کریمانہ کا ایک جز ہے۔ یوں آپ نے انصار کی قربانیوں کا اعتراف کیا اور اپنی اور مہاجرین کی ''میزبانی'' کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ یہ شکر مومن کی شناخت اور اس کے کردار کا حصہ ہے۔ مومن ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور انسانوں کا شکریہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ

من لم يشكر الناس لم يشكر الله (۱۲)

جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اپنے رب کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

شکرگزاری کے جذبات، انسان کی شرافت کی الگ دلیل ہیں۔ جو اس کو کوئی نفع پہنچائے شکرگزاری اس کے عملِ منفعت رسانی کا ایک اعتراف ہے۔ ہم کو ہمارے رب نے زندگی اور صحت عطا فرمائی، ہمیں ایمان کی دولت سے نوازا، ہمیں اچھا رفیق، اچھے بچے عطا فرمائے، رزقِ جلیل دیا، دینِ حق کی خدمت کی توفیق ارزانی کی، زندگی کے ہنگامے ہم پر سہل فرمائے۔ غرض زندگی کی ایک ایک ساعت اللہ کی نعمتوں سے عبارت ہے اور ہر نعمت کا شکر ہم پر واجب ہے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شکر سے بے نیاز ہے اور اس کی بہت سی نعمتیں مومن اور کافر دونوں کے لئے ہیں۔

وَمَنْ شَكَرَ فَإِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ○ (۱۳)

۱۲۔ ترمذی: ج ۳، ص ۳۸۳، رقم ۱۹۶۲

۱۳۔ النمل: ۴۰

جو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے وہ اپنے نفس اور اپنے نفع کے لئے شکر گزاری کرتا ہے اور جو ناشکری کرے تو میرا رب غنی اور کریم (اور ہر شکر گزاری سے بے نیاز) ہے۔

اللہ تعالیٰ بندوں کی شکر گزاری سے بے نیاز ہے مگر اسے بندوں کی شکر گزاری کی ادا پسند ہے، کیونکہ شکر گزاری اپنے بندے ہونے کا اعتراف ہے اور اسی لئے اس نے فرمایا کہ

نَجۡزِیۡ مَنۡ شَکَرَ (۱۴)

جو شکر ادا کرتا ہے ہم اسے جزا سے نواز تے ہیں۔

شکر اخلاق اور زندگی کا ایک وسیع باب ہے اور شکر کے مواقع اور شکر کی اہمیت پر کلام اللہ کی آیات گواہ ہیں۔

۱۴۔ القمر: ۳۵

غزوۂ حنین

مکہ معظمہ میں قریش کی شکست اور اسلام کی فتح اتنی اچانک تھی کہ قبائل عرب حیران رہ گئے۔ مدینے سے مکے تک ایک فوجِ جرار کے سفر سے رب العزت نے کفار کو غافل رکھا اور پھر کسی معرکے کے بغیر مکہ معظمہ پر اسلام کا تسلط بڑی ان ہونی سی بات تھی۔ بیشتر قبائلِ عرب نے تقدیرِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دیا اور انہوں نے اسلام کی بالادستی کو بہر حال قبول کر لیا لیکن ہوازن اور ثقیف کے قبائل اپنے کفر، اپنی عصبیت اور اسلام دشمنی میں شدید تھے اور انہوں نے ایک ''فیصلہ کن'' معرکے کے لئے اپنی قوتوں کو مجتمع کر لیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ فیصلہ تو ہو گیا ہے۔ ہوازن، ثقیف، مُضر، جُشم، بنی سعد اور بنو بلال کے جنگ آزما مالک بن عوف کی قیادت میں مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے اپنی عورتوں، بچوں اور مال مویشی کو اپنے ساتھ لیا۔ اس عمل کا مفہوم یہ تھا کہ اب کہیں لوٹ کر نہیں جانا ہے۔ فتح یا موت۔

یہ مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کے لئے مکے کی طرف بڑھے اور وادیٔ اوطاس میں خیمہ زن ہوئے جو حنین کے قریب ہے۔ اس فوج کشی کی اطلاع پا کر دشمن سے مقابلے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بارہ ہزار کی فوج کے ساتھ ۶ رشوال ۸ ھ کو مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے۔ اپنی تعداد پر صحابہ کرام کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اتنے بڑے لشکر کی تاب ہوازن و ثقیف کہاں لا سکتے ہیں؟ اپنی تعداد اور طاقت پر یہ غرور اللہ جل جلالہٗ کو پسند نہ آیا۔ اللہ کی فوج وقتی طور پر اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھی تھی کہ فتح و شکست کا تعلق تعداد پر نہیں ہے بلکہ اپنے مقصد کی حقانیت اور اللہ کی نصرت سے ہے۔ رب العزت نے انہیں بے سروسامانی کے

عالم میں بدر واحزاب وخیبر میں فتح یاب کیا تھا۔ اس غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وادیٔ حنین کے درّوں میں چھپے ہوئے ہوازن وثقیف کے تیراندازوں نے ان پر تیروں کی بارش کی اور پھر وہ ان پر ٹوٹ پڑے تو ان کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر معمولی شجاعت کا ثبوت دیا۔ آپ کا یہ استقلال غزوۂ اُحد کی پامردی سے کہیں بڑھ کر تھا۔ تیر کی بارش میں آپ کے ہونٹوں پر یہ کلمات تھے۔

انا النبی لا کذب

انا ابن عبد المطلب

آپ اپنے خچر پر سوار تھے اور اس افراتفری کے عالم میں بھی مقابلے کے لئے آپ کا رخ کفار کے لشکریوں کی طرف تھا۔ آپ کے گرد چند صحابہ رہ گئے تھے۔ ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے جنہوں نے سرکارِ آسماں مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر صحابہ کو آواز دینا شروع کیا۔ اے اصحابِ بیعتِ رضواں، اے بدر واحد کے جاں نثارو درخت کے نیچے اپنی جان کی قیمت پر بیعت کرنے والو۔ کہاں ہو، ادھر آؤ، اللہ کے رسول کی طرف آؤ۔ حضرت عباسؓ کی پاٹ دار آواز وادی میں گونج رہی تھی جسے سن کر صحابہ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جانیں قربان کرنے کا جذبہ موج زن ہوگیا۔ وہ لوٹ پڑے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد آہنی حصار بن گئے، اور فریقین میں شدید جنگ شروع ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری روداد قرآنِ حکیم کی دو آیات میں بیان کردی ہے۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِىْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ
اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ
الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ
عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۚ وَعَذَّبَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (۱)

بیشک اللہ نے بہت سے میدانوں (اور علاقوں) میں تمہیں فتح دی ہے اور

۱۔ التوبہ: ۲۵،۲۶

حنین کے دن جب تمہیں اپنی کثرت پر غرور ہوگیا تھا، لیکن تمہیں اس سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا، اور زمین اپنی کشادگی کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی تھی اور تم پیٹھ پھیر کر مڑ گئے تھے۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور مومنوں پر سکینت اور تسلی نازل فرمائی اور وہ لشکر اُتارے جنہیں تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور کفر کرنے والوں کو پورا عذاب اور سزا دی۔ اور یہی عذاب ان کافروں کی جزا تھا۔

غزوۂ حنین کی ساری تفصیلات اس اجمال کے دامن میں چھپی ہوئی ہیں۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ حنین میں کئی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ مسلمانوں پر سکینت کا نزول، فرشتوں کی فوج کا مدد کے لئے آنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مٹھی خاک لے کر کفار کی طرف پھینکنا اور فرمانا شاہت الوجوہ اور دشمن کے ہر سپاہی کی آنکھ کا اس مٹی سے متاثر ہونا۔

فتحِ مکہ، غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے کئی گوشے اس طرح ابھر کر سامنے آئے کہ آج تک وہ واقعات چشمِ ایام کو روشن کر رہے ہیں۔ آپ کی شجاعت، عفو و درگزر کا ذکر آچکا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اصحاب کے ساتھ آپ کے تعلق اور شفقت کی طرف بھی اشارہ کیا جاچکا ہے، اور کس طرح آپ نے انصار کی میزبانی کا شکریہ اپنی قائم رہنے والی رفاقت اور مستقل قیامِ مدینہ کے ذریعے ادا فرمایا۔ جود و سخا اور عطا و کرم سے آپ کی فطرت کا تار و پود اللہ رب العزت نے بُنا تھا، اور خاص طور پر ہر رمضان میں آپ کی سخاوت کا ظہور اسی طرح ہوتا جیسے نرم ولطیف ہوا مسلسل چل رہی ہو۔ غزوۂ حنین کے بعد بہت زیادہ مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ چھ ہزار قیدی، چوبیس ہزار اونٹ، بکریاں تقریباً پچاس ہزار، ڈیڑھ پونے دو لاکھ درہم، سونے کی بڑی مقدار۔ اس سارے مالِ غنیمت کی تقسیم میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے عجلت نہیں فرمائی۔ آپ کی شفقت ہوازن والوں کے تائب ہونے کی منتظر تھی کہ اگر وہ تائب ہوکر مسلمان ہوجائیں تو ان کا سارا مال و اسباب انہیں واپس کردیا جائے۔ اگرچہ مسلمانوں کو بھی اس مال کی ضرورت تھی لیکن حضورؐ کا قلبِ درد آشنا خوب جانتا تھا کہ مغلوبوں کو اپنے مال ومتاع کا کتنا غم ہوگا۔ دوسری طرف فتحِ مکہ کے بعد

اسلام قبول کرنے والے اس مالِ غنیمت کو دیکھ رہے تھے۔ مختلف قبائل اور قریش کے سرداروں کے دلوں میں اس مالِ غنیمت سے حصہ پانے کی آرزو ان کے چہروں سے صورتِ سوال نظر آرہی تھی۔ پھر نو مسلموں کی تالیفِ قلب کا اصول قرآن میں بیان کیا جا چکا تھا۔ انسانوں کا خالق فطرتِ انسانی کے ہر رجحان اور ہر کمزوری کو خوب جانتا ہے اسی لئے اس نے مولفۃ القلوب کو دولتِ دنیا کے ذریعے دینِ حق پر جم جانے کی طرف اپنے رسول کو متوجہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زر و مال سے یہ "رشتہ" تھا کہ گھر میں اگر سوال نے یا چاندی کا کوئی "ٹکڑا" رہ جاتا تو آپ ﷺ کو اس وقت تک نیند نہ آتی جب تک اسے صدقہ نہ کر دیا جاتا۔ اس مالِ غنیمت کو آپ نے مدینے کی ریاست کے لئے بھی بچا کر رکھنا مناسب نہ سمجھا بلکہ اسے مولفۃ القلوب اور مجاہدین میں تقسیم کر دیا اور اس طرح کہ ان نو مسلموں کو پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ یہ دنیا اپنی تمام دولت کے ساتھ اللہ کے رسول کی نظر میں کتنی حقیر ہے اور انسانوں کی خوشی آپ کو کس درجے عزیز ہے۔ آپ نے ابوسفیان بن حرب کو کم و بیش چھ سیر چاندی اور سو اونٹ مرحمت فرمائے۔ ابھی اسلام کی اقدار ان کے دل میں راسخ نہیں ہوئی تھیں اور دنیا کی طمع نے ان کے دل میں فقر کے لئے جگہ نہیں پیدا کی تھی۔ اپنا حصہ پا کر انہوں نے کہا کہ "اور میرے بیٹے یزید کو آپ نے کچھ نہیں دیا"۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید کو بھی اتنا ہی عطا کیا۔ اس بخشش کو دیکھ کر خواہش دنیا اور بڑھ گئی۔ پھر سوال کیا "اور میرا بیٹا معاویہ"۔ جودِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاویہ کو بھی اسی قدر بخش دیا۔ ایک خاندان کو کم و بیش اٹھارہ سیر چاندی اور تین سو اونٹ مالِ غنیمت سے مل گئے۔ اس عطا اور سخاوت کو دیکھ کر بدوؤں نے آپ کو گھیر لیا اور آپ سب کو کچھ نہ کچھ دیتے چلے گئے۔ لوگوں کی اس یلغار میں آپ ایک درخت سے جا لگے اور آپ کی چادر درخت کی شاخوں میں پھنس گئی۔ آپ نے فرمایا کہ میری چادر تو مجھے دے دو۔ بخشش کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ مالِ فے میں سے بھی کچھ نہ بچا۔

نو مسلموں اور قریش میں مالِ غنیمت کی اس تقسیم کی حکمت انصارِ مدینہ اس وقت نہیں سمجھ سکے۔ شیطان انسان کے ساتھ لگا ہوا ہے اور موقع پاتے ہی ایمان پر حملہ کرتا ہے۔ انصارِ مدینہ میں اپنی اس مالی محرومی پر چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں۔ انصار میں سے کسی آدمی نے یہاں

تک کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم کی طرف جھک گئے ہیں اور ہمیں بھول گئے۔

اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ذاتی یا گروہی مفادات کسی بھی جماعت کے افراد کو اپنی وحدت اور اپنے مقاصد سے وقتی طور پر دور کر سکتے ہیں، اسی لئے جماعت کی مختلف وحدتوں میں اتنا ربط لازم ہے کہ وہ ایک دوسرے سے اپنے خیالات کا تبادلہ کر سکیں، اور آپس ہی میں گفتگو کر کے اختلافات کو نہ بڑھائیں اور اپنے آزمائے ہوئے رہبر پر یقین رکھیں، اور یہاں تو معاملہ اللہ کے رسول کا تھا جس کے کسی عمل میں بھی کسی غرض یا کسی کی جانب داری کا شائبہ تک ممکن نہیں ہے۔ جب انصار کی یہ باتیں حضرت سعد بن عبادہؓ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ انصار کو اپنے خیمے میں جمع کر لو اور جب انصار جمع ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے مجمع میں تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے گروہِ انصار! تمہاری خفگی اور مالِ غنیمت کے سلسلے میں تمہاری باتیں اور بدگمانیاں مجھ تک پہنچی ہیں۔ کیا تم بھول گئے کہ جب میں تم میں آیا تھا تو تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ میرے وسیلے اور اسلام کے ذریعے اللہ جل جلالہٗ نے تمہارے دل جوڑ دیے، جب میں تمہارے درمیان آیا تو تم حق سے دور اور گمراہ تھے اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمہیں ہدایت عطا کی، میں جب تمہارے درمیان آیا تو تم مفلس تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں غنی بنا دیا۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بول رہے تھے اور مجمع پر مکمل سکوت طاری تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام کو منقطع کرتے ہوئے انصار سے اچانک کہا کہ تم کچھ تو جواب دو، خاموش کیوں ہو؟ انصار نے کہا کہ اے اللہ کے رسول کیا جواب دیں۔ سب اللہ اور رسول کا کرم ہے، فضل ہے۔ آپ نے فرمایا۔ نہیں نہیں، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اگر تم یہ کہو اے محمد! جب تیری قوم نے تیری تکذیب کی اور تو ہمارے پاس آیا تو ہم نے تیری تصدیق کی، جب تجھے وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا تو ہم نے تجھے ٹھکانا دیا، جب تو بے یار و مددگار تھا تو ہم تیرے مددگار رہے۔ کہو، کہو، یا معشر الانصار کہو۔ اور میں تمہاری ہر بات پر کہوں گا کہ تم سچ کہہ رہے ہو۔ اے اللہ کی رضا کے لئے اللہ کے رسول کے مددگار بننے والو! اب تم اس دنیا کی دولت کے لئے مجھ سے ناراض ہو گئے جسے میں نے تمہارے ایمان سے کم تر

جان کرنئے ایمان لانے والوں کے دل جوڑے۔ اے انصار! کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو گے کہ دوسرے سونا، چاندی، اونٹ بکریاں لے جائیں اور تم اللہ کے رسول کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے ہجرت ضرور کی ہے مگر میں اپنے آپ کو تم میں شمار کرتا ہوں۔ اگر سارے لوگ ایک راہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر تو میں انصار کے راستے پر چلوں گا۔ اے اللہ! تو انصار پر رحم فرما، انصار کے بیٹوں پر رحم فرما، اور بیٹوں کے بیٹوں پر رحم فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب سن کر انصار اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے۔ ان کی سسکیوں اور آہ وبکا کی آوازیں حضرت سعد بن عبادہؓ کے خیمے میں گونج پڑیں۔ انصار کی ڈاڑھیاں ان کے آنسوؤں سے تر ہوگئیں، دل کا غبار چھٹ گیا، مال و دولت کی خواہش دل سے رخصت ہوئی اور اللہ اور رسول کی محبت نے دلوں کو بھر دیا۔ انصار چلا اُٹھے کہ ہم خوش بخت ہیں کہ اللہ کا رسول ہمارے حصے میں آیا ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث میں انصار کے فضائل بیان کئے گئے ہیں اور ان سے محبت کے ثمرات کا ذکر ملتا ہے۔ حُب الانصار کتبِ احادیث کا مستقل باب ہے۔ بخاری شریف میں حضرت براُرضی اللہ عنہ کی یہ روایت موجود ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ صرف مومن ہی انصار سے محبت رکھ سکتا ہے اور صرف منافق ہی ان سے دشمنی رکھ سکتا ہے۔ پس جو شخص ان سے محبت کرے گا اس سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا اس سے اللہ تعالیٰ بغض رکھے گا۔ (۲) ایک مرتبہ جب انصار کی عورتیں اور بچے کسی شادی سے واپس آرہے تھے تو ان کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور آپ نے تین مرتبہ فرمایا:

انتم احب الناس الیَّ

تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو۔

۲۔ بخاری: کتاب الایمان۔ رقم ۹۶۹

ہوازن کا وفد خدمتِ رسول اللہ ﷺ میں

مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد ہوازن کا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں چودہ افراد تھے۔ اب یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے۔ اپنی شکست نے انہیں یقین دلایا تھا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہ ہوتے اور آپ کے ساتھ اللہ کی نصرت نہ ہوتی تو انہیں غلبہ حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ اپنی شکست کے بعد یہ لوگ اس فیصلہ پر کئی دنوں کے بعد پہنچے۔ اس وفد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی چچا بھی شامل تھے۔ انہیں دیکھ کر نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ کو اپنے بچپن کے وہ دن یاد آگئے، جو آپ نے حضرت حلیمہ سعدیہ کے قبیلے میں گزارے تھے۔ اور پھر رضاعی چچا حضرت ابو یرقان نے اپنی معروضات پیش کرتے ہوئے کہا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی وہ خالائیں، آپ کی وہ پھوپھیاں اور آپ کی وہ دادیاں جو آپ کو کھلایا کرتی تھیں اور وہ آپ کو دیکھ کر خوش ہوتی تھیں آج قیدیوں میں شامل ہیں۔ آپ بچپن میں بھی حلیم، کریم اور صاحبِ اخلاق تھے اور نبوت کے بعد تو آپ کے اخلاق و کردار کریمانہ کے کرم کی کوئی حد نہیں رہی۔ آپ احسان فرما کر اپنے قیدیوں کو آزاد فرما دیں۔ ہم تاخیر سے آئے ہیں اور مالِ غنیمت تقسیم ہو چکا مگر ہمیں اپنے مال کی واپسی سے زیادہ اپنے قیدیوں کی رہائی عزیز ہے، ہم پر احسان فرمائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدوں کے سامنے ساری صورتِ حال رکھ دی اور ان سے کہا کہ وہ اپنی خوشی سے قیدیوں کو آزاد کر دیں گے تو ان کا رب انہیں اجر عطا فرمائے گا۔ انصار تو ایک بڑے جذباتی بحران سے گزر چکے تھے اور مہاجرین تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سارے مرحلے طے

کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بیک آواز کہا کہ ہمارا جو کچھ ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ہے۔ ہم اپنے قیدی اللہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لئے آزاد کرتے ہیں۔ بنو تمیم، بنو سلیم اور بعض قبائل کے سرداروں نے قیدیوں کو آزاد کرنے پر رضامندی ظاہر نہیں کی لیکن بنو سلیم نے اپنے سردار کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے قیدیوں کو رضائے الٰہی کے لئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی تعمیل میں آزاد کرتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بیشتر صحابۂ کرام کے دلوں میں کتنی راسخ تھی اور آپ نے آزادیٔ رائے کی روایت کس درجہ عام کر دی تھی۔ ان امور میں باہمی مشاورت پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا اور صحابۂ کرامؓ اکثر اخلاقی پہلوؤں کو اپنے فیصلوں میں اہمیت دیتے تھے۔ یہ وہ اخلاقی فضا تھی جس سے آج کے ''جمہوری'' معاشرے محروم ہیں اور اپنے مفادات سے بلند ہو کر فیصلے نہیں کرتے۔

ہر راہ مدینے کی طرف

فتح مکہ کے ساتھ لات، ہبل اور عزیٰ کی خدائی کا دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ قبائلی عصبیتوں نے دم توڑ دیا۔ قریش کی سرکشی نے اسلام کی سربلندی کے سامنے سر جھکا دیا۔ عرب کے قبائل نے فتح مکہ کی تحریر میں اپنے مستقبل، اور آنے والے زمانے کے خدوخال کو پڑھ لیا۔ فتح مکہ کے بعد غزوۂ تبوک نے عالمی نقشے پر مستقبل میں اسلام کی بالادستی کا دیباچہ رقم کر دیا۔ اس کے بعد ۹ ھ میں اسلام کے دارالحکومت مدینہ منورہ میں قبائل عرب کے وفود کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ قبیلوں کے عمائد، سربرآوردہ افراد مدینے میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کے لئے آنے لگے۔

قبائل کے یہ وفد قبول اسلام کے لئے آ رہے تھے لیکن منظر نامہ ایک دم تو نہیں بدل جاتا۔ دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے آسمان، افق اور زمین میں کتنی تبدیلیاں تیزی کے ساتھ رونما ہوتی ہیں۔ رات کے تاریک ترین حصے کے بطن سے اجالا جنم لیتا ہے، افق کا منظر تبدیل ہونے لگتا ہے، صبح کا گمان گزرتا ہے اور پھر یہ گمان حقیقت میں بدلنے لگتا ہے۔ صبح کاذب صبح صادق میں بدلنے لگتی ہے، افق کے کناروں کا رنگ آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگتا ہے اور فضا میں یہ کیفیت خاصی دیر تک ٹھہرتی ہے اور تب سورج کی اولین کرنیں نمودار ہوتی ہیں۔ قبائل نے اسلام کے غلبے کو مان لیا تھا مگر دل کی فضا اور کیفیت سب آہستہ آہستہ بدلتی ہے۔ قبائلی نظام عرب کی زندگی کی بنیاد تھی، اجنبیوں کا بھی کسی نہ کسی قبیلے سے تعلق پیدا کرنا زندگی کے لئے لازم تھا اور قبیلوں میں مسابقت کا یہ عالم تھا کہ ہر اہم قبیلے کا بت جداگانہ تھا اور خصوصی اہمیت کا مالک

تھا۔ ہر قبیلے کی زبان کا لہجہ جداگانہ تھا اور وہ اپنے لہجے کو فصیح ترین مانتے تھے اور ان پہلوؤں کو ان کے خطیب اور شاعر اجاگر کرتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بھی یہی کیفیت تھی کہ اچھے مسلمان بھی بسا اوقات اپنے قبیلے اور اسلام کے تقاضوں اور مفادات کے درمیان آویزش کے موقعوں پر وقتی طور پر تذبذب کا شکار ہو جاتے۔ عام الوفود میں جو قبیلے مدینہ منورہ آئے ان میں سے کئی اپنے شاعروں اور خطیبوں کے ساتھ آئے کہ وہ ان کے امتیازات اور برتری کو پیش کریں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی مفاخرت ان کی زندگی سے ایک دم رخصت نہیں ہو گئی تھی۔ ان امتیازات کو ختم کرنے میں مدینہ منورہ کی عام فضا اور صحابۂ کرام کے رہن سہن نے بڑا حصہ لیا۔ ان قبیلوں نے دیکھا کہ اس اسلامی معاشرے میں قریش کے زعما عام انصاریوں کی صف میں کھڑے تھے اور تو اور مدینہ منورہ کے معاشرے میں ابوبکرؓ، عمرؓ، سعدؓ بن عبادہ جیسے مہاجر اور انصار، بلال حبشی اور سلمان فارسی کے ہم رتبہ اور ہم مرتبہ تھے۔ وہاں اگر امتیاز تھا تو علم و تقویٰ کی بنیادوں پر تھا۔ اسی طرح اب مفاخرت کی بنیاد قبیلہ نہیں تھا بلکہ اسلام کی خدمت تھی۔ اگر فرق کیا جاتا تو اسلام سے تعلق اور اسلام کی خدمت کی بنا پر۔ اہل بدر، بیعت رضوان والے زیادہ محترم تھے مگر اس احترام کا تعلق لوگوں کے رویے سے تھا، سماجی رعایت اور اعتبار سے نہیں۔

وفود کی مسلسل آمد کا سلسلہ فتح مکہ کے بعد شروع ہوا، لیکن کئی قبیلوں کے وفد اس سے پہلے مدینہ منورہ آ چکے تھے، ان کا تعلق تجارت پیشہ قبائل سے تھا اور یہ اس تجارتی شاہراہ سے گزرتے رہتے تھے جو مدینہ منورہ کے قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ قبیلۂ دوس کا وفد ۶ھ کے اواخر یا ۷ھ کے اوائل میں مدینہ منورہ آیا تھا۔ اس قبیلے کے سردار طفیل بن عمرو دوسیؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے قبیلے میں مسلسل تبلیغ اسلام کی، مگر قبیلے والوں نے ان کی دعوت پر مثبت ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس بات سے عرب کے قبائلی نظام میں سرداروں کی اہمیت کے ساتھ ساتھ قبیلے کے عام افراد کی اہمیت اور آزادیٔ رائے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد حضرت طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آئے اور اپنی تبلیغی کوششوں کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا اور اپنی

ناکامی کے پیش نظر ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے کامیابی کی دعا کی التجا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کی دعا قبول فرمائی اور قبیلہ دوس کے دل اسلام کے لئے کھول دیے۔ قبیلہ دوس کا ایک بڑا وفد ۷ھ میں فتح خیبر کے موقع پر سرکار ختمی مرتبت کی خدمت میں حاضر ہوا۔

عام الوفود میں کم و بیش ساٹھ ستر وفد مدینہ منورہ میں آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان وفود سے مسجد نبوی میں ملاقات فرماتے تھے اور آج بھی مسجد نبوی میں ریاض الجنۃ کا ایک ستون ان وفود کی آمد کا گواہ ہے۔ ان وفدوں کے احوال و کوائف مختلف ہوتے، بعض کے دل دماغ اسلام قبول کرنے پر پوری طرح آمادہ تھے۔ ایسے بھی قبائل تھے جو اسلام لانے کے لئے سودے بازی Bargaining کا منصوبہ بنا کر آئے تھے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ اپنی شرائط منوانا چاہتے تھے۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ایمان اپنے جان و مال کو اللہ کے ہاتھ فروخت کر دینے کا نام ہے اور اس تجارت میں نفع ایمان لانے والے کا ہے کہ اسے نتیجے کے طور پر جنت کا انعام عطا ہوتا ہے، ہمیشہ کی خوش گوار زندگی سے بڑھ کر اور کیا نفع حاصل ہو سکتا ہے؟ وفدِ ثقیف کی ذہنی کیفیات کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا پورا اندازہ تھا۔ ان کی سخت دلی اور ضد پر ان کی تاریخ گواہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ ان کے ذہن اسلام کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں اور صرف ان کی زبان ہی نہیں بلکہ ان کے دل بھی اسلام کی تصدیق کریں کیونکہ

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس وفد کے قیام کا بندوبست مسجد نبوی کے ایک گوشے میں کیا گیا تا کہ یہ مسلمانوں کے روز و شب کو دیکھ سکیں۔ اس وفد نے دیکھا کہ مسلمان دن میں پانچ مرتبہ کس تنظیم سے نماز ادا کرتے ہیں اور کس طرح درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کس طرح ان کی راتیں اپنے رب کے سامنے قیام و رکوع و سجود میں گزرتی ہیں، کس طرح خشیتِ الٰہی سے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری رہتے ہیں۔ کس نرمی، دل سوزی اور خلوص سے یہ ایک دوسرے سے معاملہ کرتے ہیں اور کس طرح ان کی زندگی کے ہر پہلو پر اسلام کی مہر ثبت ہے۔ کئی دنوں کے

بعد امیرِ وفد نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو ایک معاہدہ امن سے نوازیں۔ اس معاہدے کی رو سے انہیں شراب پینے، سودی کاروبار کرنے اور زنا کی اجازت دی جائے، نماز کا حکم ان سے ساقط کیا جائے، انہیں اپنے بت توڑنے پر مجبور نہ کیا جائے اور اللہ کے ساتھ ساتھ لات کی خدائی بھی برقرار رکھی جائے۔ ثقیف والے میدانِ جنگ میں تو ہار چکے تھے لیکن ان کے ذہنوں میں اپنے اندازِ حیات کو باقی رکھنے کا بت زندہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کی کوئی شرط قبول نہیں تھی۔ بارگاہِ حق صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی شرط قبول نہیں کی۔ آخر ثقیف والوں نے آپس میں مشاورت کی اور آخر وہ اپنی شرائط سے دست بردار ہو کر اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوئے۔

ثقیف والوں کی کیفیت مختصراً بیان کی گئی۔ کئی وفد والے تو دل کی گہرائیوں سے اسلام کی صداقت کو تسلیم کر کے حصارِ دین میں داخل ہو گئے اور کچھ قبیلوں کے وفد یا ان کے چند رکن دو دلی کا شکار تھے۔ بعض طالع آزما مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ کر رہے تھے اور آنے والے دور میں اقتدار میں شرکت کی خواہش ان کے دلوں میں کروٹ لے رہی تھی۔ بنی حنیفہ کے سترہ رکنی وفد میں مسیلمہ بن ثمامہ بن کبیر بھی شامل تھا جو تاریخ میں اپنے نسب سے محروم ہو کر مسیلمہ کذاب کے نام سے معروف ہوا۔ یہ اپنے وفد کے دوسرے ارکان کے ساتھ اسلام قبول کرنے کے لئے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ اس کی سرکشی اس کی ابلیسی طبیعت کی غماز تھی۔ ابلیس کی سرکشی کا سبب اس کا تکبر اور خود پرستی تھی۔ یہی خود پرستی مسیلمہ کا راستہ بھی روک رہی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تواضع اور اخلاقِ کریمانہ کو اس جاہ طلب شخص نے کمزوری پر محمول کیا اور اس نے مطالبہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلامی ریاست کی حکم رانی اس کے سپرد کی جائے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ مطالبہ تسلیم کر لیں۔ مسیلمہ کے اس مطالبے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں کھجور کی ایک شاخ تھی۔ آپ نے مسیلمہ سے کہا کہ اگر تم اس شاخ کا ایک ٹکڑا بھی مجھ سے مطالبے کے طور پر مانگو گے تو تمہیں یہ بھی نہیں ملے گا۔ تمہاری سرکشی کے بارے میں اللہ کا فیصلہ ہے کہ تم اسلام سے روگردانی کرو گے تو اللہ تمہیں توڑ کر رکھ دے گا۔ مسیلمہ کذاب نے مدینے سے واپسی پر یہ دعویٰ کیا کہ رب العزت نے اسے کارِ نبوت میں محمد (صلی اللہ علیہ

وسلم) کا شریک بنایا ہے۔ اس نے اقرارِ نبوت محمدی کے ساتھ ساتھ اپنی نبوت کے اقرار کو اسلام کا حصہ قرار دیا۔ انتہا تو یہ ہے کہ اس نے شریکِ نبوت کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے قاصد بھی بھیجے اور انجام کار عہدِ صدیق اکبرؓ میں وہ یمامہ میں قتل کر دیا گیا اور ارتداد و سرکشی کا یہ فتنہ فرو ہوا۔

مسیلمہ کذاب کے معاملے میں عبرت اور سبق کے کئی پہلو ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں مسیلمہ سے گفتگو کرتے ہوئے کھجور کی شاخ تھی اور آپ نے اس کی طرف اشارہ کر کے یہ بتا دیا کہ دنیاوی حکومت کی حیثیت کھجور کی معمولی شاخ سے زیادہ نہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تجھے توڑ کر رکھ دے گا اور یہ کام اتنا معمولی ہوگا کہ جیسے شاخِ تمر کا ٹوٹ جانا۔ مسیلمہ کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وحشی جب بھی حضرت حمزہؓ کی شہادت کا واقعہ یاد کرتے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ جانتے تھے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد حالتِ کفر کے تمام گناہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیتا ہے مگر وہ اپنے جرم کو بہت شدید جانتے تھے۔ حضرت حمزہؓ کی وفات پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کرب کی شدت بھی ان پر ایمان لانے کے بعد آشکار ہو گئی تھی۔ ان کی تمنا تھی کہ اپنے اس ''جرم'' کے کفارے کا بارگاہِ ایزدی سے انہیں کوئی موقع عطا ہو۔ مسیلمہ کے قتل سے انہیں سکونِ قلب حاصل ہوا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے یوں ان کے جرم کی معافی کا اشارہ عطا کر دیا ہے۔

عام الوفود میں جو وفد اسلامی مملکتِ مدینہ کے سربراہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ مدینہ کے قرب و جوار اور عرب کے مشرکین کے وفود تک محدود نہ تھے بلکہ اسلام کے غلبے سے خاصے دور کے قبائل اور علاقے متاثر ہو رہے تھے۔ ان علاقوں میں نجران کا عیسائی علاقہ بھی شامل تھا۔ نجران کا علاقہ تہتر بستیوں پر مشتمل تھا۔ یہ عیسائی علاقہ تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں بھی مسلمانوں کا واسطہ عیسائیوں سے پڑا تھا اور اب اسلام کی بالادستی کے اولین دور میں بھی عیسائیوں سے رابطہ قائم ہوا۔ ابتدائی دور میں نجاشی نے حسن سلوک کا بے مثال مظاہرہ کیا اور خود بھی مسلمان ہو گیا۔ عام الوفود میں عیسائی وفد سے مباہلے کی نوبت آتے آتے

رہ گئی۔ عیسائی وحی اور رسالت کے تصور سے خوب واقف تھے اسی لئے انہوں نے آخرالامر مباہلے سے گریز کیا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد نجران کے کم وبیش ایک لاکھ عیسائی حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ اس وفد کے واقعات کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

وفدِ نجران ساٹھ افراد پر مشتمل تھا اور اس وفد میں نجران کی آبادی کے ہر طبقے کے نمائندے شامل تھے۔ نجران کے انتظامی امور کا سربراہ عبدالمسیح، نجران کے معاشرتی اداروں کا سربراہ ایہم اور نجران کے کلیسا کا سربراہ ابن علقمہ، یوں یہ اعلیٰ اختیارات کا وفد تھا۔ اس سے اس سفارت کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وفدِ نجران نے سلیقے اور تہذیب سے گفتگو کی۔ کئی معاملات کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قبول اسلام کی دعوت دی کہ یہ آپ کا فرض تھا۔ وفدِ نجران نے اثبات میں اس دعوت کا جواب دینے کے بجائے آپ سے حضرت مسیح ابنِ مریم کے بارے میں سوال کیا۔ آپ حضرت عیسیٰ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ عیسائی وفد تفصیل سے جاننا چاہتا تھا۔ اشارۂ الٰہی کے تحت آپ اس وقت خاموش رہے اور آپ پر اسی دن جو آیات نازل ہوئیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں رب العزت نے وفدِ نجران کا جواب دیا اور اللہ تعالیٰ کے معبودِ برحق اور غالب وحکیم ہونے کے ساتھ یہ بھی فرمادیا گیا کہ جو کوئی اس حقیقت کو تسلیم نہ کرے وہ مفسد ہے۔ اللہ کی عبادت اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانے کو قرآن مجید نے "عیسائیت" اور اسلام کے درمیان انصاف کی بات قرار دیا اور اسی کی طرف عیسائیوں کو دعوت دی۔ ان حقائق کو بیان کرنے کے ساتھ ان آیات میں سے ایک آیت میں ان کو دعوت مباہلہ دی گئی تاکہ حق وباطل کے درمیان فیصلہ ہو جائے۔ اگر فریق مخالف دلیل کو نہ مانے تو فیصلہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دینا ہی انسب ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ
كُنْ فَيَكُوْنُ O اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ O فَمَنْ
حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَ
نَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ

نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ O اِنَّ هٰذَا لَهُوَ
الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ O فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ O قُلْ يٰٓاَهْلَ
الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ
وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ O (۱)

اللہ کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے جسے مٹی سے تخلیق کیا گیا یہ کہہ کر کہ "ہوجا" پس وہ ہوگیا (کن فیکون)۔ تیرے رب کی طرف سے حق یہی ہے پس شک کرنے والوں میں نہ ہوجانا۔ پس جو شخص آپ کے پاس اس علم اور حقیقت کے آجانے کے بعد بھی آپ سے جھگڑا کرے تو آپ اسے کہہ دیں کہ ہم تم اپنے بیٹوں اور اپنی عورتوں اور اپنی جانوں (اپنے آپ) کو بلالیں اور پھر عاجزی کے ساتھ اللہ سے التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت (کی دعا) کریں۔ یقیناً یہی سچی بات ہے اور اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی غالب اور صاحبِ حکمت ہے اور اگر پھر بھی قبول نہ کریں تو اللہ تعالیٰ مفسدوں سے خوب واقف ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب اس انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں برابر ہے (اور وہ یہ) کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کے ساتھ (عبادت اور اطاعت میں) شریک نہ کریں۔ اور نہ اللہ کو چھوڑ کر ایک دوسرے ہی کو رب بنالیں، پس اگر (ان حقائق سے) اہل کتاب منہ موڑ لیں تو تم کہہ دو "گواہ رہنا، کہ ہم مسلمان (اور اہل ایمان) ہیں۔

کس کس طرح سے رب کائنات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے ہے اور

۱۔ آل عمران: ۵۹ تا ۶۴

آپ کے ذریعے مکارمِ اخلاق کی تکمیل فرمائی اور ہر شعبۂ حیات کے لئے آپ کو بہترین نمونہ بنایا۔ رول ماڈل کا تصور بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور مسلمانوں کو عطا فرمایا ہے۔ آپ کا اخلاق انسانوں کے لئے مثالیہ ہے، اس کی نقل، تقلید اور پیروی ہی کی کوشش انسانی ذات اور تکمیل کا وسیلہ ہے اگرچہ اس کو تمام وکمال اپنانا ممکن نہیں۔ مثالئے کا مقصد ہی تکمیل کی آرزو اور اس کے لئے جدوجہد ہے۔

دعوت اور مکالے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی ہدایت کے مطابق وہ شائستگی عطا فرمائی جس تک پہنچنے کی ادنیٰ کوشش بھی ''مہذب'' اور ''متمدن'' انسان نے نہیں کی۔ سرسید کا مضمون بحث وتکرار کا ابتدائی حصہ آج کے تہذیب یافتہ انسانوں کی مجالس اور مذاکروں کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بحث کا مقصد حقیقت تک پہنچنا نہیں بلکہ اپنے موقف کو دوسروں پر ٹھونسنا ہے۔ اپنے الفاظ کے ذریعے فریقین ایک دوسرے کی کس طرح کردار کشی کرتے ہیں وہ معلوم بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہ نکتہ ہمیں عطا کیا کہ مشترک پہلوؤں کو اہمیت دی جائے۔ اہل کتاب سے کہا گیا کہ اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان برابر ہے۔ پھر مباہلے کے اخلاقی پہلو پر غور کیجئے کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے الجھنے کی جگہ اللہ سے رجوع کریں اور اس سے التجا کریں اور ایک دوسرے پر لعنت کرنے کی جگہ جھوٹے پر لعنت کریں اور سچ جھوٹ کا فیصلہ رب العزت پر چھوڑ دیں۔ یہ اخلاقیات کی اعلیٰ ترین سطح ہے کہ بحث اور مکالے کا مقصد کسی فریق کی برتری نہ ہو بلکہ صداقت کا فروغ ہو اور پھر مباہلے کا طریق کار ایسا ہے کہ سچ کو نفس، ذات اور رشتوں پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو لے کر مباہلے کے لئے آ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں۔ اب وفدِ نجران پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے مباہلے پر آمادہ ہیں۔ وفد کے سربراہ نے ایک دوسرے سے مشاورت کی اور انہوں نے یہ طے کیا کہ اگر محمد اللہ کے رسول ہیں تو مباہلے کے بعد ہماری نسلیں تباہ ہو جائیں گی، اور ایک نبی کی آمد کا

تذکرہ تو انجیل میں بھی تھا۔ اس پر وہ مباہلے سے باز رہے اور انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے بارے میں آپ نرمی سے فیصلہ فرما دیں اور آپ کا فیصلہ ہمیں قبول ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ اہلِ نجران، سال میں دو مرتبہ کپڑے کے ایک ہزار جوڑے اور مجموعی طور پر پندرہ سو کلو چاندی دیں گے۔ اسلامی نظامِ اخلاق فرائض وحقوق کی ادائیگی کا نام ہے۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرائض کا ہر لمحہ خیال رہتا تھا اور انہوں نے مسلمانوں کے حقوق، احسانِ کاملہ کے ساتھ ادا فرمائے، اہلِ نجران کے ساتھ آپ نے پورا انصاف فرمایا۔ جزیے کی ادائیگی کے عوض انہیں حفاظت کا ذمہ عطا کیا گیا اور مذہب کے بارے میں مکمل آزادی دی گئی۔ ان کے گرجے عبادت کے لئے آباد رہے بلکہ ان کے لئے ان کے قوانین بھی جاری وساری رہے۔ ان شرائط پر مشتمل ایک دستاویز بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کو عطا کی۔ عہدِ نبوت اور عہدِ خلافت راشدہ کا ہر لمحہ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ اسلام جبر اور طاقت کے ذریعہ نہیں پھیلا۔ مسلمان ہر حال میں اس فرمانِ الٰہی کے تابع رہے کہ لا اکراہ فی الدین۔ (۲)

اس معاہدے کے بعد صلح کے مال کی وصولی کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امین امت حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو نجران بھیجا۔ اس صلح کے بعد اہلِ نجران اسلام اور مسلمانوں سے قریب تر ہو گئے۔ مسلمانوں کے اخلاق اور اس صلح نامے کی منصفی نے ان کے قلوب اسلام کے لئے کھول دیے۔ نجران میں تیزی کے ساتھ اسلام پھیلنے لگا۔ وفدِ نجران کے تین سربراہوں میں سے دو مسلمان ہو گئے۔ ... جلد ہی مسلمانوں کی تعداد اتنی ہو گئی کہ صدقات کی وصولی کے لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نجران بھیجے گئے۔

آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ ثقیف اور بنی حنیفہ کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا رویہ رہا، کس طرح آپ ﷺ نے ان کی سودے بازی کو مسترد کیا، کس طرح حق اور باطل کے درمیان امتیاز کو جلی تر فرمایا اور کس طرح اہلِ نجران کے ساتھ انصاف اور فیاضی کا معاملہ فرمایا۔ عام الوفود میں جو ساٹھ سے زیادہ وفد مدینہ منورہ آئے ان سب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا

۲۔ البقرہ: ۲۵۶

برتاؤ ان کی کیفیات کے مطابق رہا۔ آپ نے ہر ایک کے ساتھ اعلیٰ ترین اخلاق کا سلوک برتا۔ ''برتاؤ'' سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر ایک کے مسائل آپ نے ان کے سوالات اور ضروریات کے پیش نظر حل فرمائے۔ ان میں بعض قبائل آنے سے پہلے ہی ایمان لا چکے تھے اور اسلامی عبادات و شعائر میں پختہ ہو چکے تھے۔ انہی قبائل کے افراد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جو سوالات پیش کئے وہ عمل، ایمان و عقائد کی بلند تر سطح سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ ایسے قبائل تھے جو ایمان لا چکے تھے اور نماز، روزہ ادا کر رہے تھے لیکن اسلامی طرز حیات کے بارے میں ان کے ذہن میں سوالات تھے جو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے۔ ان میں سے بعض قبائل اپنے مسائل اور مشکلات کو حل کرنے کے لئے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں اور آپ کی امداد کے طالب تھے۔ ان تمام وفدوں کے نام، حدیث و مغازی اور سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ مگر یہ تمام تفاصیل ہمارے دائرے اور مقصدِ تالیف سے متعلق نہیں ہیں، اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا ہر واقعہ، ہر واقعے کی جزئیات ہمارے لئے راہِ ہدایت کو روشن تر کرتی ہیں۔ ہم چند وفود اور ان کے حالات و سوالات کو مختصراً پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ تفصیلات اخلاق محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض گوشوں کو سامنے لاتی ہیں۔

وفدِ عبدالقیس کے علاقے اور مدینۂ منورہ کے درمیان مشرکین آباد تھے۔ اس لئے عبدالقیس والے حرمت والے مہینوں میں سفر کر سکتے تھے۔ یہ لوگ ایمان لا چکے تھے، اسلام کی وہ تمام باتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرنا چاہتے تھے جو انہیں جنت کا مستحق بنا سکیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کی خیر خواہی اور نجات کے حریص تھے اور عبدالقیس کے مسلمان جنت، نجات اور خیر کے حریص تھے اور ان تمام باتوں کا سرچشمہ حاملِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کو سمجھتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے معانی اور مفہوم بتاتا ہوں اور ایمان لانے کا حکم دیتا ہوں۔ ایمان لانا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور عبادت اس کے احکام کی کامل اطاعت کا نام ہے اور توحید الٰہی کے ساتھ سچے دل سے اس بات کی گواہی ایمان کا جز ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے

رسول ہیں۔ میں تمہیں نماز قائم کرنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیتا ہوں اور اس بات کا حکم کہ غنیمت میں سے خمس ادا کرو۔ ان ہدایات میں اسلام کی روح سمٹ کر آگئی ہے وہ روح جو افراد کی ذات کا حصہ بن کر معاشرے میں جاری و ساری ہو جاتی ہے، اسلامی معاشرے کے تمام ادارے انہیں عبادات کے مشہور اور حسی مظاہر ہیں، نماز کفر اور اسلام کے درمیان فرق ہے، زکوٰۃ اور روزے سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے اور زکوٰۃ اسلامی معاشرے میں گردشِ زر کا وسیلہ ہے جس سے قلوب کو طہارت اور معاشرے کو آسودگی و خوش حالی ملتی ہے۔

اس وفد والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ اس نقیر کے بارے میں جانتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ تم لوگ درختوں کے بڑے تنوں کو کھود کر اس میں پانی اور کھجوریں ڈال دیتے ہو۔ یوں نقیر بن جاتی ہے جس کے نشے میں مدہوش ہو کر تم آپس میں تلوار چلاتے ہو اور اپنے چچازاد بھائی کو بھی زخمی کر دیتے ہو۔ وفدِ عبدالقیس میں سے ایک شخص کو ایسا ہی زخم لگا تھا۔ حضور کے منہ سے یہ بات سن کر اسے نقیر کی حرمت کا اندازہ ہو گیا۔ اور دوسرے ارکانِ وفد کو پتہ چل گیا کہ نقیر، خمر میں شامل ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کس حد تک عرب کے مختلف علاقوں کے حالات سے باخبر تھے۔ مصلح کے لئے اصلاح کے عمل کی تکمیل کے لئے یہ علم ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ان ہدایات اور ارشادات میں حج کا ذکر نہیں کیونکہ جب یہ وفد مدینۂ منورہ آیا تو اس وقت تک حج فرض نہیں ہوا تھا۔

٩ ھ ہی میں بنوسکون کا ایک ذیلی قبیلہ (بنوتجیب) بھی مدینۂ منورہ آیا۔ یہ لوگ بھی عبدالقیس کی طرح ایمان لا چکے تھے اور ارکانِ اسلام پر کاربند تھے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے زکوٰۃ کی رقم بھی لائے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ زکوٰۃ واپس لے جاؤ۔ اس پر تمہارے قبیلے کے غربا و مساکین کا حق ہے۔ وفد نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! ان کا حق ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچا ہم وہ لے کر آئے ہیں۔ یہ سن کر ایک نازک موقع پر اپنا سارا اثاثہ اللہ اور رسول کی خدمت میں پیش کرنے والے

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس وفد نے صدقاتِ کے سلسلے میں ایک اعلیٰ روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ پہلا قبیلہ تھا جو مدینۃ الرسول کے مساکین کے لئے زکوٰۃ لے کر آیا تھا یہ واقعہ تفقہ فی الدین کی مثال ہے۔ زکوٰۃ پر پہلا حق تو مقامی مساکین کا ہے، اور پھر جو مال بچے اسے دوسرے علاقوں کے مستحق افراد کو دیا جا سکتا ہے۔ پھر مدینہ کے مستحقین کی خدمت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کا پہلو بھی موجود ہے۔

پھر بنو تجیب کے ارکانِ وفد نے اپنے قیامِ مدینہ کے دوران نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآنِ حکیم کا درس لیا اور آپ کی احادیث کے معانی سیکھے۔ اسلام سے اس وفد کے لگاؤ، شعائرِ اسلام سے ان کی وابستگی اور علمی ذوق و تجسس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ علم و عمل کے باہمی رشتے کو معلم اعظم اور ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون جان سکتا تھا۔ اگرچہ یہ بات ایک خاص سیاق و سباق میں کہی گئی ہے مگر اسے قرآن حکیم کا مستقل حکم سمجھنا چاہئے کہ

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (۳)

پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر (اہلِ علم) سے پوچھ لو (اور دریافت کرلو)۔

اور بنو تجیب والے تو اس سے علم حاصل کر رہے تھے جس کا سینہ وحی الٰہی کا امانت دار تھا اور جو اس امانت کو برداشت کرنے ہی کی طاقت نہ رکھتا تھا بلکہ جس نے انسانوں تک اس امانت کو اس طرح پہنچایا کہ یہ امانت قیامت تک کے لئے انسانیت کی سب سے قیمتی میراث بن گئی۔

اس پر لاکھوں سلام اور کروڑوں درود

جب بنو تجیب کا وفد اپنے وطن واپس جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ انہیں دوسرے وفود کی نسبت زیادہ قیمتی تحفے دیئے جائیں۔ ان کے اس اعزاز کا سبب دین سے ان کا گہرا شغف اور رویہ تھا۔ تحائف عطا کرتے

۳۔ النحل: ۴۳

وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ سب کو تحفے مل گئے، یا کوئی باقی ہے؟

اہلِ وفد نے بتایا کہ ایک لڑکے کو ہم اپنی قیام گاہ میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس نوجوان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا بھیجا۔ وہ حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ دنیا میری غرض اور طلب نہیں ہے۔ آپ اپنے رب سے میرے لئے دعا فرمائیں کہ وہ میری مغفرت فرمائے اور میرے دل کو غنی بنا دے۔ دنیا سے اس کی بے نیازی اور عاقبت کی فکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور خوشی عطا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں دعا فرمائی اور اسے بھی دوسروں کے برابر تحائف عطا کئے۔ دعائیں اس کی طلبِ صادق کا انعام تھیں اور تحائف میں وہ دوسروں کے برابر اور ان کا شریک تھا۔ فیاضی اور عدل اور فرد کے ظرف اور حال کے مطابق التفات، ان اخلاقی محاسن کا یہ اجتماع ہے اور یہ توازن اللہ کے رسول کے علاوہ کسی سے ظہور میں نہیں آ سکتا تھا۔

دوسرے وفود کے ارکان نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقائدِ دین اور عبادات کے علاوہ معاشرت اور عام زندگی کے معاملات میں بھی ہدایات حاصل کیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ کا پیغام کس طرح ذہنوں اور زندگی کو متاثر کر رہا تھا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام رسمی معنوں میں عبادات اور عقائد کا نظام نہیں ہے بلکہ یہ بود و باش، رہن سہن اور روز مرہ کی زندگی کو بھی اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے اور زندگی کے چھوٹے معاملات بھی انسان کی عبادات، عقائد اور اندازِ فکر ہی کا حصہ ہیں اور ان سے بے تعلق نہیں۔

ان آنے والے وفود میں سے بعض نے اپنے علاقے کی ضرورتوں کے حل کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعانت طلب کی یا آپ سے دعا کی درخواست کی۔ قبیلۂ ذی مرہ والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ ان کا علاقہ قحط سالی کا شکار ہے، انسان اور جانور بھوکوں مر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے بارش کی دعا کی اور جب یہ لوگ تحائف اور امدادی سامان لے کر اپنے وطن واپس لوٹے تو انہیں معلوم ہوا کہ جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علاقے کے لئے دعا فرمائی تھی اسی دن بارانِ رحمت نے ان کی

زمین کو جل تھل کر دیا۔ زمین یا انسانوں اور دوسرے حیوانوں کو سیرابی کی دولت مل گئی۔ بالکل ایسا ہی معاملہ سلامان کے وفد کے ساتھ پیش آیا۔ ان کے علاقے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کی دعا کی اور رحمتِ باری تعالیٰ پانی کی بوندوں کی شکل میں ان پر نازل ہوئی۔

بنو عامر کے وفد نے آکر اپنے اسلام کا اعلان کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اہم مسائل معلوم کئے اور آپ سے درخواست کی کہ اسلام کے اہم احکام تحریری شکل میں عطا کئے جائیں تاکہ وہ واپس جا کر ان خطوط پر قبیلہ والوں کو اسلامی طرزِ حیات سے آگاہ کر سکیں۔ بنو عامر کے وفد نے مدینہ منورہ میں خاصے دن قیام کیا۔ ان کے قیام کا مقصد اسلام کے احکام کا علم حاصل کرنا اور قرآنِ حکیم کی تعلیم تھا ان لوگوں کو حضرت ابی بن کعبؓ نے قرآن مجید پڑھایا تھا۔

وفود کے آنے اور مدینہ منورہ میں ان کے قیام سے جو نکات ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں سے چند پیش کئے جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغام کے داعی اکبر تھے، آپ نے انسانوں کو اپنے رب کے حکم سے صراطِ مستقیم کی طرف بلایا اور اس دعوت کے سلسلے میں تبشیر و تنذیر کا حق ادا کیا۔ ہر وفد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مروت برتی لیکن دین کا کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو آپ نے انتہائی استقامت کا اظہار فرمایا۔ بنو ثقیف نے ارکانِ دین کو اپنی خواہشات کے تابع کرنا چاہا، بنو حنیفہ کے مسیلمہ نے نبوت میں شرکت کا مطالبہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سختی کے ساتھ ان کے مطالبات کو رد کر دیا اور کھجور کی ایک شاخ کو اشارہ اور علامت قرار دیتے ہوئے اسے ادنیٰ ترین رعایت دینے سے انکار فرما دیا۔ آپ کے رب نے آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ آپ کا دین جو حق مطلق ہے تمام ادیان پر غالب آکر رہے گا۔

وفودِ عرب سے آپ کی ملاقاتیں، گفتگو اور ہدایات آپ کے فرضِ نبوت کی تکمیل کی اہم صورت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ربانی ہدایت اور حکم پر عمل کیا اور اس طرح جو عمل کرنے کا حق تھا۔ ان وفود نے اپنی آنکھوں سے آپ کے شب و روز کا مشاہدہ کیا۔ اپنے اصحابِ ذی وقار کے ساتھ آپ کی شفقت، مہمانوں کے ساتھ آپ کا فیاضانہ برتاؤ، دین کی

تعلیم کے وقت آپ کا اندازِ بیان، وضاحتیں اور قول و عمل کی انتہائی مطابقت یوں تمام وفود پر اسلامی احکام کی عملیت و افادیت واضح ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان وفود کے دینی اور دنیوی مسائل سنتے اور ان کے حل پیش فرماتے۔ یوں آپ نے ہر دور کے مسلمانوں پر یہ بات واضح فرما دی تھی کہ اسلام میں دین اور دنیا کی تفریق نہیں ہے بلکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ مسائل انسانی زندگی کی طرح متنوع تھے۔ کئی لوگوں نے اپنے خواب بیان کئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان خوابوں کی تعبیر بیان کی۔ اسلام میں خوابوں کی بڑی اہمیت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کے ذریعے رب العزت نے انسان کو خوابوں کی اہمیت سے آگاہ کیا اور آج تو نفسیات میں خواب کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ حدیث میں خواب کی تعبیر کو ایک مستقل باب کی حیثیت حاصل ہے۔ انسانی اخلاق کے باب میں نفسِ انسانی کی تفہیم حد درجہ اہم ہے اور خواب نفسِ انسانی کی گرہ کشائی میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی شعور ہی کو نہیں بلکہ تحت الشعور اور لاشعور کو بھی تہذیبِ اخلاق کے دائرے میں شامل کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان وفود کی معاشرتی مسائل کے سلسلے میں بھی رہنمائی فرمائی ان مسائل کے بغیر اجتماعی اخلاق کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، کسی وفد کے ارکان نے دریافت کیا مہمانی کتنے دنوں کے لئے ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ مہمان کو تین دن رہنا چاہئے اور اس سے زیادہ میزبان پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے۔ یہ ضیافت اور میزبانی اسلام کے نظامِ اخلاق میں بڑی اہمیت رکھتی ہے مسلمان معاشروں میں مہمان کو باعث برکت اور اللہ کا انعام سمجھا جاتا ہے اسی لئے مہمان کو میزبان کی حدود اور معمولات کا خیال رکھنا چاہئے۔ مہمان کا زیادہ طویل قیام میزبان کے وسائل پر بوجھ بنتا ہے اور اس کے معمولات میں اور دیگر کاموں میں حارج ہوتا ہے۔ صرف تعلیم کی غرض سے زیادہ عرصے تک قیام کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرح کے میزبان پر بوجھ نہ بنے اور اگر ہو سکے تو مہمان میزبان کی اجازت سے اس کے اخراجات اور کاموں میں شرکت کر سکتا ہے۔ حقیقی اخلاق کی بنیاد انسانی حدود،

ضرورتوں اور مسائل کو سامنے رکھ کر دلوں میں رکھی جا سکتی ہے۔

اسلامی عبادات، بنیادی عقائد اور معاشرتی مسائل سے متعلق تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان وفود کو فقہی امور سے بھی آگاہی عطا کی گئی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم احسانوں میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذہن مسلم کو تفکر کا خوگر اور عادی بنادیا۔ قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مسائل پر غور وفکر نے فقۂ اسلامی کو پروان چڑھایا۔ فقہ عہد رسالت کے بعد کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ کسی وفد سے قریش کی مختلف شاخوں کے نسب پر گفتگو ہوئی اور اس سے یہ شرعی نکتہ واضح ہو کر سامنے آیا کہ کسی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنا نسب غلط بیان کرے۔ نسب کا صحیح بیان معاشرے کو پاکیزگی اور تقویٰ عطا کرنے کا ایک سبب ہے۔ غلط نسب بیان کرنے کا دائرہ اپنی ماں پر تہمت لگانے تک پھیل سکتا ہے۔

کسی وفد کا کوئی رکن یا بعض ارکان ریشم کے لباس پہن کر آئے تھے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کے لئے ریشم کی حرمت کا مسئلہ بیان فرمایا تو ریشمی لباس تلف کر دیئے گئے اور جس سے یہ مسئلہ واضح ہوا کہ حرام مال کو تلف کیا جا سکتا ہے۔ ان وفود میں عورتیں نہیں آئی تھیں اسی لئے ریشمی لباس کو عورتوں کو دینے کے بارے میں نہیں سوچا گیا، لیکن وہ لباس عورتوں کے لئے مناسب بھی نہیں تھے۔ اسلام سے وابستہ ہونے والے یہ افراد اپنی زندگی کے ہر شعبے کو اسلام کے رنگ میں رنگ دینے کے بارے میں بہت حریص تھے۔ ان کا اسلام کے بارے میں وہ رویہ نہیں تھا جو آج ہمارا ہے کہ جہاں ہمیں کوئی زحمت نہ ہو تو وہاں اسلام سر آنکھوں پر، اور جہاں اسلام ہم سے طرز حیات میں کسی تبدیلی کا مطالبہ کرے تو ہم اس سے انحراف کر لیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب

عام الوفود کا اہم ترین دینی اور معاشرتی حکم

فتح مکہ کے بعد مدینہ منورہ کے قرب وجوار کے دیہاتی (اعراب) تواتر کے ساتھ شہر رسول آنے لگے۔ مسلمانوں کو دیکھنے، ان سے کچھ سیکھنے اور داعیہ باطن کے تحت اسلام قبول کرنے کے لئے۔ ۹ھ میں وفود کے پیہم آنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ وفد ۵ھ میں بھی آئے اور ۱۰ھ میں۔ یہ تربیت یافتہ لوگ نہیں تھے۔ ان کے طرز رہائش اور انداز زیست میں وہ نرمی، میانہ روی، سلیقہ اور پاکیزگی نہیں تھی جو اسلام کی تعلیمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے ان کے ساتھیوں میں پیدا کر دی تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ، بیٹھتے تو باادب ہو کر، اٹھتے تو سلیقے کے ساتھ، مجلس میں ایک دوسرے سے کلام کرتے تو آہستہ آواز میں اور باہمی احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے خطاب کرتے تو ان کی نظریں جھکی ہوئی ہوتیں اور وہ اس تحمل سے بیٹھتے کہ نامناسب جسمانی حرکات، بار بار پہلو بدلنے، جسم کو کھجانے وغیرہ سے پرہیز کرتے اور ان کو دیکھ کر گمان گزرتا کہ جیسے ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوں۔

اس کے برعکس اعرابیوں میں یہ احتیاط نہیں تھی۔ یہ بھی ہوتا کہ وہ مسجد نبوی میں بے احتیاطی سے تھوک دیتے اور صحابہ کرامؓ ان کو سختی سے ٹوکنے کی بجائے تھوک کو صاف کر دیتے۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کو کئی بار صاف کیا۔ صحابہ کرامؓ جمائی لیتے تو منہ

پر ہاتھ کر لیتے، کھانسی میں اگر بلغم آتا تو اسے کسی کپڑے سے پونچھتے اور کپڑے کو تہ کر کے اگلی مرتبہ کے لئے خشک حصہ کو اوپر کر لیتے۔ آنے والے دیہاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے آداب سے بھی بے خبر تھے، کبھی کبھی بات کو کاٹ دیتے یا خطبے کے درمیان کھڑے ہو کر سوال کرتے اور شفقتِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر ناگواری کے اثرات بھی نظر نہ آتے۔

۹ ہجری میں بنی تمیم کا وفد مدینہ منورہ آیا۔ بعض ارکانِ وفد نے حجراتِ امہات المومنین کے سامنے جمع ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ یہ نہ ہوا کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باہر تشریف لانے کا انتظار کرتے یا کسی کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع کرتے۔ رب العزت کو یہ بات ناگوار ہوئی اور یہ آیات نازل ہوئیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يُنَادُونَكَ مِنْ وَرَآءِ الْحُجُرَاتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○
وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاللّٰهُ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (۱)

(اے رسول) جو لوگ آپ کو حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہوں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ آپ کے (حجروں سے) باہر نکلنے تک صبر کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا۔ اللہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی راحت اور آرام کا رب العزت کو جس طرح اور جتنا خیال تھا اور انسانوں کی کوتاہیوں کے لئے معافی اور درگزر کی جو وسعت تھی، یہ دونوں باتیں ان آیات میں سمٹ آئی ہیں۔ بے عقلی کا اندازہ تو اسی سے کیا جا سکتا ہے، کہ اپنے وقت کے زیادہ سے زیادہ حصے کو امت کی بہبود اور تعلیم وہدایت میں صرف کرنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ان اعرابیوں نے یہ تک نہ سوچا کہ انہیں کچھ وقت آرام کرنے اور اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ رہنے کا بھی حق ہے۔ اگر کچھ سوالات جواب طلب تھے یا کوئی اور ضرورت تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے باہر تشریف لانے کا انتظار مناسب تھا۔

۱۔ الحجرات: ۴۔۵

اور یہ کسی ایک مرتبہ کا واقعہ نہیں ہے۔ یہ اعرابی اکثر وقت بے وقت آجاتے اور آپ سے سوالات پوچھنے لگتے۔ رؤف ورحیم رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی دل شکنی کے خیال سے انہیں روکا ٹوکا نہیں، لیکن اللہ جل جلالہٗ کو حق بات کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اعرابیوں کو اس بات پر ٹوکا اور اسے ایمان کی ایک اہم اور بنیادی بات سے وابستہ کر دیا، اور وہ ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ ذرا سی بے احتیاطی حبط اعمال کا سبب بن سکتی ہے۔ سورۃ الحجرات کی پہلی دو آیات اسی بارے میں ہیں۔ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں پیش قدمی عہدِ رسالت سے متعلق کوئی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دائمی معاملہ ہے۔ اپنے خیال اور رائے کو اللہ اور رسول کے فیصلے پر مقدم رکھنا مومنوں کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بغاوت ہے اور اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کے مقابل اپنی آواز کو بلند رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نفس گم کردگی ہی ایمان کا تقاضا ہے۔ وہ دو ابتدائی آیات یہ ہیں:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ
لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ (۲)

اے اہل ایمان! اللہ اور رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو (اور اس کا تقویٰ اختیار کرو)۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند نہ کرو اور نبی سے اونچی آواز میں گفتگو نہ کرو جس طرح تم ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال حبط (اور غارت) ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

قرآنِ حکیم نے دوسرے مقامات پر بھی یہ بات واضح فرما دی ہے کہ جن باتوں میں

۲۔ الحجرات: ۱، ۲

اللہ اور رسول ﷺ کا فیصلہ موجود ہو تو اس میں فیصلہ کرنے یا اس فیصلے کو بدلنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ بات انفرادی اور اجتماعی تمام امور و معاملات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اور عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اس حکم میں اندازِ گفتگو، لہجے کی نرمی اور آہستگی یہ سب باتیں شامل تھیں۔

اس اصولی گفتگو کے بعد ان اعرابیوں کا ذکر ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حُجرات سے باہر آنے کا انتظار نہیں کرتے تھے اور بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آوازیں دینے لگتے تھے۔

مدینۂ منورہ کے قرب وجوار کے اعرابی اور ملک کے تمام علاقوں کے وفود دارالاسلام میں آرہے تھے۔ یوں ان کی عملی تربیت کے ساتھ ساتھ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا اور اسلامی اسلوب حیات کے تمام پہلوان کے سامنے آرہے تھے اور اسلام مختلف قبائل کے درمیان فکر ونظر اور عمل کی ہم آہنگی پیدا کر رہا تھا۔ کسی بھی انسانی معاشرے میں جو مسائل بالخصوص سماجی اور اخلاقی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں وہ بھی سامنے آرہے تھے اور آہستہ آہستہ یہ سب لوگ مدینہ منورہ کے اسلامی مزاج کے مطابق اپنے اخلاق کو ڈھال رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے نو واردوں میں تجسس بھی تھا جو مناسب حدود سے تجاوز کر جاتا، مختلف گروپوں اور قبائل کے درمیان عہدِ جاہلیت کی رقابتیں اور تعصبات کسی حد تک اس وقت بھی موجود تھے جو رنجش اور غیبت کی صورت میں نمودار ہوتے، اور ابھی تفاخر کی عادت پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان سب باتوں کے بدلنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق، آپ کے ارشادات اور انصار و مہاجرین کا طرزِ عمل اپنا کردار ادا کر رہا تھا۔

اب اسلام کی عالمگیریت کا دور شروع ہو چکا تھا۔ وہ وقت آگیا تھا جب نئے علاقے اور ملک اسلام کے زیرِ نگیں آنے والے تھے، اسی لئے نئے مسلمانوں کے لئے ان مسائل کے بارے میں ربانی ہدایات کی ضرورت تھی۔ اور بہت سے اخلاقی اور معاشرتی ضوابط کی ضرورت تو ہر دور کے لئے ناگزیر ہے، اسی لئے اس بدلتے ہوئے منظر نامے میں سورۃ الحجرات کی وہ آیتیں نازل ہوئیں جن کی اہمیت ابدی اور لازمانی ہے۔ ہر ملک اور ہر دور میں ہر انسانی معاشرے کے بہت سے اخلاقی اور سماجی مسائل ایک سے رہیں گے اور ان کے لئے رہنما

اصول لازم ہیں۔ خاص طور پر اس دین اور نظامِ حیات میں جو ہر دور اور ہر ملک کے لئے ہے تا کہ وہ انسانی معاشرہ وجود میں آسکے جو ملکوں، ریاستوں اور قومیتوں کے اختلاف کے باوصف انسان کی وحدت کا مظہر ہو۔

سورۃ الحجرات میں انفرادی اخلاق اور اجتماعی اخلاق کے مسائل اور مسلمانوں کے اخلاقی رویے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ مدنی دورِ رسالت کے آخری زمانے کی نازل ہونے والی سورتوں میں سے ایک ہے اور اس میں اس زمانے کے پیدا ہونے والے مسائل اور مستقبل قریب میں رونما ہونے والے مسائل کے بارے میں اخلاقی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ ہم پہلے خود انفرادی اخلاق کے معاملات کو پیش کرنے کی سعادت کر رہے ہیں کیونکہ افراد کا رویہ اجتماع اور اجتماعی اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بیشتر انسانی معاشرے مخلوط معاشرے ہوتے ہیں۔ متوازن معاشروں میں مختلف اجزا مل کر وحدت بن جاتے ہیں، لیکن ایک ذہنی مغائرت مختلف معاشروں میں موجود ہوتی ہے جیسے برطانیہ عظمیٰ کے معاشرے میں اسکاٹ لینڈ کے لوگوں کے بخل اور بعض باتوں کا تمسخر۔ اسی طرح ہمارے ہاں کسی خطے کے باشندوں کا مذاق اڑانا۔ یہ باتیں عام طور پر دل لگی اور دل چسپی کے لئے کی جاتی ہیں مگر کبھی کبھی بڑھ کر فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔ قرآن حکیم نے اس رویے سے اہلِ ایمان کو روکا ہے۔ کیونکہ یہ اکرامِ مومن کے خلاف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (۳)

اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں۔ ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے کو طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو ایمان لانے کے بعد

۳۔ الحجرات: ۱۱

فسق برا نام ہے اور جو لوگ اس سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔

کسی کا مذاق اڑانا ''بے ضرر سی بات'' نہیں ہے بلکہ اس سے دلوں میں اور معاشرے میں رخنہ پیدا ہوتا ہے۔ آپس میں دوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذاق اڑانے والا اپنے آپ کو بہتر اور بالاتر سمجھتا ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ دوسرے کو حقیر اور کم تر جانتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں اس بات کو ''کبر'' کہا جائے گا اور کبر، کبائر میں شامل ہے۔ حدیث کے مطابق جس میں کبر اور ریا ہو اس پر جنت کی خوشبو حرام ہوگی، کیونکہ یہ دونوں باتیں کفرِ خفی میں شامل ہیں۔ یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ عورتوں اور مردوں میں ذکر الگ الگ کیوں کیا گیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ مرد اپنی محفلوں میں اور عورتیں اپنی مجلسوں میں تمسخر کو عام نہ کریں، کیونکہ تمسخر عام طور پر مجلسی دلچسپی کے لئے کیا جاتا ہے۔ لطیف نکتہ یہ ہے کہ ہماری مجلسیں قولِ حسن اور قولِ معروف کو معاشرے میں عام کریں اور لغو باتوں سے احتراز کیا جائے۔

اس آیت میں ایک دوسرے پر طعن کرنے اور الزام لگانے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ یہ بات بہت عام ہے کہ کسی کے خاندان پر طعن کیا جائے یا کسی ایسی غلطی اور قصور پر جو ماضی میں کیا گیا ہو اور جس پر کرنے والے نے ندامت کا اظہار کر دیا ہو اور توبہ کر لی ہو۔ اسی طرح برے نام یا لقب سے کسی کو پکارنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ کوئی ایسا نام جو آدمی کو پسند نہ آئے اور برا لگے۔ آج ہماری اخلاقی گراوٹ کا یہ عالم ہے کہ لوگوں کے ناموں کے ساتھ لنگڑا، لولا، گنجا، ٹنڈا جیسے القاب عام ہیں اور اخبارات میں بھی لوگوں کے نام ان القاب کے بغیر نہیں لکھے جاتے، اور کہا جاتا ہے کہ یہ محض شناخت کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ ذہنی کجی کی انتہا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تاریخ انسانیت کی سب سے عظیم درس گاہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس درس گاہ کے کتنے ہی مقامات اور کیمپس تھے۔ مسجد نبوی اور صفہ اس کے ساتھ ساتھ امہات المومنین کے حجرے خواتین، بچوں، اعزہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور مہمانوں کی زندہ اور عملی درس گاہوں کا درجہ رکھتے تھے جہاں یہ سب آدابِ معاشرت، گفتگو اور تبادلۂ خیالات کی زبان اور لہجے اور صفائے قلب ونظر کے درس لیتے اور عملی امتحانوں سے گزرتے، کبھی مدینۂ منورہ کے باغوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تفریح کے اوقات درس گاہ بن

جاتے۔ یہ درس گاہ قیدِ مقامی سے بلند تر تھی۔ انسانیت اور اخلاقِ عالیہ کا ''رول ماڈل'' معلم بھی تھا، درس گاہ بھی تھا اور ''رفیق'' بھی تھا۔ اس درس گاہ کے طلبہ اخلاقِ حسنہ کے معلم بنے اور آج تک ان کے واقعات یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

اس درس گاہ، اس دبستانِ اخلاق کے معلم کی نظر صرف معاشرتی اور رسمی formal اخلاق پر نہیں تھی بلکہ وہ تو قلبِ انسانی کو اخلاق کا مرکز اور گہوارہ بنا رہا تھا۔ اس نے تجسس اور غیبت کے ساتھ ساتھ ربانی ہدایات کے مطابق ظن وگمان کی خرابیوں سے اخلاقِ انسانی کے دامن کو صاف کیا۔ یہ معلمِ اعظم علیہ الصلوٰۃ والسلام ربِ کائنات کا سب سے عزیز اور چہیتا طالب علم تھا۔ اپنے بھائیوں (انبیائے ماسبق) کی طرح وہ بھی انسانوں کے اخلاق کی تطہیر پر مامور کیا گیا تھا، مگر اس فرق کے ساتھ کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دین کے دوسرے شعبوں کی طرح اخلاق کی تکمیل بھی فرما دی۔ نظری طور پر بھی اور عملی طور پر بھی۔ قرآنِ مجید کی ایک آیت نے معاشرتی واجتماعی اخلاقی معائب کے ساتھ قلبِ انسانی کے ایک اخلاقی گناہ کو کس طرح سمیٹ لیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح ان کا تدارک فرمایا، معلم اور اس کے طالب علموں کی زندگی اس پر گواہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ
وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ
يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ
رَّحِيْمٌ ۝ (۴)

اے ایمان لانے والو! بہت گمان کرنے سے اجتناب برتو کہ بعض ظن اور گمان گناہ ہوتے ہیں اور لوگوں کے معاملات میں تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا۔ دیکھو تم خود اس سے کراہیت محسوس کرتے ہو (اور گھن کھاتے ہو)۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول

۴۔ الحجرات:۱۲

کرنے والا اور رحیم ہے۔

اس آیت میں بہت زیادہ ظن وگمان سے کام لینے کو منع کیا گیا ہے۔ سیاق وسباق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ظن سے مراد بدگمانی اور بدظنی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو خیر خواہی قرار دیا ہے۔ الدین النصیحة (۵) اس خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ مومن کسی قوی شہادت کے بغیر ایک دوسرے کے بارے میں اچھا گمان رکھیں۔ بدگمانی شک کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور اس سے زندگی میں تلخیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک چھوٹا سا ذاتی واقعہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جب کوئی تیس سال پہلے ہم ترکی گئے تو استنبول میں خیر مقدمی کلمات کے بعد ہمارے میزبان نے پوچھا کہ کتنے دن ٹھہرنے کا پروگرام ہے اور کیا واپسی کی تاریخ کا ٹکٹ پر اندراج کرالیا ہے۔ اس سوال سے میری جو ذہنی کیفیت ہو سکتی تھی قارئین اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میزبان کو میرے چہرے سے میری اذیت کا اندازہ ہو گیا۔ انہوں نے فوراً جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے ان رشتہ داروں کی فہرست ہے جو ہمارے ساتھ ساتھ اپنے پاکستانی بھائی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر دن ایک وقت کا کھانا یا ناشتہ تو ہم گھر پر کریں گے اور باقی کھانے ان رشتے داروں کے گھر کھانے پڑیں گے۔ اس فہرست کو دیکھئے۔ کم سے کم آپ کو آٹھ دن یہاں ٹھہرنا ہوگا اگر آپ کو زیادہ زحمت نہ ہو۔ میں نے اس لئے دریافت کیا کہ اگر کم دنوں کے قیام کا ارادہ ہے تو بشرطِ گنجائش گھر جانے سے پہلے ٹکٹ میں تبدیلی کرالیں اور بعد کی کسی تاریخ کی بکنگ ہو جائے، ورنہ ہوائی کمپنیوں کے ضابطوں اور قواعد کی وجہ سے ممکن نہ ہوگا۔ میں اپنی بدگمانی پر شرمندہ ہوا اور ٹکٹ پر واپسی کی تاریخ بڑھوائی گئی۔ اس طرح بدگمانی، گناہ کی حد تک پہنچ سکتی ہے۔ مثلاً کسی کی آنکھوں کو دیکھ کر یہ حکم لگانا کہ یہ شرابی ہے، حالانکہ آنکھوں کی سرخی یا پپوٹوں کا بھاری ہونا کسی بیماری کے سبب ہو سکتا ہے یا کسی شخص کو کسی خاتون کے ساتھ دیکھ کر ان پر غلط کاری کا الزام لگا دینا۔ اسی طرح تجسس کی بنیاد بھی بدگمانی ہو سکتی ہے۔ بدظنی کی بنا پر دوسرے کے معاملات کا کھوج لگانا شرعاً اور اخلاقاً معیوب ہے اور شریعتِ محمدی کی بہت ہی دفعات کی اساس اخلاق ہے۔ تجسس

۵۔ مسلم: ج ۱، ص ۷۹، رقم ۵۵

کی بنیاد پر آدمی بہت سے غیر اخلاقی کام کرتا ہے۔ دوسروں کی باتیں سننے کی کوشش، کہیں جا کر گھر میں جھانکنے کی کوشش، دوسروں کے خط، پرائیویٹ کاغذات یا ڈائری پڑھنا، اسلام آدمی کی ذاتی زندگی اور Privacy کا جس حد درجہ احترام کیا گیا ہے اس کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ جو مسلمانوں کی کمزوریاں ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کو فاش کر کے اور اسے رسوا کر کے رہے گا۔ ایک دوسرے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کے راوی ہیں۔

لا یستر عبد عبداً فی الدنیا الا سترہُ اللہ یوم القیامة (۶)

کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو کسی (دوسرے) بندۂ خدا کی عیب پوشی اس دنیا میں کرے مگر یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کی عیب پوشی نہ فرمائے۔

اسلامی معاشرے کا اخلاقی مزاج ایسا ہے کہ اپنے گناہوں کا اعلان کرنے والے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعید فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے معاف نہیں فرمائے گا۔ یہ کیسی نادانی ہے کہ جس عیب اور گناہ کی پردہ پوشی ربِ جلیل نے فرمائی انسان خود اسے فاش اور مشتہر کرے۔ یہ اسلامی معاشرے میں فحش کی اشاعت کا ایک ذریعہ ہے۔

گمان اور تجسس کے بعد غیبت کا ذکر کیا گیا ہے جو شدید اور کبیرہ گناہ ہے۔ غیبت کی مثال مردہ بھائی کے گوشت کھانے سے دی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زبان کے گناہ انسان کو ہلکے معلوم ہوتے ہیں حالانکہ حفظ لسان کے ذریعے آدمی بہت سے گناہوں سے بچ سکتا ہے۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان، فحش گوئی، افواہ طرازی، مبالغہ، سچ اور جھوٹ کو ملانا۔ جھوٹے وعدے کرنا جو ہمارے سیاسی لیڈروں اور جماعتوں کا مشغلہ ہے۔ ہم نے گناہ کو بس شراب نوشی، زنا اور لحمِ خنزیر تک محدود کر دیا ہے۔ یہ سہل پسندی، عاقبت سے بے خوفی، دین سے دوری کی علامت ہے۔ حفظِ لسان اور حفظِ عصمت کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے اور اس کے نتیجے میں آپ نے جنت کی ضمانت دی ہے۔ حضرت سہل بن

۶۔ مسلم: ج ۴، ص ۱۸۲، رقم ۲۵۹۰

سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

من یضمن لی ما بین لحیه و ما بین رجلیه اضمن له الجنة (۷)

جو مجھے اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کی ضمانت دے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

غیبت دراصل آدمی کی غیر موجودگی میں اس کی عزت پر حملہ ہے اور ظاہر ہے کہ جو موجود نہ ہو وہ اپنی مدافعت نہیں کر سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کو مومن کا آئینہ قرار دیا ہے۔ اس تمثیل میں غیبت کی ممانعت کس حسن سے آگئی ہے۔ غیبت کرنے والوں کو اس قبیح فعل سے روکا جائے تو وہ بالعموم یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم یہ بات اس کی موجودگی میں کہہ سکتے ہیں یا یہ کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ ہے۔ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے تمام عذروں کی پیش بندی کرتے ہوئے اس معاملے کو بہت صاف اور واضح کر دیا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

کیا تمہیں معلوم ہے کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہ نے جواب دیا کہ اللہ ورسولہ اعلم۔ اس کا مکمل علم تو اللہ کو اور اس کے رسول کو ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے بھائی (کسی مسلمان) کی ایسی بات کا ذکر جو اسے ناگوار ہو۔ کسی نے عرض کیا کہ اگر وہ بات میرے بھائی میں موجود ہو وہ بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات اس میں موجود ہے وہ کہو گے تو یہ غیبت ہے اور جو اس میں موجود نہیں وہ کہو گے تو یہ بہتان ہے۔ (۸)

غیبت اور بیہودہ (لغو) باتیں کہنا اور کرنا ہی گناہ نہیں بلکہ معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان کے سننے کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ

۷۔ بخاری: کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان

۸۔ نووی/ ریاض الصالحین: کتاب امور المنہی، باب تحریم الغیبۃ

اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ O (۹)

اور وہ جب کوئی لغو اور بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے تم پر سلامتی ہو، ہم جاہلوں سے الجھنا نہیں چاہتے۔

لغو کی قرآنی اصطلاح بہت وسیع ہے اس میں کفار کے استہزا اور مسلمانوں کے ساتھ تمسخر سے لے کر غیبت، بہتان اور فضول باتیں اور فضول کام سب ہی شامل ہیں اور سلام علیکم، کنارہ کشی کا اعلان ہے، نہ کہ لغو بات کہنے پر سلامتی کا اظہار۔ یہ اعلان ہے کہ ہمارا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ۔

اگر کسی کی غیبت کی جا رہی ہو اور کوئی شخص اپنے اس بھائی کی عزت کی مدافعت کرے اور اس غیبت کی تکذیب کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ ترمذی میں حضرت ابو دردا رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من رد عن عرض اخیه المسلم کان حقا علی الله عزوجل ان یرد عنه نار جهنم یوم القیامة (۱۰)

جو اپنے مسلمان بھائی کی حمایت کرتے ہوئے اس کی غیبت کو رد کر دے تو اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہے کہ قیامت کے دن اسے جہنم کی آگ سے دور رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا معاشرہ قائم فرمایا جس کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کی خیر خواہی اور محبت تھی اور ہونٹوں پر دعائیں اور عزت کے کلمے، جہاں ہر شخص کی عزت اور آبرو محفوظ تھی، جہاں ایک بھائی دوسرے بھائی کی آبرو کا محافظ تھا، جہاں کی فضاؤں میں نیکیوں کی خوشبو مہکتی تھی اور سعادتوں کے اجالوں سے ہر طرف روشنی ہی روشنی تھی اور اس معاشرے کے افراد کی طرح وہ معاشرہ بھی ہمارے لئے ایک مثالیے کا

۹۔ القصص: ۵۵

۱۰۔ احمد: ج ۷، ص ۲۰۲، رقم ۲۶۹۸۸

درجہ رکھتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات کی بنیادی صفت اس کی عملیت اور انسانوں کے لئے افادیت ہے۔ مخصوص حالات میں غیبت کی اجازت ہے اگر مقصود لوگوں کی بہبود اور کوئی بڑی نیکی ہو۔ مظلوم کو ظالم کی غیبت کا حق حاصل ہے تا کہ لوگوں کو اس ظلم کا علم ہو سکے اور وہ اس کو دور کرا سکیں، لیکن مظلوم جو کچھ بیان کرے اس میں جھوٹ اور مبالغہ نہ ہو اور بدکلامی کا شائبہ تک نہ ہو، اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں کسی فریق کو دھوکے اور ممکنہ برائیوں اور نقصانات سے بچانے کے لئے ایسی حقیقت اس کے سامنے پیش کی جائے جو دوسرے فریق کے بارے میں ہو، تو یہ بھی جائز ہے۔

تجسس، برے ناموں سے کسی کو پکارنا اور غیبت، یہ سب باتیں اور گناہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی اثرات اور مضرات رکھتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح کسی ایک گھر سے نکلنے والی شدید بدبو آس پاس کی فضا کو متاثر کرتی ہے یا کسی جلتی ہوئی عمارت کا دھواں ماحول پر چھا جاتا ہے اور سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے، مگر کسی معاشرے میں دو گروہوں کا ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو جانا، پورے معاشرے کے لئے سنگین خطرہ بن جاتا ہے اور سب کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس جھگڑے اور فساد کے ذمہ دار دونوں گروہ ہوں۔ کوئی نسلی تعصب یا ایک دوسرے پر برتری اور غلبے کی خواہش اس کا سبب ہو ایسی صورت میں دونوں گروہوں سے بیزاری اور برأت معاشرے کے دوسرے عناصر پر لازم ہے۔ ان میں سے کسی فریق کا ساتھ نہ دیا جائے اور اگر ممکن ہو تو دونوں کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تا کہ معاشرے میں امن اور صلح وصفائی کی فضا پھر سے قائم ہو سکے، لیکن اگر اس فتنے اور فساد کا ذمہ دار ایک گروہ ہے تو معاشرے کے غیر جانبدار عناصر کو زیادتی کرنے والے گروہ کو سمجھانا چاہئے اور اگر وہ نہ مانے اور فساد پر آمادہ رہے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ

۱۱۔ الحجرات: ۹، ۱۰

يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ O اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ O (۱۱)

اور اگر مومنوں کے دو گروہ باہمی قتل وقتال کریں تو ان کے درمیان صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر اگر وہ (اللہ کے حکم کی طرف) لوٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو۔ اور انصاف کرو، بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے ساتھ تعلقات ٹھیک رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

مومنوں کے درمیان لڑائی کوئی اچنبے کی بات نہیں مگر یہ باہمی جنگ معاشرے کا مستقل حصہ نہیں۔ کبھی تو کسی مسئلے پر اچانک جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور اکثر منافق اور دشمن ایسے حالات پیدا کرتے ہیں۔ ایک غزوے کے موقع پر منافقوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ مہاجرین اور انصار میں باہمی لڑائی کے امکانات حقیقت بننے سے قریب ہو گئے تھے، لیکن اللہ اور رسول کے فرمودات کے مطابق اکثر غیر جانب دار مسلمان ایسے گروہوں میں صلح کرا دیتے ہیں۔ یہ اسلامی اخلاق کا جز ہے کہ مسلمانوں کی غالب غیر جانب دار اکثریت ایسے حالات میں تماشائی بن کر نہیں رہ سکتی، اور وہ دونوں گروہوں کو اللہ اور رسول کی طرف بلاتی ہے اور اسلام تو صلح کا دین ہے۔ اسلام کا مقصود مرکز بیت اللہ ہے اور اس کے بارے میں ارشاد ہے کہ جو اس میں داخل ہوا امن پا گیا۔

صلح جوئی میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا لازم ہے اور ظالم ومظلوم میں امتیاز ضروری ہے اگر ظالم گروہ ظلم وزیادتی اور فساد کو نہ روکے تو دوسرے مسلمانوں کو اس سے جنگ کرنا دینی فریضہ ہے اور جنگ اس وقت تک کی جائے کہ ظالم ظلم سے باز آ جائے۔ ایسی جنگ کا مقصد باغیوں کو فساد سے روکنا ہو گا نہ کہ ان سے انتقام لینا۔ کوشش یہی کی جائے گی کہ باغی اللہ

کے حکم کی طرف لوٹ آئیں اور ایک دوسرے کے بھائی بن کر رہیں۔ بھائی تو ایک دوسرے کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اور خیر خواہی کے مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ ایک مسلمان کے ہاتھوں دوسرے مسلمان کی جان آبرو اور مال محفوظ رہے گا۔ اس مفہوم کی احادیث بہت زیادہ ہیں کیونکہ اس اخوت کے بغیر اسلامی معاشرہ نہ وجود میں آسکتا ہے نہ قائم رہ سکتا ہے۔

صلح، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور اخلاقی نظام میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ازدواجی تعلقات میں صلح سے لے کر مسلمانوں کے درمیان صلح اور دوسری قوموں کے ساتھ خوشگوار تعلقات صلح کے بغیر کوئی انسانی سماج اپنے مقاصد پورے نہیں کر سکتا اور نہ ایسا ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ انسان خوشی کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور ان کی توانائیاں، زندگی کو حسین اور خوش گوار بنا سکیں۔

اسی صلح کے حصول اور قیام کے لئے ظن، تجسس اور غیبت کو جرم (گناہ) انفرادی سطح پر قرار دیا گیا ہے۔ یہی گناہ پھیلتے پھیلتے اجتماعی سطح پر فساد اور باہمی جنگ کا سبب بنتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی کی روشنی میں اس حقیقت کو انسانوں پر اپنے عمل اور اخلاق سے واضح کر دیا کہ اخوت کے بغیر انسان رشتۂ اخوت میں منسلک نہیں ہو سکتے۔ یہ اخلاقی معائب اور سماجی جرم و گناہ انسانوں کو تقسیم کرتے رہیں گے۔ آج بھی انسانیت قومیت کے قید خانے میں اسیر ہو کر انسانی وحدت کے تصور کی نفی رکھتی ہے۔ ان اخلاقی مصائب کے نقصان اور صلح کی بنیادوں کے ذکر کے بعد قرآن حکیم نے مسلمانوں کو نہیں بلکہ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے وحدت اور اتحاد کا پیغام دیا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساری انسانیت کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے۔ وہ رحمۃ اللعالمین ہیں۔ انسانیت کے سارے دکھوں کے چارہ ساز۔ انسان کو قوموں اور برادریوں کی تنگنائے سے آزاد کرا کر ایک وحدت میں ڈھالنے والے۔ مگر وحدت کسی اساس کے بغیر وجود میں کیسے آسکتی تھی؟ اس انسانی وحدت کی اساس توحید ہے۔ خالق کی توحید مخلوق کو ایک وحدت بناتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ
قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ

خَبِيْرٌ ۝ (۱۲)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور یوں تمہارے قبیلے اور برادریاں بنائیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ باعزت اور برگزیدہ وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی (خداترس اور پرہیزگار) ہے یقیناً اللہ ہی علیم وخبیر ہے (سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز کی خبر رکھنے والا)

یہ مختصر سی آیت وحدتِ آدم کا منشور اور اس کا نسخہ ہے۔ اور اس وحدت کے عناصر کا بیان ہے۔ انسان کی تخلیق اس کی وحدت کی بنیاد ہے۔ یہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ ان کی پیدائش میں کوئی تفاوت نہیں کہ کوئی اونچا اور کوئی نیچا۔ یوں نسل پرستی اور پیدائشی برتری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ انسان کی تعداد اور خطوں کی توسیع کے ساتھ رنگ اور زبان کے وہ اختلافات پیدا ہو گئے جو کتنی ہی جنگوں اور انسان کی تفریق کا سبب بنے۔ ان اختلافات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں قرار دیا اور قبائل کو تعارف کا ذریعہ نہ کہ امتیاز وتفوق کا وسیلہ۔ انسانی تاریخ اس بات کی شہادت ہے کہ ان حقائق سے منہ موڑ کر انسان نے دکھوں، برادر کشی، جنگوں کو جنم دیا اور آج دنیا کئی آتش فشانوں کے دہانے پر کھڑی ہے۔ کیا ان آتش فشانوں کی نشان دہی ضروری ہے؟ امریکی استبداد، اسرائیلی جارحیت اور بھارتی سامراج ان میں سے چند ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق سے امن اور اخلاق کا جو گلستان انسان کے لئے کھلایا تھا انسان اسے خود ہی ویران بنا رہا ہے۔ کیونکہ اقوام عالم کو اپنی زندگی کے لئے اسوۂ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا ہی پڑے گا۔ عام الوفود کے بعد حجۃ الوداع نے آفاقی اندازِ فکر، طرزِ حیات اور اخلاق کے تمام پہلوؤں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اوراقِ کائنات اور مقدرِ انسانی پر ثبت کر دیا۔ واقعات کی یہ ترتیب بھی کیسی معانی آفریں ہے۔

۱۲۔ الحجرات: ۱۳

خطبہ حجۃ الوداع، آفاقی منشور اخلاق وحیاتِ انسانی

عالم گیر اور آفاقی نظامِ حیات واخلاق کی تکمیل

اس کے اعلان کے لئے ابدی، آفاقی پلیٹ فارم حجۃ الوداع

اپنی نبوت کے ابتدائی بارہ برسوں میں رسولِ آخریں، داعی الی اللہ ابداً ابداً، سراجِ منیر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس جماعت کی تشکیل فرمائی جس کے استقامت شجاعت اور زہد واتقا کی مثال اس زمین اور اس زمین پر پھیلے ہوئے آسمان کے ثابت وسیار اور نور پیکر قدسیانِ فلک مقام نے اپنے لاکھوں برسوں کے مشاہدے میں نہیں دیکھی تھی۔ پھر ہجرت کے بعد آپ نے اپنے دس سال سے کچھ زیادہ قیام مدینہ میں اپنے اخلاق کی بنا پر ایک معاشرہ مرتب فرمایا۔ ایک ایسی ریاست قائم کی جس کی اساس معاہدۂ عمرانی پر تھی اور جس کے عناصر ترکیبی میں امن، امن کے قیام اور بقا کے لئے ناگزیر جنگیں، انسانی زندگی کے ہر تقاضے سے عہدہ برآ ہونے والا اخلاقی نظام، مساوات، ہمہ جہتی عدل، ہر نوعیت کی غلامی کا خاتمہ زیادہ نمایاں تھے۔ فتح مکہ شرک کی جگہ توحید کے اقتدار اور زمین گیری کا اعلان تھی۔ یوں کارِ نبوتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل ہر ذہن اور آنکھ پر روشن ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق کی تکمیل فرمائی، معاملاتِ انفرادی واجتماعی کے ہر گوشے کو روشن کیا، عبادات کا باب تکمیل کے قریب قریب پہنچ گیا اور آپ کے شب وروز کی تقلید عبادت کے ہر مفہوم کو آشکار کرنے لگی، مگر ابھی اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ایسا تھا جو انسانوں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور

نظام کا سب سے ہمہ گیر اور آفاقِ گیر مشہود ادارہ بننے والا تھا۔

حج ۹ ھ میں فرض ہوا۔ عبادات میں نماز شروع ہی سے مسلمانوں پر فرض رہی۔ یہ عبادت اسلام میں مسلمان کی اولین شناخت کا درجہ رکھتی ہے اور اسلامی نظامِ اخلاق وحیات کا اشاریہ ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ نماز کی جماعت انسان کی مساوات کو مجسم کرتی ہے۔ اور ہر آنکھ دیکھتی ہے کہ جماعت صلوٰۃ میں آقا اور غلام، عرب اور عجم سب ہم رتبہ ہوتے ہیں بلکہ امامت کے لئے تقویٰ، کردار، علم اور اخلاق ہی معیار ٹھہرتے ہیں اور حج اس مساوات کا عالمی مظاہرہ ہے۔ یہاں تو لباس کی یکسانیت اس مساوات کو اور بھی مشہود بنا دیتی ہے۔ کالے گورے پیلے انسان ایک دوسرے کے ہم صف نظر آتے ہیں۔ جماعت اور نماز کی شرائط میں یہ شرط بہت اہم ہے کہ سارے مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوں اور صف میں کوئی رخنہ نہ ہو، یہ محض تنظیم کی بات نہیں بلکہ مساوات کی تکمیل کی نفسیاتی کیفیت اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ اسلام کے نظامِ اخلاق کو یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو برتر سمجھتے ہوئے دوسرے سے ''ذرا'' دور رہنے کی کوشش کرے۔

یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ انسانی مساوات اور حقوق کے منشور کی بنیادی صورت قانونی اور آئینی ہے، جبکہ اسلام میں مساوات کی بنیاد اخلاقی ہے۔ مساوات کا تصور جو ایک اخلاقی وصف بن کر آدمی کے رگ وپے میں سرایت کر جائے اور اس کی ''تکمیل'' اور ذات کا حصہ بن جائے۔

۹ ہجری تک اسلام غالب نظام بن گیا تھا اور وہ وقت آگیا تھا کہ اس نظام کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والی اور مزاحم قوتوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ کبھی کفر کی طاقتوں نے مسلمانوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی ہجرت حبشہ اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی ہجرتِ مدینہ۔ اب کفر پسپا ہونے کے بعد بھی سازشوں سے مکمل طور پر باز نہیں آیا تھا اور اسلامی نظام کے غلبے کے لئے ضروری تھا کہ دارالاسلام اس کی سازشوں سے محفوظ و مامون بنا دیا جائے، لیکن اسلام کا اخلاقی مزاج اس کا متقاضی تھا کہ جن مشرکوں سے امن کا معاہدہ تھا اس سے امان کی برأت ختم کرنے سے پہلے

انہیں اطلاع دی جائے اور اس سے بھی بڑھ کر انہیں وقت اور موقع دیا جائے کہ وہ اپنے لئے جائے پناہ اور محفوظ ٹھکانا تلاش کر لیں۔ ۹ھ میں جب مسلمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امامت میں فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے روانہ ہو گئے تو سورۃ برات (جسے سورۃ توبہ بھی کہتے ہیں) نازل ہوئی اور یہ رب العزت جل جلالہ کی طرف سے معاہدات کے ختم کرنے کا اعلان تھا، لیکن مسلمانوں کو اس سلسلے میں اخلاقِ کریمانہ کا درس دیا گیا۔ مشرکوں کو چار مہینے کی فیاضانہ مہلت دی گئی۔ انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ چاہیں تو وہ اسلام قبول کر کے اسلامی ریاست کے شہری رہیں اور بصورت دیگر وہ اسلامی مملکت سے نکل کر نئے ٹھکانے آباد کریں۔ اس فیصلے کی حکمت سمجھنے کے لئے بار ہا مشرکوں کی عہد شکنی کو سامنے رکھنا ضروری ہے ورنہ عام حالات میں ذمیوں کے حقوق مسلم ہیں اور وہ بھی اسلام کی اخلاقی فیاضی کا ثبوت ہیں۔ چار مہینے کی مہلت اور اس کے بعد تمام معاہدوں کی منسوخی کا ربانی اعلان حج کے موقع پر سنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا اور یوں حضرت ابوبکر صدیقؓ کی امارت وقیادت میں ادا کئے جانے والے حج کے موقع پر اعلان برأت سنایا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے مختلف پہلو اس سلسلے میں نظر کے سامنے آتے ہیں۔ حج کو انسانی مساوات و آزادی کا سب سے بڑا ادارہ بننا تھا، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حج سے پہلے تمام رکاوٹیں راستے سے ہٹا دی گئیں۔

تمام معاہدوں کے ختم کرنے کا یہ اعلان بہت منصفانہ تھا۔ فریقِ ثانی کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ O فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ O وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ O اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ

يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ O (۱)

اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے بیزاری (اور لاتعلقی کا صاف اعلان) ہے ان مشرکوں کے بارے میں جن سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا۔ پس (اے مشرکو) تم ملک میں چار مہینے تک تو گھوم پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اللہ اور رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن لوگوں کے لئے اعلان ہے کہ اللہ مشرکوں سے بے زار ہے اور اس کا رسول بھی۔ اگر تم (اب بھی) توبہ کر لو گے تمہارے لئے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور اسے ہرا نہیں سکتے اور (اے رسول!) کافروں کو عذاب الیم کی وعید پہنچا دیجئے بجز ان مشرکوں کے جن سے تمہارا معاہدہ ہو چکا ہے اور انہوں نے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے اور تمہارے خلاف کسی کی مدد نہیں کی تو تم بھی ان کے ساتھ معاہدے کی مدت پوری کرو۔ اللہ تعالیٰ متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔

یہ اعلان ان مشرکوں سے برأت کا اعلان تھا جن سے متعین مدت کا معاہدہ نہیں تھا یا جن سے متعین مدت کا معاہدہ تھا لیکن انہوں نے عہد کی پاسداری نہیں کی۔ چار مہینے کی مہلت اس لئے دی گئی کہ مشرک اپنے بارے میں فیصلہ کر لیں۔ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو اسلامی برادری اور ریاست کا خود بخود حصہ بن جائیں گے۔ بصورتِ دیگر وہ ارضِ حرم سے نکل جانے کا فیصلہ کریں گے۔ اس اعلان برأت سے ان مشرکوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا جن سے زیادہ مدت کا معاہدہ تھا اور انہوں نے اپنے معاہدے کا احترام کیا تھا۔ ان کے لئے حکم ہوا کہ فاتموا الیھم عھدھم الیٰ مدتھم۔ اس حکم سے عہد و پیمان کی حرمت اور اہمیت سامنے آتی ہے اور

۱۔ التوبہ: ۱تا۴

مسلمانوں پر ہر صورت میں عہد و پیمان کے احترام کو فرض قرار دیا گیا۔

مشرکین سے اعلانِ برأت کر دیا گیا، جزیرہ نمائے عرب توحید نگر بن گیا۔ اسلامی قوانین افراد کی زندگی کو اسلام اور اسلامی اخلاق و طرزِ حیات میں ڈھالنے لگے اور معاشرے میں اجتماعی زندگی کی صورت گری کرنے لگے، دل و نظر مسلمان بن گئے۔

یوں اللہ کی زمین اللہ کے نور سے جگمگانے لگی اور دیکھنے والی آنکھوں اور سوچنے والے ذہنوں پر یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان فرائض نبوت کو پایانِ کار تک پہنچا دیا جن کے لئے آپ مبعوث ہوئے تھے اور وہ منزل آگئی کہ رب العزت اس تکمیل کی سند عطا فرما دے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کے لیے، تاکہ انسان جان لے کہ وہ اس مرحلے تک آگیا ہے جہاں اللہ کی قائم کردہ حدود کے اندر رہ کر اسے اپنے معاملات کو طے کرنا اور زندگی کے خاکے میں رنگ بھرنے کا اختیار عطا کر دیا گیا ہے۔ دین کی تکمیل کے اعلان کے لئے کائنات کو ایک عالم گیر ادارہ اور اسٹیج حج کی صورت میں عطا کر دیا گیا۔

اشارہ رب پا کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں اپنے حج کا اعلان فرمایا اور سارے عرب کے لوگوں تک یہ اعلان پہنچ گیا۔ حج کے علاوہ تمام عبادات کے طریقے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے مسلمانوں پر روشن ہو گئے تھے لیکن مناسک حج کی تربیت ابھی باقی تھی۔ حج جو تمام عبادات کا جامع ہے۔ حج بدنی عبادت بھی ہے اور مالی عبادت بھی اور جہاد کے مفہوم کو اپنے وسیع ترین مفہوم میں پیش کرنے والی عبادت بھی۔

اعلانِ حج سن کر اہل ایمان مدینہ منورہ میں جمع ہونے لگے۔ ہر راستہ مدینے کا راستہ بن گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفرِ حج میں شریک ہونے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے بڑھ گئی۔ اس وقت مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور جزیرہ نمائے عرب کی آبادی کو دیکھتے ہوئے یہ بہت بڑی تعداد تھی۔ کاروانِ حج کے شرکا کی تعداد کی روایتوں میں تھوڑا بہت اختلاف ہے۔ بعض راویوں کے مطابق ایک لاکھ چوبیس ہزار اہل ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کے لئے جمع ہو گئے۔

دوسری روایات کے مطابق یہ تعداد ایک لاکھ چوالیس ہزار تھی۔ جس مسلمان کے لئے زادِ راہ اور سواری کا انتظام ممکن ہو سکا وہ اس قافلۂ سعادت میں شریک ہونے کے لئے مدینہ منورہ پہنچ گیا۔ تمام ازواجِ مطہرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں حج کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ اس سفرِ تقویٰ کی اساس میں اخلاقِ حسنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھا اور اخلاقِ نبوی کے ہر مرحلے اور ہر شعبے میں ہمیں بے مثال عدل نظر آتا ہے۔

حجۃ الرسول کا سفر ۲۵ ذی القعدہ ۱۰ھ مطابق ۲۲ فروری ۶۳۲ء کو شروع ہوا۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔ اس کاروانِ فلاح نے ذی الحلیفہ پہنچ کر ایک شب کے لئے قیام کیا (اس مقام کو بئر علی بھی کہتے ہیں)۔ اگلے دن راہِ حق کے ان مسافروں نے احرام باندھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے لبیک اللھم لبیک کا زمزمہ بلند ہو کر فضاؤں میں لہریں بناتا ہوا قیامت تک کے لئے اہلِ ایمان کی زندگیوں کا منشور بن گیا۔ تمام صحابۂ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم نوائی کر رہے تھے۔ ہم حاضر ہیں۔ اے ہمارے رب ہم حاضر ہیں۔ کوئی تیرا شریک نہیں ہے۔ ہر تعریف تیرے لئے ہے، ہر نعمت تجھی سے ہے اور یہ زمین اور ہر ملک تیرے لئے ہے۔ اقتدار اور سلطنت تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ یہ کلمات ہی مسلمان کی زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ زندگی کے ہر لمحے میں وہ اللہ کے ہر فرمان پر لبیک کہنے کے لئے اپنے آپ کو تیار رکھتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار اور حکومت میں کسی کی شرکت کا تصور نہیں کر سکتا، بلکہ ہر ”شریک“ بننے کے دعویٰ داروں کی جھوٹی کبریائی کو خاک میں ملا دینا ہی اس کی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد ہوتا ہے۔

اہل ایمان کا قافلہ بڑی تنظیم کے ساتھ بلدِ امین کی طرف روانہ ہوا۔ ترتیب میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ قافلے کا ہر حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنا ممکن ہو قریب رہے اور اکابر صحابہ اس پھیلے ہوئے وسیع قافلے کے مختلف حصوں میں نئے مسلمانوں کے ساتھ ہوں تاکہ وہ ان لوگوں تک ہادیٔ برحق کی احادیث اور عبادات کے طریقے پہنچاتے رہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام ۴ ذی الحجہ کو مکۂ معظمہ میں داخل ہوئے۔ ۲۵ ذی القعدہ سے تربیت اور تعلیم کا سلسلہ مسلسل جاری رکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کچھ ارشاد

فرماتے صحابہ کرام سانس روک کر آپ کی بات سنتے۔ کچھ تو صحابہ کی توجہ اور کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر عنایت رب اور اس کا معجزہ کہ آپ کی آواز ہزاروں احرام پوشوں تک پہنچ جاتی اور اسی کے ساتھ ساتھ قریب سے آپ کے ارشادات سننے والے قافلے میں پھیل کر سب تک آپ کے ارشادات پہنچا دیتے تھے۔ علم کی اشاعت کے سلسلے میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور فرمان کی تعمیل تھی۔ صحابۂ کرام اپنے صاحب کی باتوں کو دہرانا، انہیں یاد رکھنا عبادت جانتے تھے اور اپنے رہبر وہادی کی ذات سے ان کے تعلق کا یہ عالم کہ آپ کے ارشادات بیان کرتے ہوئے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارات، جنبش لب وچشم کی تقلید بھی کرتے اگر کوئی بات بیان کرتے ہوئے آپ نے اپنا ہاتھ بلند کیا یا انگلی سے کوئی اشارہ کیا تو وہ حدیث کو بیان کرتے ہوئے آپ کی جنبش اور اشارے کو بھی دہراتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمان کے تعلق کا یہ عالم کہ آج تک محدث ان باتوں کو روایت کا حصہ سمجھتے ہیں اور یوں آپ کی ادائیں بھی ان تمام صدیوں میں باقی رہی ہیں اور یوں اللہ کے رسول کے اخلاق کے یہ پہلو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں زندہ رہے ہیں اور زندہ رہیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چاشت کے وقت مسجد الحرام میں تشریف لے گئے۔ جب آپ کی نظر بیت اللہ پر پڑی تو آپ نے وہ دعا پڑھی جو آج بھی ہر زائر خانہ کعبہ کو دیکھ کر پڑھتا ہے۔

اللّٰھم زد ھذا البیت تشریفاً وتعظیما وتکریما ومھابة

اے اللہ اس گھر (کعبۃ اللہ) کے شرف، تکریم وتعظیم اور دبدبے میں اور اضافہ فرما۔

کعبہ امن وسلامتی کا نشان اور اشارہ ہے۔ یہ گھر اللہ کی کبریائی کا مشہور اعلان ہے۔ سول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ بلند کر کے اللہ کی کبریائی کا اعلان فرمایا۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ ہ کی کبریائی انسانوں کی سلامتی کی ضمانت ہے اور انسان کے لئے امن کی نوید ہے۔ آپ نے کعبے کے سامنے اپنے رب کے عطا کردہ امن اور سلامتی کا ذکر فرمایا کہ اللہ ہی سلام ہے، صاحب امن اور وہی اپنے گھر کو امن وسلامتی کے نشان کے طور پر باقی رکھے گا اور ہمیں وہی

ایمان کے ساتھ زندگی کی دولت عطا فرماتا ہے۔

خانہ کعبہ کا طواف بندگی کا طواف ہے۔ آج ہم طواف کے ہر چکر میں مخصوص دعائیں ادا کرتے ہیں۔ ان دعاؤں کے الفاظ ہماری ہر تمنا اور ہر خواہش کا اظہار ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف بندگی کو کچھ دعاؤں کے ساتھ مخصوص اور محدود نہیں کیا بلکہ آپ نے دین اور دنیا کے خیر اور بھلائی اور عذابِ دوزخ اور جہنم کی آگ سے نجات کو دعائے مسلم بنا دیا۔ وہ دعا جو رب العزت نے ہمیں عطا کی ہے۔ اور آج بھی رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان ہم اسی دعا کے ذریعہ اپنے رب سے ہم کلام ہوتے ہیں۔

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۲)

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں خیر عطا فرما، اور آخرت میں بھی خیر عطا فرما۔ اور ہمیں آگ کے عذاب (دوزخ) سے بچالے۔

طواف کے بعد اہلِ ایمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں قیام کیا، پھر عہدِ جاہلیت کی رسم کو توڑتے ہوئے مزدلفہ میں قیام کرنے کی جگہ آپ عرفات تشریف لے گئے اور عرفات کا قیام ووقوف ہی حج ٹھہرا۔ عرفات ہی میں آپ نے خطبۂ حجۃ الوداع فرمایا۔ وہ خطبہ جو منشور انسانیت ٹھہرا۔ یوم عرفات، یوم النحر اور اس کے بعد کے دنوں میں صحابۂ کرام آپ سے مناسک حج کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ایک لاکھ انسانوں سے زیادہ کا مجمع اور ابلاغ ترسیلِ احکام کے راستے میں رکاوٹیں۔ کچھ لوگوں نے بال پہلے منڈوا لئے اور قربانی بعد میں دی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ''کوئی حرج نہیں''، لیکن مناسک کی ترتیب حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متعین ہوگئی۔ حجۃ الوداع عبادات، مناسک، تربیت اور تعلیم کا نہایت ہی جامع وعملی نصاب تھا۔ اب قیامت تک مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق حج کا اتباع کرتے رہیں گے۔ وہی عمل معتبر ہے جس پر داعی الی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مہر ثبت ہو۔

۲۔ البقرۃ: ۲۰۱

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں بھی خطبہ دیا، لیکن خطبۂ حجۃ الوداع سے مراد آپ کا خطبۂ عرفات ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر تمام خطبوں میں بعض نکات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دہرایا ہے خاص طور پر اس بات کو شاید یہ مستقبل میں آپ اہل ایمان کے کسی اجتماع میں ان کے ساتھ نہ ہوں۔ حجۃ الوداع کے خطبہ عرفات کے متن کو بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ یک جا کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اور اس ساری روائداد کو مکمل متن کے ساتھ ڈاکٹر نثار احمد نے اپنی کتاب خطبۂ حجۃ الوداع میں پیش کر دیا ہے۔ (۳)

خطبۂ حجۃ الوداع اہل ایمان ہی سے نہیں بلکہ سارے انسانوں سے عالم انسانیت کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطاب ہے۔ اس میں اپنے جلد ہی رخصت ہونے کے اشاروں سے اس کی حیثیت کا تعین ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنے مشن کی تکمیل کے بعد انسانوں کو ان اہم باتوں کی وصیت فرمائی جو انسانیت کی وحدت، تکریم اور امن و سلامتی کی بنیاد ہیں۔

خطبۂ حجۃ الوداع انسانی حقوق کا منشور ہی نہیں ہے بلکہ انسانوں سے ایسا خطاب ہے جو انہیں اپنے مقصدِ تخلیق اور اخلاقی وجود کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ محض قانونی دستاویز نہیں ہے بلکہ وحدتِ آدم کے دیباچے کے بعد یہ خطبہ انسانی ذات، انسان کے اخلاقی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور مساواتِ انسانی کی بنیاد کو پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد انسانی معاشرے کے حوالے سے حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا ہے اور پھر عبادات، عقائد اور اللہ تعالیٰ اور انسان کے رشتے کو پیش کیا گیا ہے۔ یوں زندگی کی ہر جہت اس خطبے میں آ گئی ہے۔

انسان کے وضع کردہ منشور، چارٹر اور اعلان نفسِ انسانی (انسان کی سائیکی) اور انسانی معاشرے میں فرد کی اہمیت کے ادراک و احساس سے معریٰ ہیں۔ فرد انسانی معاشرے کی بنیادی اکائی ہے، بلکہ وہ معاشرے کی نیو اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان تو ''عالم اصغر'' کا درجہ رکھتا ہے جس میں یہ ''عالم اکبر'' موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرد کی اصلاح فرمائی، اسے اخلاقی اوصاف سے مزین فرمایا اور اس حد تک کہ وہ معاشرے کے

۳۔ ڈاکٹر نثار احمد/ خطبہ حجۃ الوداع۔ بیت الحکمت، لاہور۔ ۲۰۰۵ء۔ اس مضمون میں خطبۂ حجۃ الوداع کے تمام اقتباسات اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

ڈھانچے کا بوجھ سنبھال سکے۔ فرد اور جماعت کے رشتے کو اسلام کے علاوہ کوئی اور نظام ایسا توازن عطا نہیں کر سکا جو انسان اور انسانی معاشرے کی صحت اور سلامتی کا ضامن ہو۔ اشتراکی نظام میں افراد جماعتی جبر کا شکار ہوتے ہیں، ان کے امکانات بروئے کار نہیں آ پاتے۔ وہ جماعت کی مشنری کا پرزہ ہوتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں اور اس جماعتی جبر کو پارٹی کے اہل کار اور بڑھا دیتے ہیں اور یوں اشتراکی نظام میں جماعتی آمریت وجود میں آ جاتی ہے اور اگر اسٹالن جیسا مردِ آہن میسر ہو جائے تو اس کی شخصی آمریت جماعتی آمریت کی طاقت سے تمام حدود کو پامال کر دیتی ہے۔ جمہوری نظام میں فرد کی آزادی اور خود غرضی بے لگام ہوتی ہے اور آزادی کے نظام پر معاشی میدان میں سخت ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور گلوتراش معاشی مقابلے میں امیر امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جاتا ہے۔ جمہوریت بھی اپنی حدود کو توڑتی ہوئی عوام کی آمریت بن جاتی ہے اور عوامی رائے کا ریلا اخلاقی اقدار کو بھی بہا لے جاتا ہے اسلام میں صالح اور اخلاقی تربیت یافتہ افراد، معاشرے اور ریاست کو اخلاقی خطوط پر چلاتے ہیں۔ خود احتسابی، خوفِ خدا انہیں آمر اور جابر بننے سے روک دیتا ہے اور وہ ایک طرف تو نیکی کے راستے میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں اور دوسری طرف اجتماعی وجود کو اخلاقی اساس عطا کرتے ہیں۔ ایسے افراد ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں جو ہر فرد کے امکانات کی تکمیل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت معاشرے میں عملی طور پر جاری و ساری نظر آتی ہے۔ ہر شخص کے امکانات اپنی انتہا تک آسانی سے پہنچ جاتے ہیں۔ اقبال نے اسی اسلامی معاشرے کو اپنے اس شعر میں پیش کر دیا ہے۔

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

ایھا الناس کی تکرار خطبۂ حجۃ الوداع کو قیامت تک آنے والے انسانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب بنا دیتی ہے اور اسی کے ساتھ اس خطبے کو سننے والوں نے میدانِ عرفات میں اپنے آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راست خطاب سمجھا ہوگا۔ اس خطبے کی یہ کیفیت آج بھی باقی ہے اور کل بھی باقی رہے گی۔ اس کو ہر پڑھنے والا آج بھی ہادیٔ نوعِ بشر

کا اپنے آپ سے خطاب جانتا ہے۔ ایک ایک لفظ ہماری ذات کی گہرائیوں تک پہنچ کر ہمیں شاداب کرتا ہے۔

خطبۂ حجۃ الوداع کی تمہید یا دیباچہ (پیش گفتار) مسلمان کی زندگی کے اساسی عقیدے کا اعلان اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے سے عبارت ہے۔ اس میں اہل ایمان کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کا منبع اور سرچشمہ ہے اور اسی کی اعانت سے آدمی اپنے نفس کے شر سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یوں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کردار سازی اور اخلاقِ عالیہ کی اساس ہے۔

اسی پیش گفتار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اپنے سفرِ آخرت کے صدمے کے لئے تیار کر دیا اور اپنے اس حج کو حجۃ الوداع قرار دیا ''لوگو! حج کے مسائل بھی مجھ سے سیکھ لو۔ شاید اس کے بعد میرے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے'' اور آپ نے حجۃ الوداع کے شرکا کو ایک اصولی ہدایت فرمائی کہ میری باتوں کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔

''سمع'' کو تبلیغ، اشاعتِ دین میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ہر مسلمان کو ہمارے رسول کی ہدایت ہے کہ دین کی اگر ایک بات بھی اسے معلوم ہو تو دوسروں تک پہنچائی جائے۔

رجوع الی اللہ کی ہدایت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ صحابۂ کرام ذہنی اور نفسیاتی طور پر خطبے کے نکات کو سمجھنے اور ان کو اپنے کردار و اخلاق کا حصہ بنانے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اللہ کی توحید، وحدتِ آدم کی سمت نما ہے۔ خالق کی توحید، اس کی مخلوق باارادہ، انسان کی وحدت کی اساس ہے۔ وحدت و مساوات انسانی کی پہلی بنیاد توحید ہے، اس کے بعد دوسری بنیاد سارے انسانوں کے باپ کا ایک ہونا ہے۔ یہ سلسلہ اخوت انسان کی تخلیق کے بنیادی عنصر کے ایک اور مشترک ہونے تک پھیلا ہوا ہے اور اسی لئے رنگ اور نسل کا اختلاف وحدتِ انسانی کی نفی نہیں ہے۔ اس بنیاد پر انسانوں کو پست و بلند، اعلیٰ و ادنیٰ قرار دینا جاہلیت کی رسم اور فکر ہے اور اس حج کے موقع پر انسانیت کے ارتقا کی وہ منزل آگئی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ جاہلیت کی ہر رسم، ہر تصور میرے قدموں کے نیچے ہے۔ گزشتہ کئی صدیوں میں رنگ و نسل کی بنیادوں پر انسانوں میں تفریق کی گئی اور یہ علم اور روشنی کے بلند بانگ دعوؤں کے

باوجود جاہلیت کا ایک مظاہرہ تھا جس میں امریکہ مدتوں اسیر رہا اور بیسویں صدی تک انسانوں میں رنگ و نسل کی بنیادوں پر تفریق کی گئی۔ جنوبی افریقہ کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے اور اسرائیل کی نام نہاد ریاست کی بنیاد بھی نسل پرستی پر ہے۔ لیکن زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق ان زنجیروں کو توڑ رہا ہے اور انسان ''طوعاً و کرہاً'' بھی مساوات انسانی کی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انسانی عقل تو اب ''جمعیتِ اقوام'' کی منزل تک پہنچی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۂ حجۃ الوداع جمعیت آدم کا اعلان تھا۔

انسانی مساوات کی اخلاقی بنیاد توحید اور وحدتِ آدم ہے جس نے فرد اور جماعت کو ایک دوسرے سے پیوستہ کر دیا اور قانون کے احترام اور استقلال کے لئے لازم ہے کہ قانون کی بنیاد عقیدے اور نظریہ پر ہو اور عقیدہ اگر آفاقی ہو گا تو قانون میں بھی آفاقیت اور عالم گیریت ہو گی۔ ایسی عالم گیریت جو لازمانی ہو اور وقت و مکان پر حاوی ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

> ایھا الناس ،تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ تم آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی (اللہ سے ڈرنے والا صاحب کردار و اخلاق) ہو۔ بیشک اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، کالے کو گورے (سرخ سفید) پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت (اور فوقیت) حاصل نہیں ہے۔ باعثِ افتخار ہے تو صرف تقویٰ۔ اے اللہ کے بندو! میں تمہیں تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اللہ کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں۔

ان کلمات کے بعد آپ نے واضح طور پر انسانی تاریخ میں ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان فرمایا۔ انسانی تاریخ کا عہدِ جدید ان الفاظ سے ہوا۔

جاہلیت کی ہر چیز اور رسمیں میرے قدموں تلے ہیں۔

کل شئی من اھل الجاھلیة میں زندگی کی رسمیں، قانون، طرزِ حیات، اسلوب

فکر ہر چیز آ گئی، عزت و ذلت کے پیمانے بدل گئے اور آگے چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رسوم و اسالیب جاہلیت میں سے ان اہم باتوں کی وضاحت کر دی جو مٹا دی گئیں۔ لا کی یہ منزل نئی تعمیر کے لئے لازم تھی۔ لا کے بعد ''الا'' آپ نے ہر انتقام (قصاص) اور ہر غصب کی ہوئی ملکیت اور مال کو اور خاندانی تفاخر کو قیامت تک کے لئے اہل ایمان پر حرام قرار دیدیا۔ ایامِ جاہلیت کے سارے سود، سارے انتقام اور بدلے اور خون بہا ماضی کا قصہ بن کر رہ گئے۔ نیکیوں کا سفر جاری رہا اور تمام برائیوں سے انسانیت کو نجات مل گئی۔

نسئی کی رسم اور دستور ایام اللہ سے کھیلنے کے مترادف تھا، انہی اغراض کے لئے، اپنے مخالفوں کا خون بہانے کے لئے ایامِ جاہلیت میں عرب مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے تھے حرام مہینوں کی ترتیب بدل دیتے تھے تاکہ جنگ کو حرام مہینوں میں جائز قرار دے کر دشمنوں کا خون بہا سکیں اور اللہ کی زمین پر فساد برپا کر سکیں۔ نسئی کے دستور کو ختم کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اور اب زمانہ گھوم پھر کر اور اپنی گردشوں کے بعد اسی جگہ پر آ گیا ہے
جہاں کائنات کی تخلیق کے دن شروع ہوا تھا۔

اس قول اور خیال کی بلاغت اور گہرائی پر غور کرتے جایئے تو انسان نے کفر میں مبتلا ہو کر وقت اور اللہ کے پیدا کردہ مہینوں کو اپنی اغراض کے پھندے میں مقید کرنے کی کوششیں کی اور یہ بھول گیا کہ کائنات اللہ تعالیٰ کے تخلیق کردہ مہینوں کے مطابق اپنی تقویم مرتب کرتی رہی ہے۔ اس مرحلے پر آپ نے احرام پوش نفوس قدسیہ سے دریافت فرمایا کہ لوگو! کیا میں نے یہ بات تم پر پہنچا دی۔ لوگوں نے جواب دیا ہاں، بیشک آپ نے بات پہنچا دی۔ اس پر آپ نے اللہ جل جلالہٗ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ اللّٰھم اشھد ۔اس خطبے میں آپ نے امت سے ایک بار سے زیادہ گواہی طلب کی۔ وقت کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی اہمیت اس سے واضح ہوتی ہے کہ اس باب میں آپ نے پہلی گواہی طلب کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامعین کو

ہر قدم پر ساتھ رکھتے تھے اور اس کا ایک طریقہ سامعین سے سوال کرنا تھا۔ اس مرحلے پر آپ نے صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ لوگو! یہ کون سا مہینہ ہے۔ اور یہ کون سا دن ہے؟ اور تم کس شہر میں جمع ہو۔ صحابۂ کرام نے جواب دیا کہ یہ محترم مہینہ ہے اور یہ محترم دن (یوم الحج) ہے اور یہ محترم شہر ہے۔ اور پھر اس موقع اور حج کی اہمیت کو اپنے سامعین کے دل و دماغ کا حصہ بنانے کے بعد آپ نے فرمایا کہ تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر حرام ہے۔ یوں سرورِ کائنات نے اپنی اخلاقی تعلیم کے اس نہایت اہم پہلو کو ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حصہ بنا دیا جو امن کی ضمانت ہے۔

پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے کی جان، مال اور آبرو کی حرمت کو انفرادی اخلاق اوصاف اور ایمان کی شرطوں اور بنیادوں کے طور پر پیش فرمایا اور اس کے فوراً بعد ان نکات کو معاشرے کے بنیادی اصولوں کے طور پر پیش کیا۔ آپ نے انفرادی سطح پر جماعتِ مومنین کے ہر فرد سے کہا! میری بات سنو۔ اس سے تم زندگی پا جاؤ گے۔ اسمعوا منی تعیشوا۔ یہ تمہاری روح اور ذات کی زندگی ہے کہ! تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا، ظلم نہ کرنا، ظلم نہ کرنا، یہ بات آپ نے تین بار کہی۔ اور پھر آپ کے خطاب میں مسلم معاشرے کی تقسیم کے اجتماعی نکات بیان کئے گئے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں ''ایھا الناس'' کا تخاطب، خطبے کے مختلف حصوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ایھا الناس ، اسمعو اقولی فرما کر آپ نے معاشرے کی تعمیر اور اصلاح کی دفعات بیان کیں۔ آپ نے فرمایا: بلاشبہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ قرآن حکیم کے ارشاد کل مومنون اخوۃ کی تشریح فرماتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے محترم ہے، مسلمان کا گوشت دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیبت کی حرمت کو قرآنی اصلاح میں بیان فرمایا۔ مسلمان پر مسلمان کی عزت آبرو حرام ہے۔ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں۔ جس سے دوسرے امن میں رہیں۔

اجتماعی زندگی اور معاشرے کی اصلاح اور تعمیر کے دوسرے نکات خطبۂ حجۃ الوداع کی روشنی میں مختصراً یہ ہیں۔

۱۔ مہاجر وہ ہے جو غلطیوں اور گناہوں سے کنارہ کش ہو جائے۔

۲۔ مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت کی تکمیل کے لئے اپنے نفس کے تقاضوں کا مقابلہ کرے (اور ان کی نفی کرے)۔

۳۔ جس کے پاس امانت رکھوائی جائے وہ اس بات کا پابند ہوگا کہ وہ (امانت رکھنے والے کو) امانت واپس کردے۔

۴۔ قرض کی ادائیگی کی جائے۔

۵۔ کسی سے کوئی چیز مستعار لی جائے تو واپس کی جائے۔

۶۔ ضامن اپنی ضمانت کا ذمے دار ہوگا۔

اسلام میں جرم اور گناہ اساساً ایک ہی ہیں۔ اصطلاحاً جن گناہوں پر حد یا سزا دی جائے انہیں جرم کہا جا سکتا ہے ورنہ اسلام میں جرم اور گناہ کے اخلاقی پہلو کو ہر جگہ مقدم رکھا گیا ہے تا کہ گناہ نفس انسانی کو مجروح نہ کرے۔ قرآن حکیم میں حد اور تعزیر کے ساتھ ساتھ اللہ کی معافی اور مغفرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسلام مجرم سے نہیں بلکہ جرم سے اجتناب کا درس دیتا ہے اور جس شخص پر تعزیر یا حد جاری کی گئی وہ اپنے جرم سے پاک ہو گیا۔ آج جرم و سزا کا مروج تصور اور فلسفہ اسلامی تعلیمات کا عکس ہے اور خطبۂ حجۃ الوداع اسی تصور کو پیش کرتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے میں یہ نکتہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔

> دیکھو! ایک مجرم اپنے جرم کا آپ ہی ذمے دار ہوگا۔ جان لو! اب باپ کے جرم کے بدلے میں بیٹا نہ پکڑا جائے گا اور بیٹے کے جرم کے لئے باپ کو نہیں پکڑا جائے گا۔

خطبے کے اس مرحلے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے حقوق، معاشرے میں ان کی ذمہ داریوں اور ان کے فرائض کو شرح و بسط کے ساتھ پیش فرمایا۔ ہم یہ سطریں ۲۰۰۸ء کے ''خواتین کے عالمی دن'' کے موقع پر ۸ مارچ کو لکھ رہے ہیں۔ اس دن کے پروگراموں اور تقریروں میں خواتین کو رفاقت کا نہیں بلکہ مسابقت کا ''درس'' دیا جا رہا ہے۔ جس سے معاشرے میں سکون نہیں بلکہ فساد ہی پیدا ہوگا۔ دوسری طرف ڈنمارک کے لئے توہین

آمیز کارٹونوں کی اشاعت پر توہین رسالت کے خلاف اسلامی دنیا احتجاج کر رہی ہے اور ہمارے ذہن میں یہ خیال آ رہا ہے اور بڑی شدت سے، توہین رسالت کے عملی مجرم تو ہم مسلمان ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اسوہ حسنہ کو نظر انداز کرتے ہوئے ساری دنیا کے لئے نشانہ عبرت بن گئے ہیں۔ صرف عورتوں کے حوالے سے غور کیجئے تو ہم ''ونی''، ''قرآن سے شادی'' جیسے گناہوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ''عزت'' کے نام پر خواتین کا قتل قانونِ امروز بن چکا ہے۔ ہم نے جائیداد کی تقسیم کو روکنے کے لئے اور اپنی جاگیرداری کے تحفظ کے لئے اسلام کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔ کاش خطبہ حجۃ الوداع کے آئینے میں اپنے اعمال اور افعال کا جائزہ لیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

> عورتوں کے بارے میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اس سے ڈرتے رہو۔ اللہ کے (حکم اور) کلمات کی بنا پر وہ تمہارے لئے حلال کی گئیں (نکاح کا انحصار کلمات اللہ پر ہے)۔ خبردار! تمہیں عورتوں سے حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ (اللہ کے کلمات کی بنا پر) تمہاری پابند ہیں۔ تم اس کے لئے کسی معاملے میں حق ملکیت نہیں رکھتے۔
>
> لوگو! جس طرح عورتوں کے کچھ حقوق تمہارے ذمے ہیں، اسی طرح تمہارے کچھ حقوق ان کے ذمے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ وہ کھلی بے حیائی کا کوئی عمل نہ کریں۔ (تمہارے بستر کی حرمت کا خیال رکھیں)۔ تمہاری اجازت کے بغیر کسی کو تمہارے گھر میں داخل نہ ہونے دیں۔ اگر عورتیں ان باتوں کی خلاف ورزی کریں تو تمہیں اجازت ہے کہ انہیں بستروں پر اکیلا چھوڑ دو، اور ان پر سختی کرو مگر انہیں تکلیف دینے والی مار نہ مارو (اگر ہلکی سرزنش ضروری ہو جائے)
>
> اور عورتوں کے بھی تم پر حق ہیں۔ خوراک و لباس کے بارے میں ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، (ان کے لئے صحت بخش غذا اور مناسب و باعزت لباس تمہاری ذمہ داری ہے) عورتیں معروف باتوں میں

تمہاری نافرمانی نہ کریں۔

گھر کا سکون، معاشرے کے سکون بڑی حد تک ازدواجی زندگی اور تعلقات پر منحصر ہوتا ہے۔ افراد کی صلاحیتوں اور ان کے بروئے کار آنے کا تعلق بھی ان تعلقات کی خوش گواری سے ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ اور ان کے عملی اخلاقی برتاؤ سے عائلی زندگی کو جنت آثار بنایا جا سکتا ہے۔ گھریلو اور عائلی زندگی میں ہمارے خادم بھی شامل ہیں۔ عہد رسالت میں غلاموں اور کنیزوں کا رواج تھا جسے اسلام نے اولاً محدود کیا اور پھر غلامی کے دروازوں پر آزادی کا قفل ڈال دیا۔ کنیزوں کے حصول کا ہر ذریعہ ممنوع قرار دیا گیا، غلاموں کو اپنی آزادی خریدنے کا اختیار دیا گیا، کنیزوں کی اولاد کے حقوق متعین کیے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ حجۃ الوداع میں بھی کنیزوں کو فراموش نہیں کیا اور آپ ﷺ نے فرمایا، ''میں تمہیں ان کے بارے میں بھی حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں جو تمہارے زیرنگین ہیں۔ انہیں وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم پہنتے ہو۔'' ان زیردستوں کا احاطہ قرآنی اور اسلامی اصطلاح ماملکت ایمانھم بڑی خوبی سے کرتی ہے۔

ان قانونی، معاشرتی اور معاشی پہلوؤں اور مسائل کو بھی خطبۂ حجۃ الوداع میں پیش کرنے کے بعد خطبے کے آخر میں معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد، عبادات کو اور معاملات کو اس طور پر پیش فرمایا کہ ان سب کی اخلاقی بنیاد ہمیشہ کے لئے متعین اور واضح ہوگئی اور اہل ایمان پر قیامت تک کے لئے یہ نکتہ روشن ہوگیا کہ اسلام ایک کُل کا نام ہے جس کے سارے پہلو اور گوشے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور زندگی کا کوئی پہلو ان تعلیمات اور اصولوں سے باہر نہیں۔ اسلام بے حد انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد اجتماعی ہے۔ ایک طرف تو یہ ہماری ذاتی زندگی کی نہج کو متعین کرتا ہے اور دوسری طرف ہماری معاشرتی اور اجتماعی زندگی کے رخ کا تعین کرتا ہے اور دونوں دائروں میں تقویٰ، اللہ کی محبت اور اللہ کا خوف ہمیں اسلام کی ڈگر سے بھٹکنے نہیں دیتا۔

خطبے کے آخری حصے میں اخلاقِ اسلامیہ کے خدوخال اس طرح سامنے آتے ہیں کہ جرائم کا انسداد ایک معاشرتی مسئلے کے ساتھ ساتھ اخلاقی مسئلے کے طور پر ابھرتا ہے، کیونکہ کئی

جرائم معاشرے میں فساد پیدا کرتے ہیں۔ زنا ایسا ہی جرم اور گناہ ہے کہ افراد معاشرہ کے نسب کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ انسانی ادارے شک وشبہ کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ آج کا مغربی معاشرہ انہیں اندیشوں کے حقیقت بن جانے پر گواہی دے رہا ہے۔ DNA کا مطالبہ اور ضرورت عائلی زندگی کو داغ دار بنا رہی ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق، جرائم، عقائد اور عبادات کو یہاں یک جا فرمایا کہ زندگی کی تعمیر کا ہر رخ سامنے آگیا۔ آپ نے فرمایا

لوگو! کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ، کسی کو ناحق قتل نہ کرو، زنا نہ کرو، اور چوری نہ کرو۔

لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے (مجھ پر سلسلۂ نبوت ختم ہو رہا ہے اور تمہارے بعد کوئی امت نہیں)۔

میری اور مجھ سے پہلے کے انبیا کی افضل ترین دعا یہ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ لہٗ الملک ولہٗ الحمد، بیدہ الخیر، یحیی ویمیت و ھو علیٰ کل شئی قدیر

اپنے رب کی عبادت کرو اور (ہر دن) پانچ نمازیں ادا کرو اور رمضان کے مہینے میں روزے رکھو اور اپنے رب کے گھر کا حج کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو خوشی سے، اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو، (اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق حکم دیں) اور (ان احکام کی اطاعت کے نتیجے میں) اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔

اللہ سے ڈرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں ٹھیک ناپ تول سے دیا کرو اور زمین پر فساد نہ برپا کرو

خبردار! دین کے معاملے میں غلو اور انتہا پسندی سے بچو، تم سے پہلے کی قومیں دین میں انتہا پسندی کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

خطبۂ حجۃ الوداع کا ہر حصہ، ہر حکم اور ہر جملہ موجودہ حالات کے سیاق وسباق میں

ہمیں دعوتِ عمل دے رہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کو بھول کر ہم حالات، کردار، عمل اور واقعات کے گرداب میں پھنس گئے ہیں اور چکرا رہے ہیں۔ ناپ تول میں کمی ہماری شناخت بن گئی ہے۔ قولِ حسن اور قولِ معروف سے مسلمانوں کی بستیاں اور آبادیاں محروم ہوگئی ہیں۔ ہماری گلیاں اور کوچے، کوچہ قاتل بن گئے ہیں جس میں کسی کی جان محفوظ نہیں ہے۔ عراق اور پاکستان کے شہر، خودکش بم بازوں کے ہاتھوں میدان جنگ سے زیادہ غیر محفوظ بن گئے ہیں اور یہ سب کچھ دین کے نام پر ہو رہا ہے۔ حکمرانوں کی بداعمالیاں اور غیروں کے اشاروں پر اپنے شہروں پر فوج کشی اپنی جگہ لیکن دین، نفاذِ شریعت کے نام پر نام نہاد علما، ناسمجھ نوجوانوں سے جو کچھ کرا رہے ہیں اس کی روشنی میں خطبۂ حجۃ الوداع کا یہ ارشاد اپنے پورے معانی کے ساتھ ہم پر واضح ہوتا ہے کہ دین میں غلو (انتہا پسندی) سے بچو کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی غلو کی وجہ سے ہلاک ہوئیں۔

ایاکم و الغلو، انما ھلک کان قبلکم بالغلو فی الدین

آج کے حالات سے پہلو غلو فی الدین کا پورا مفہوم ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا مگر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان کے رب نے مستقبل کو حال کا ہم دوش بنا دیا تھا اور آنے والے واقعات ان کے سامنے اسی طرح کھلی کتاب کے اوراق کی طرح بن گئے تھے جس طرح آپ غزوۂ موتہ کے واقعات کو مدینے میں دیکھ رہے تھے۔ اللہ ماضی، حال اور مستقبل کا جس قدر علم چاہتا ہے اپنے رسولوں کو عطا کر دیتا ہے۔ العلم عند اللہ۔

خطبۂ حجۃ الوداع میں عملی زندگی کا کون سا ایسا پہلو ہے جس کا تعلق ہمارے انفرادی یا اجتماعی معاملات اور معاشرے کی تعمیر اور اسلامی اخلاق سے ہو، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہ فرمایا ہو۔ میراث کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک تہائی مال (ترکے) سے زیادہ کی وصیت کا حق نہیں ہے۔ یہ حکم معاشرے میں ہم واری اور اعتدال کے لئے کتنا اہم ہے اس کا اندازہ مشکل نہیں۔

آج اخبارات میں ''عاق'' کے کتنے ہی اعلانات اور اشتہارات شائع ہوتے ہیں اور ان لوگوں کو خبر نہیں کہ یوں ''عاق'' کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں کہ کسی وارث کو اس کے

حصے سے محروم کر دیا جائے یا کسی کی جائیداد کسی کے نام منتقل کر کے، دوسرے جائز وارثوں کو محروم کر دیا جائے۔

آپ نے خطبہ حجۃ الوداع میں مسلمانوں کو اللہ کے نام پر جھوٹی قسمیں کھانے سے منع فرمایا، صدقہ دینے کا حکم دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے بارے میں ہدایت فرمائی کہ ''علم میں سے جو کچھ ممکن ہو حاصل کر لو اس سے پہلے کہ علم سمیٹ لیا جائے اور تمہارے درمیان سے اٹھا لیا جائے۔'' علم کے بارے میں آپ کا یہ قول حق ہے اگرچہ اس کا پورا مفہوم ہم پر روشن نہیں ہے۔ علم کے ختم ہونے کی ایک صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان فرمائی کہ علم کے جاننے والے ختم ہو جائیں۔ اسوہ حسنہ نبوی اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات ذہن میں آسکتی ہے کہ اسلام میں علم، نور ہے اس لئے یہ ایک عملی شے ہے جس کا اظہار انسان کے اخلاق و کردار سے ہوتا ہے۔ یوں علم کے حقیقی وارث صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تھے جن کی رفتار و گفتار، نشست و برخاست، ہر سرگرمی علم اور روشنی تھی۔ ان کے بعد اخلاق نبوی اور علم نبوی سے مستفید ہستیوں سے دنیا محروم ہوگئی۔ لیکن قرآنی تعلیمات، خیر خواہی اور جماعت سے وابستگی کی صورت میں علم جاری رہا۔ عہدِ صحابہ کی اہمیت مسلم ہے مگر تاریخ کا تسلسل اور مستقبل میں اسلامی معاشرے میں علم کا اجرا منشائے خداوندی کے عین مطابق تھا۔

علم کے اٹھائے جانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ لوگ ظنی اور تخمینی علوم کے پیچھے لگ جائیں اور علم کا تصور اور مقصد ہی بدل جائے۔ ہمارا دور جسے درس گاہوں، تجربہ گاہوں اور تحقیقی مراکز سے وابستہ لوگ علم اور روشنی کا دور قرار دیتے ہیں، دراصل علم کے حقیقی مفہوم اور علمی اہداف سے بہت دور ہو گیا ہے۔ علم کا تعلق انسان سازی، علم و عمل کے رشتے اور مادی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی ترقیوں اور اعلیٰ اقدارِ حیات کے ساتھ تھا۔ اب علم کا رشتہ صرف معاش اور پیٹ سے وابستہ ہو گیا ہے۔ پہلے وہ علم افادی علم کہلاتا تھا جو ہمیں بہتر انسان بنا دے اور معاشی ترقیوں کے جلو میں ہمیں تعمیرِ ذات سے بے خبر نہ ہونے دے۔ آج علم کا معیار یہ ہے کہ وہی علم اور علوم افادی ہیں جن کے حصول سے زیادہ سے زیادہ تنخواہ اور معاشی فوائد حاصل ہو سکیں۔ افادیت کا تصور انسانی سطح سے محروم ہو چکا ہے۔ علم کا کوئی علاقہ اقدار

سے باقی نہ رہا۔ آج معلومات کو علم کہا جار ہا ہے۔ یہ علم وآگاہی کا دور نہیں بلکہ معلومات کا دور Age of information ہے۔ یہ علم کے اٹھ جانے کی ایک صورت ہے۔

''علم اور آگاہی کا یہ دورِ جدید'' اپنے خود ساختہ معیاروں کا ایسا اسیر ہے کہ اس نے وحی الٰہی سے منہ موڑ لیا ہے اور ایک نئی 'فرعونیت'' کو جنم دیا ہے۔ آج کے علوم کے لبوں پر یہی نعرہ ہے کہ انا ربکم الاعلیٰ ابلیسیت تکبرِ علمی کو کہتے ہیں۔ آج خدا ناآشنا علم نے جو روشنی پھیلائی ہے اسے جگر مراد آبادی کی وضع کردہ اصطلاح ''جہلِ خرد'' اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے

گھٹ گئے انساں، بڑھ گئے سائے

اعلیٰ اقدارِ حیات کو ٹھکرانے والے انسان سائے سے زیادہ کچھ اور نہیں۔ علم کے اٹھ جانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ علم کی خالی جگہ پر جہلِ خرد براجمان ہو گیا ہے۔ اس علم کو ''دانشِ برہانی'' بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ دانشِ برہانی دانشِ نورانی یعنی وحی کی روشنی سے تہی دامن ہے اور اس کی پیروی کرتے ہوئے آج کا انسان ''حیرت کی فراوانی'' میں گم ہے۔ جدید علم کا کوئی ساحل نہیں ہے۔

اور انسان کو ساحل مراد پر کتاب اللہ ہی پہنچا سکتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم کے اٹھائے جانے کی خبر دینے کے بعد ہمیشہ قائم رہنے والے علم (جو عمل کے راستے پر انسان کی رہبری کرتا ہے) کا سراغ ان الفاظ میں عطا فرمایا۔

لوگو! میری بات سنو۔ میں نے سب کچھ تم کو پہنچا دیا ہے۔ میں نے تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑی ہے کہ اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، اور وہ چیز ہے کتاب اللہ۔

میں نے تمہارے درمیان ایسی چیزیں چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان سے وابستہ رہے اور ان کو مضبوطی سے پکڑے رہے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ روشن اور مبین اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ''کتاب اللہ'' کا ذکر فرمایا تا کہ قرآن حکیم کی

اساسی اہمیت سننے والوں کے سامنے رہے اور اس کے بعد آپ نے ''کتاب اللہ'' اور سنتِ رسول اللہ کا یوں ذکر فرمایا کہ ان کا رشتہ ہمیشہ کے لئے واضح ہو جائے۔ اللہ کے رسول نے اللہ کی تعلیمات کو انتہائی تکمیل کے ساتھ عمل کے قالب میں ڈھال کر اہلِ ایمان کی راہیں روشن فرمادیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات قرآن ناطق کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ نے ہمیں عقائد، عبادات اور دائمی اصول عطا فرمائے اور اپنی ذات واخلاق سے ان پر عمل کے راستوں تک رہبری فرمائی۔ نماز وہی نماز ہے جو آپ کی نماز سے مطابقت رکھتی ہو، زکوٰۃ کے آداب وطریقہ، وہ ہے جو جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی مہر لگی ہو۔ حج کے مناسک اللہ کے رسول حجۃ الوداع میں سوا لاکھ سے زیادہ انسانوں کے سامنے پیش فرما کر قیامت تک کے لئے اہل ایمان کے لئے نبوی میراث کے طور پر چھوڑ گئے۔

تیئس سال تک اللہ کی جو ہدایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی صورت میں آئیں آپ کا خطبہ حجۃ الوداع ان کا حاصل وخلاصہ ہے۔

خطبے کے اختتامی جملے امت سے اللہ کے رسول کی رخصت کا سندیسہ بھی ہیں۔ ہر ایک لفظ رسول اور امت کے باہمی رشتے کی محبت کا اظہار ہے اور دل کی طرح دھڑک رہا ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ سے شہادت طلبی بھی ہے اور دعوت کی تکمیل کا اعلان بھی۔ آپ نے حجۃ الوداع کے شریک صحابہ کرام اور قیامت تک کے آنے والے امتیوں سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

میں حوضِ کوثر پر تم سے پہلے پہنچوں گا اور تمہاری کثرتِ تعداد کی بنا پر دوسری امتوں کے مقابل تم پر فخر کروں گا۔ تم میری رسوائی کا سبب نہ بن جانا۔

خبردار! میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

دیکھو! تم نے مجھے اچھی طرح دیکھ بھی لیا ہے اور مجھ سے (اپنے دین کی فلاح کی) باتوں کو اچھی طرح سن بھی لیا ہے۔ تم سے عن قریب (اور میرے بعد) میرے متعلق پوچھا جائے گا (تو تم صداقت کے ساتھ میری

باتیں پوچھنے والوں کو بتا دینا) جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا (اور میرے نام سے گڑھ کر باتیں لوگوں کو بتائیں) وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

جو یہاں (میدانِ عرفات) میں موجود ہے وہ میری یہ باتیں غیر حاضروں تک ضرور پہنچا دے۔ شاید بعض ایسے لوگ یہاں موجود لوگوں سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں اپنی امت کے سپرد تبلیغ اور اشاعت دین کا فریضہ کردیا۔ آپ کا یہ خطبہ آپ کی حیاتِ رسالت کی تعلیم کا نچوڑ (کتاب اللہ) کا خلاصہ ہے اور موقع کی مناسبت سے آپ نے اس خطبے کے مفاہیم اور ہدایات کا ذکر فرمایا اور منشائے نبوت واضح ہے کہ جس مسلمان کے پاس اللہ کے دین کی کوئی بات موجود ہو وہ اپنے بھائی تک بغیر کسی ملاوٹ کے پہنچا دے اور بغیر اس طرح کہ اپنے میلان اور رائے کو شامل کرے۔ پھر آپ نے یہ نکتہ بھی ارشاد فرمایا کہ علم دین اور بالخصوص علم حدیث مستقبل میں بھی جاری رہے گا اور ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح احادیثِ نبوی کو بعد کے ادوار میں چھانا پھٹکا گیا۔ روایت اور درایت کے کیسے مستحکم اصول وضع کیے گئے۔ کس طرح قرآن وحدیث میں مطابقت قائم کرنے کے فن (تطبیق) کو درجۂ کمال تک پہنچایا گیا۔ اسماء الرجال کو کیسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا گیا ہے۔ اسماء الرجال علم سے دوسرے مذاہب، تہذیبیں اور علمی روایات محروم ہیں۔ اور یہ بات بھی ہمارے سامنے ہے کہ قرآنی تعلیمات کی طرح احادیثِ نبوی کے بعض پہلو صدیوں کے بعد ابھر کر سامنے آئے اور نئے احوال وحالات میں ارشاداتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی رہنمائی کی۔

اور خطبہ ختم کرتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ اپنے رب سے مخاطب ہوئے اور انہوں نے اپنے آپ کو رحمۃ للعالمین، کافۃ للناس آخری رسول بنانے والے سے کہا:

اے اللہ! میں نے تیرا پیغام دین انسانیت تک مکمل طور پر پہنچا دیا یا نہیں

اور پھر آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہوئے:

کیا میں نے اللہ کا دین تم تک اچھی طرح نہیں پہنچا دیا؟

۔یہ وہ مرحلہ تھا جب کامل ترین نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کارِ رسالت کی تکمیل پر ان لوگوں کی گواہی طلب کی جن پر آپ رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ سابقون الاولون کے سامنے ۲۳ سال کی جدوجہد کا ہر لمحہ تھا۔ وہ ان لمحات کو، اپنے تصور کو ایک لمحہ میں دہرا گئے۔ ہر واقعہ مجسم ہو کر سامنے آ گیا۔ بعد میں ایمان لانے والے بھی آپ کی کاوشوں اور اخلاقِ کریمانہ کے گواہ تھے مکۂ معظمہ میں خون کے پیاسوں کی معافی، غزوہ حنین میں آپ کا استقلال، آپ کی بے مثال فیاضی، آپ نے مالِ غنیمت جس طرح تقسیم کیا اس نے مانگنے والوں اور لینے والوں کو دنگ کر دیا۔ آپ نے بے طلب دیا اور اتنا دیا کہ دامنوں میں جگہ نہ رہی۔ عرفات کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت طلبی پر آنکھ بھیگ گئی اور ہر لب پر اقرار واعتراف کے کلمے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ اقدس اب آسمان کو دیکھ رہا تھا، آپ کی انگشتِ شہادت بلند ہوئی اور لوگوں کی اس گواہی پر آپ نے تین مرتبہ فرمایا۔

اے اللہ! گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا، اے اللہ گواہ رہنا۔

آفرینشِ کائنات کے دن سے ۹ ذی الحجہ ۱۱ھ تک آسمان اور زمین ایک دوسرے سے اتنے قریب تر نہ ہوئے ہوں گے جتنے قریب وہ حجۃ الوداع کے یوم عرفات کی اس شام ہوئے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربِ قدیر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اے اللہ! تو گواہ رہنا۔ ہمارا رب ہر قیدِ زمانی، مکانی سے بالاتر ہے کیونکہ وہ زمان ومکان کا خالق ہے مگر ہماری زبان ہماری عقل اور ہمارے تخیل کی طرح محدود ہے اور جب اپنی حدود میں ہم اس شام اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے امتیوں کے حال کی طرف اللہ کے رجوع ہونے کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہی پیرایۂ اظہار پیدا ہوتا ہے۔

اور اپنے رسول کے خطبہ کو اپنے پیغامات کا خلاصہ اور تکملہ قرار دیتے ہوئے ربِ کائنات جل جلالہ نے یہ کلمات توثیق کے لئے نازل فرمائے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۴)

۴۔ المائدہ:۳

آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور تم پر اپنی
نعمت تمام کر دی ہے اور اسلام کو تمہارے دین کے طور پر پسند کر لیا
(قبول کر لیا)

خطبۂ حجۃ الوداع اپنے اختتام کو پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ وقوفِ عرفات میں مصروف تھے لبوں پر دعائیں جاری تھیں، سینوں کے زیر و بم سے میدانِ عرفات میں ارتعاش سا تھا، قربِ الٰہی ایک زندہ احساس کی طرح صحابہ کرام کے نفوسِ مقدسہ کو ملکوتیت کے سانچے میں ڈھال رہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف تو اللہ جل جلالہ کی معیت کے انوار کی تابانیوں میں جگمگا رہے تھے اور دوسرے طرف اس مجمع میں شامل اور شریک تھے جس کا ہر فرد ان کی تعلیمات کا مثالی نمونہ اور اپنے صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کا آئینہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اور وہ وحی کا بوجھ برداشت نہ کر سکی۔ یہ سب کچھ آپ کے وہ مقرب صحابہ دیکھ رہے تھے جو نزولِ وحی کی اس علامت اور کیفیت کو خوب جانتے تھے۔ یہ قبولیت دعا کی گھڑی تھی اور آج بھی مسلمان میدانِ عرفات میں قبولیت کے کامل یقین کے ساتھ اپنے رب کے حضور اپنی التجائیں پیش کرتے ہیں۔ یہ احکام سے متعلق آخری آیت تھی جو نازل ہوئی۔ اس کے بعد جو چند آیات نازل ہوئیں ان کا تعلق عبادات، بشارتوں سے ہے۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیاسی دن اس دنیا میں رہے یہاں تک کہ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ کو

زمانہ خالی شد از محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۵)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تین انعامات کا ذکر فرمایا ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی امت کو عطا کئے گئے۔

۱۔ اکمالِ دین: مسلمانوں اور ان کے وسیلے سے انسانیت کو تمام فرائض، قوانین، آداب اور حدود عطا کر دی گئیں۔ اب جو نئے مسائل اور اس سے متعلق احکام سامنے آتے

۵۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال تاریخ وفات ہے۔

ہیں اور آئیں گے وہ کتاب اللہ سے اخذ کئے جائیں گے۔ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے لیکن اجتہاد کی اساس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہے اور رہے گی۔ قانون کا مقصد نفسِ انسانی کی بالیدگی، تجزیے اور اخلاق کا نشو و نما ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو ضابطۂ اخلاق عطا کیا ہے اس کی عنایت یہی ہے کہ شاید تم تقویٰ اختیار کرو۔ حب الٰہی اور خوفِ الٰہی کی بنیادوں پر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کی تربیت فرمائی اور آج حیاتِ نبوی اور صحابۂ کرام کی زندگیاں قیامت تک کے لئے ہمارے لئے روشنی کا مینار رہیں گی۔

۲۔ اتمامِ نعمت: اکمالِ دین کے بعد اس آیت میں رب العزت نے اتمامِ نعمت کا ذکر فرمایا ہے۔ دین کے اکمال سے بڑھ کر نعمت کی تکمیل اور کہاں ہوتی ہے۔ اور نعمت کی تکمیل صحابہ کرام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور اتمامِ نعمت ان کا اجتماعی تجربہ تھا۔

انہوں نے دیکھا کہ کس طرح کفر کے جتھے پسپا ہو گئے، کس طرح بت سرنگوں ہو گئے اور کس طرح خانہ کعبہ اور انسانوں کے دل ان بتوں سے پاک کر دیئے گئے اور کس طرح رب العلیٰ کے نام کا غلغلہ بلند ہوا اور کس طرح اللہ کے نام کے ساتھ اس کے رسول کے ذکر کو رفعت حاصل ہوئی۔ نعمت کا اتمام یہی ہے کہ اس کی غایت مکمل ہو گئی اور کائنات کی اسکیم اسی نعمت کے اتمام سے مکمل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کائنات کے منصوبے اور اسکیم کا خالق ہے دین کی نسبت مسلمانوں اور انسانوں کی طرف کی اور اتمامِ نعمت کی نسبت اپنی طرف کی۔ اب یہ فریضہ مسلمانوں کے ذمے ہو گیا کہ وہ اپنے اعمال و افعال، کردار و گفتار کے ذریعے دینِ حق اور اس کی برکات عالمِ انسانی کے سامنے پیش کریں اور اس کے نتیجے میں اس نعمت کے ثمرات کو مرتب کرنا باری تعالیٰ نے اپنے کرم سے اپنے ذمہ لے لیا۔ ویسے بھی کوشش انسان کے ذمے ہے اور اس کے نتائج اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

۳۔ ختمِ نبوت: اس آیت میں ختمِ نبوت و رسالت کی طرف بھی واضح اشارہ موجود ہے۔ انسانوں کے لئے اللہ کا دین پہلے رسول کی بعثت سے اسلام ہی تھا۔ اسلام ہر عہد کے انسانوں کی ضروریات، ان کے فہم اور عملی صلاحیتوں کے اعتبار سے کامل تھا۔

جیسے جیسے انسان کی عقل، اس کے معاشرے اور زندگی کے تقاضوں میں وسعت آتی گئی، ویسے ویسے بعد کے ادوار کے نبیوں اور رسولوں کے پیغام کی حدود میں احکام اور مسائل کا اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود میں انسانی زندگی کے سارے امکانات اور عقلِ انسانی کی قوتِ اخذ مکمل ہوگئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قائم کردہ حدود اور احکام کے دائرے میں ہر آنے والے دور کی تفصیلات کے باب میں انسان کو آزادی عطا کردی اور یہ اعلان فرمادیا کہ ہم نے تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر منتخب کردیا۔ یوں رسالت کی ضرورت باقی نہیں رہی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نبوت کے ادارے کے لئے ''مُہرِ ربانی'' بن گئی۔

معتبر روایات کے مطابق سورۃ النصر بھی حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ سورہ النصر کا ایک نام سورہ التودیع ہے۔ تودیع کے معانی ہیں کسی کو رخصت کرنا۔ حجِ وداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبات ارشاد فرمائے ان میں آپ نے اس دنیا سے جلد رخصت ہونے کا ذکر ضرور فرمایا۔ یہ آخری مکمل سورت ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَالۡفَتۡحُ O وَرَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا O فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (٦)

اللہ کی نصرت اور فتح آچکی اور آپ نے لوگوں کو جوق در جوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا، پس اپنے رب کی تسبیح اور تحمید کیجئے اور اس سے مغفرت طلب کیجئے، بیشک وہ معاف کرنے والا ہے۔

عرب کے سارے قبائل قریش کے ساتھ اسلام کی آویزش کو دیکھ رہے تھے۔ وہ دس سال کے واقعات سے اور مسلمانوں کی فتح سے اور ان کے اخلاق و احوال کو دیکھ کر ان کے حق پر ہونے کا یقین کرچکے تھے اور اب انہیں قریش کے انجام کا انتظار تھا۔ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل فوج در فوج، جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ صرف یمن سے سات سو افراد کا

٦۔ النصر: ۱، ۳

قافلہ مدینہ منورہ پہنچا اور اس شان سے کہ یہ لوگ راستے میں اذانیں دیتے رہے، نمازیں ادا کرتے رہے اور قرآن حکیم کی تلاوت سے فضاؤں کو روشنی بخشتے رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب اپنے وطن ہی سے اسلام قبول کرچکے تھے، اسلامی عبادات ادا کررہے تھے اور قرآن حکیم سے اپنے ذہن اور عمل کا رشتہ مضبوط کرچکے تھے۔

مقصدِ رسالت پورا ہوچکا تھا۔ انسانیت کا سفینہ ساحلِ مراد تک پہنچ چکا تھا۔ انسان کا رخ توحیدِ الٰہی کی طرف مڑ چکا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ تمام نشانیاں دیکھ رہے تھے۔ اب آپ کا قلبِ مطہر لقائے رب کے لئے بے قرار تھا۔ اس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک میں دس دن کی جگہ بیس دن کا اعتکاف فرمایا اور جبرائیل امین کے ساتھ قرآن مجید کے ایک دورے کی جگہ دو دورے مکمل ادا کئے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق تسبیح، تحمید اور استغفار میں کثرت اور شدت آگئی۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں پر سبحان اللہ وبحمدہ استغفر اللہ واتوب الیہ کے کلمات اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور سوتے میں جاری رہتے اور ہر نماز کے بعد ضرور یہ دعا فرماتے سبحنک ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی کے ساتھ ساتھ صحابہ کرام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور توجہ بھی بہت بڑھ گئی۔ محبت و رحمت کے اس سمندر کی کوئی انتہا، حد اور تھاہ نہیں تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسبیح و تحمید و استغفار سے یہ نکتہ اور بھی روشن ہوگیا کہ اخلاق و نفوسِ انسانی کی تطہیر و تزکیہ اور اسلام کے غلبے کا رشتہ فتوحات سے نہیں بلکہ اخلاقِ حسنہ سے ہے، جس کی تکمیل کے لئے محمد ﷺ کے رب نے محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا تھا۔

رفیقِ اعلیٰ۔ ملاقات کے لئے بے قراری

حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جامع العبادات (حج) کے مناسک کی تعلیم دی۔ سفر کے پڑاؤ پر اسلامی اخلاق اور حسنِ معاملہ کی تعلیم دی، عرفات میں ان کے رب نے ان کو دین کے اکمال اور اپنی نعمتوں کے اتمام کی نوید سنائی اور آپ کو اپنی ملاقات کے مژدے سے نوازا۔ اب اس خاک داں میں آپ کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ اب مدینہ منورہ میں ایک طرف تو آپ صحابۂ کرامؓ کی تربیت میں مصروف تھے اور دوسری طرف آپ کی راتیں اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے میں گزر رہی تھیں۔ تسبیح وتحمید واستغفار میں عبدیت کے تمام رنگ، تمام ادائیں جھلک رہی تھیں۔ اختتام سفر پر آپ کو اپنے ساتھی، جانثار شدت سے یاد آرہے تھے جنہوں نے اپنی جانیں دے کر اللہ کی توحید اور خاتم الانبیاء کی صداقت کی گواہی دی تھی۔ انہیں کا مقدس لہو اسلام کے باغ کی بہار بن گیا۔ آپ احد تشریف لے گئے، حضرت حمزہؓ اور شہدائے احد کے لئے دعا کی اور جلد ہی ملنے کے وعدے کے ساتھ ان کو الوداع کہا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ خطبے دیتے رہے، داعی الی اللہ اپنے فریضے سے ایک لحظے کے لئے بھی غافل نہ ہوا۔ ایک خطبے میں آپ ﷺ نے فرمایا۔

> اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے کہ چاہے وہ دنیا کو اپنے لئے پسند کرلے اور چاہے تو اس چیز کو جو اس کے لئے اس کے رب کے پاس ہے، سو اس بندے نے اپنے لئے وہی کچھ پسند کرلیا جو اس کے لئے اس کے رب کے پاس ہے۔

یہ اندازِ کلام، اشاریت اور اپنے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکسار تو دیکھئے، رمز شناسِ نبوت اور مزاج دانِ رسول حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، ان کلمات کو سن کر رونے لگے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کو صدیق اکبرؓ کے رونے پر تعجب ہوا مگر کچھ ہی دنوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی کہ اللہ کے ایک بندے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ اپنی ذاتِ اقدس کی طرف تھا اور ابوبکرؓ ہم سب سے زیادہ صاحب علم وفہم تھے۔

ایک رات سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ابوحبیبہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بقیع تشریف لے گئے اور اہلِ بقیع سے الوداعی کلمات فرمائے ''اے اہلِ قبور! تم پر سلام ہو۔ تم جس حال میں ہو وہ اس حال سے کہیں بہتر ہے جس میں دنیا والے ہیں۔ فتنے اندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح بڑھ رہے ہیں'' پھر آپ نے اہلِ بقیع کے لئے مغفرت کی دعا فرمائی۔ یہ انسانی اخلاق اور بے غرضی کی معراج ہے کہ اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کو کسی مرحلے پر فراموش نہ کرنا۔ اسوۂ حسنہ نبوی سے صرف میدانِ کارزار میں استقامت کا سبق نہیں ملتا بلکہ انسانی تعلیمات میں استقامت اور استقلال ایک اہم اخلاقی صفت ہے۔ اس سلسلے میں انصار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلقِ خاطر کی بات آگے آئے گی۔

۲۹ صفر ۱۱ھ کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے کے ساتھ جنت البقیع تشریف لے گئے اور آپ نے مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں گہرائی پیدا کرنے کے لئے نہایت قیمتی اور بیش بہا اخلاقی روایات ہمارے لئے چھوڑی ہیں جن پر عمل کرنے سے اسلامی اخوت ایک مشہود رشتے کی حیثیت اختیار کرلیتی ہے۔ اپنے مسلمان بھائی کی دعوت کو قبول کرنا آپ کی سنت ہے، مسلمان کی عیادت کو اسلامی نظام اخلاق میں عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ مسلمان کی نماز جنازہ اور تجہیز وتدفین میں شرکت عبادت ہے۔ جنازے سے واپس ہوتے ہوئے آپ کے سرِ مبارک میں درد شروع ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ حرارت بھی بڑھتی گئی۔ اور تیز بخار میں بدل گئی۔ آپ کے سر پر پٹی باندھی گئی۔ پٹی کے اوپر ہاتھ رکھنے سے بخار کی شدت کا اندازہ ہوتا تھا۔ پیشانی اور گلوئے رسول کی رگیں ابھر آتیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت میں ہر دن اضافہ ہوتا گیا۔ مرض الموت کی مدت دو ہفتے تھی اور آپ نے اس شدید اذیت اور تکلیف میں کوئی گیارہ دن نماز کی امامت فرمائی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ الصلوٰۃ معراج المومنین اور آخری ایام حیات میں اس قول پر اپنے عمل کی مہر بعنوان جلی ثبت کر دی۔ یقیناً تنہا اور پھر اپنے گھر میں نماز پڑھ کر مسلمان اس فریضہ کو تو ادا کر دے گا، لیکن نماز کی غایت بدرجۂ احسن پوری نہیں ہوگی۔ نماز اللہ سے مسلمان کی سرگوشی بھی ہے اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ وابستگی کا راستہ بھی اور الحب اللہ کی تفسیر بھی۔ اپنے اصحاب کی معیت و رفاقت اور ان کی تعلیم و تربیت کا فریضہ آپ امامتِ جماعت اور اپنے مختصر خطبات کے ذریعے اپنی زندگی کے آخری ایام تک ادا فرماتے رہے۔ ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔

علالت بڑھتی جا رہی تھی مگر نماز کی امامت کے ساتھ ازواجِ مطہرات کے ساتھ عدل کا خیال ہر لمحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رہتا۔ آپ ہر دن دریافت فرماتے کہ کل کس کی باری ہے؟ کل میں کس کے حجرے میں رات گزاروں گا۔ جسمانی طاقت آپ کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ چند قدم چلنا آپ کے لئے دشوار تھا۔ علالت کے آخری ہفتے کے آغاز میں امہات المومنین نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی تکلیف ہم سے برداشت نہیں ہوتی، آپ جہاں چاہیں قیام فرمائیں۔ تعدادِ ازواج کے حامی اور مخالف دونوں اس باب میں عدل کے اس معیار، سطح اور اس کے تقاضوں پر غور کریں۔ زندگی کے ہر شعبے میں ''قیام عدل'' کو نہایت خوبی اور کمال کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دور میں آنے والے اپنے امتیوں کو عدل و قسط کی وسعتوں سے آگاہ فرمایا۔ قرآنِ حکیم نے بھی عدل کا یہ بلند تصور ہمیں عطا فرمایا ہے۔ کہ کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں جادۂ عدل سے نہ ہٹانے پائے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا
يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ
لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ O (۱)

۱۔ المائدہ: ۸

اے اہل ایمان! تم اللہ کے لئے حق پر قائم ہو جاؤ انصاف کے ساتھ حق اور سچائی کے گواہ بن جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں انصاف کے خلاف عمل پر آمادہ نہ کرے۔ عدل کیا کرو کہ وہ تقوے سے قریب تر ہے اور اللہ کا خوف (اور محبت) اختیار کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے۔

قرآن مجید نے مختلف سیاق و سباق میں عدل پر زور دیا ہے اور ایسی آیات کی تفہیم کسی پس منظر اور شانِ نزول کی محتاج نہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور اخلاقِ کریمانہ کے علم سے ایسی آیات واضح تر ہو جاتی ہیں اور قرآن کریم کا ایک ایک لفظ آپ کے اخلاق کے پس منظر میں چمک اٹھتا ہے۔ ''شہداء بالقسط'' کو اس واقعے کے پس منظر میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر کے والد نے انہیں کوئی عطیہ دیا تو ان کی تقوی شعار بیوی نے کہا کہ میں اس عطیے پر اسی وقت راضی ہوں گی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر شہادت دیں گے۔ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ حضور کی شہادت حاصل کرنے کے لئے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ اعدل للناس صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا کہ ''کیا تم نے اپنے سب بچوں کو ایسا ہی عطیہ دیا ہے؟ جواب ملا نہیں، ہادیٔ نوعِ بشر ﷺ نے کہا ''اللہ سے ڈرو۔ اپنی اولاد کے درمیان انصاف کرو میں ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا''۔ یہ واقعہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب صحیحین میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک طرف تو آپ نے اجتماعی معاملات میں اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کیا اور دوسری طرف اپنے ہر رشتے میں اسی معیارِ عدل کو برتا۔ بیماری کی شدت میں جب آپ پر ضعف کے سبب غشی طاری ہو جاتی تھی آپ نے ازواجِ مطہرات کے درمیان عدل کو قائم رکھا۔ اپنی مرضی کے مطابق کسی ایک جگہ رہنے کی اجازت جب ازواجِ مطہرات سے مل گئی تو آپ نے حضرت عائشہ کے حجرے کو اپنے قیام کے لئے پسند فرمایا۔ اس وقت مرض کا غلبہ تھا آپ کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور پیر اٹھانا آپ کے لئے دشوار تھا۔ آپ کو حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ اور حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سہارا دیئے ہوئے تھے۔ یوں آپ حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں تشریف لائے۔ اسی حجرے سے آپ

نے اپنے رب جل جلالہ کی ملاقات کے لئے عالم جاوید کی طرف سفر کیا۔

وفات سے پانچ دن پہلے بخار کی شدت میں اور اضافہ ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق مدینہ منورہ کے کئی کنوؤں کا پانی بخار کی تپش کم کرنے کے لئے آپ کے جسم اطہر پر بہایا گیا۔ حجرۂ عائشہ سے آپ مسجد نبوی میں اصحاب باصفا کو نماز کے لئے صف بندی کرتے اور نماز ادا کرتے دیکھتے تھے۔ صحابۂ کرامؓ کے دل دماغ پر آپ کی بیماری کا خیال ہمہ وقت مسلط رہتا مگر نماز جماعت کے قیام میں کوئی اندیشہ حائل نہ ہوتا۔ انتہائی تنظیم کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہوتی۔ کسی قسم کی ایسی آواز نہ سنائی دیتی جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں کوئی تکدر پیدا ہوتا۔ جسم پر پانی ڈالنے سے آپ نے کچھ افاقہ محسوس کیا، بخار کی تپش کچھ کم ہوئی اور آپ مسجد نبوی میں تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کر صحابہ کرام نے اپنی آنکھوں کی پیاس بجھائی۔ صحابہ نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے انتہائی تحمل کا مظاہرہ کیا۔ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ آپ کے گرد صحابۂ کرام بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمہ گوش اور ہمہ چشم بنے ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھے بیٹھے ایک مختصر خطبہ دیا جس کا موضوع ''انبیا کی قبریں'' تھا۔ امم سابقہ اور بالخصوص اہلِ کتاب کی تاریخ، ان کی گم راہیاں اور بدعتیں آپ کے سامنے تھیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مساجد بنا دیا۔ اب سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے۔ میری قبر کو تم بت نہ بنانا۔ آپ دنیا سے اپنے رخصت ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ آپ کے جاں نثار اپنی آہوں اور آنسوؤں کو روک رہے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز کانوں سے دلوں تک سفر کر رہی تھی۔

موضوع گفتگو بدلتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اگر میں نے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو تو اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں کہ وہ اس زیادتی کا بدلہ لے لے۔ صحابہ کرام نے کس طرح اپنے آپ پر قابو پایا اور ضبط کیا اس کی شہادت منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی دے رہا ہے۔ ایک صحابی نے کہا کہ آپ کے ذمے میرے تین درہم ہیں۔ صحابی کو اپنے درہم عزیز نہ تھے بلکہ یہ بات اس کے لئے گراں تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی کا احسان یا واجبات نہ رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فضل بن عباس کو تین درہم کی ادائیگی کا حکم دیا۔ اس

کے بعد آپ منبر سے نیچے تشریف لائے اور ظہر کی نماز پڑھائی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ پھر منبر پر تشریف لائے اور انصار کے حقوق اور اسلامی معاشرے میں ان کی اہمیت کے بارے میں خطاب فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار کو مسجد نبوی کی اس دوپہر میں فتح مکہ و حنین و ہوازن کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کے بعد کے حضرت سعدؓ بن عبادہ کے خیمے میں آپ کے خطاب اور اپنی اشک فشانی کے مناظر یاد آئے ہوں گے۔ فرق تھا تو یہ کہ اس دن خطاب انصار سے تھا اور آج سب سے انصار کے بارے میں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی نصرت کے سلسلے میں انصار کے ساتھ اور ان کی جاں فشانیوں کا جو احساس تھا اسی کے پیش نظر آپ نے فرمایا تھا کہ اب میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہے۔ اور اب جب دنیا سے آپ کے رخصت ہونے میں پانچ دن باقی تھے اپنی مسجد کے منبر سے آپ نے اعلان فرمایا:

> انصار میرے قلب و جگر ہیں۔ اسلام کی نصرت کے لئے انہوں نے اپنی ذمے داری اور فرائض پورے کر دیئے، مگر ان کے حقوق کی ادائیگی تمہارے ذمے باقی ہے۔ انصار کے نیک خصال لوگوں کی نیکیوں کا اعتراف کرنا اور ان کی خطاؤں کو نظر انداز کرنا۔ اب اہلِ ایمان بڑھتے جائیں گے مگر انصار کم ہوتے جائیں گے اور وہ کھانے میں نمک کی طرح رہ جائیں گے۔

اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں آپ انتہائی اختصار اور بلاغت کے ساتھ اہم نکات اور تعلیمات کو صحابۂ کرامؓ کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ امت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا یہ عالم تھا کہ بیماری کی تکالیف کو جیسے بھول گئے۔ یہ آخری ایام حیاتِ نبوی جیسے قیامت کے بعد میدانِ حشر میں امت کے ساتھ آپ کے تعلق کا دیباچہ تھے۔ وہ سخت ''دن جب ستارے ماند پڑ جائیں گے، آسمان پھاڑ دیا جائے گا اور پہاڑ دھنک ڈالے جائیں گے''(۲) سورج لپیٹ دیا جائے گا اور ستارے بکھر جائیں گے، سمندر بھڑکائے جائیں

۲۔ المرسلات: ابتدائی آیات

گے۔(۳) اُس عالم میں جب رشتے ٹوٹ جائیں گے، کسی کو کسی کی خبر نہ ہوگی اور ہر ذی نفس ''نفسی نفسی'' میں مبتلا ہوگا، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں پر ''امتی امتی'' کا نغمہ ہوگا اور یہی نہیں انبیائے ماسبق اپنی امتوں کی بخشش کے لئے آپ کی سفارش طلب فرمائیں گے۔

آپ کے اس خطبے اور امامت کا واقعہ بدھ ۷ ربیع الاول کا ہے۔ ۸ ربیع الاول سے آپ کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ حجرہ عائشہؓ میں حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم، دوسرے عزیز اور بعض صحابۂ کرامؓ بھی آپ کی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہوتے رہے اور آپ کی تلقین، ہدایات اور وصیتوں کا سلسلہ جاری رہا، آپ نے مدینہ آنے والے وفود کے اکرام اور ان کی تواضع کی وصیت کی، زیردستوں کے حقوق کی مسلسل توجہ دلاتے رہے۔ جمعرات ۸ ربیع الاول تک آپ مسجد نبوی میں نمازوں کی امامت فرماتے رہے۔ ۸ ربیع الاول کو مغرب کی نماز تک یہ سلسلہ جاری رہا اس نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت میں سورۂ مُرسلات کی تلاوت فرمائی۔ اس سورت میں قیامت کی ہولناکی کا ذکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی بے کراں اور بے پایاں تھی۔ آپ کی ساری جدوجہد کا مقصد مومنوں کو کامراں دیکھنا تھا۔ اس دنیا میں غلبۂ دین کی صورت میں اور قیامت کے دن ہر ہول، خوف اور امتحان سے گزر کر جنت میں داخلے کی صورت میں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلامِ ربانی کی آیات کے ذریعہ جماعتِ صحابہ کو قیامت کی یاد دلائی۔ رسول کی حاضری کا وقت جب جھٹلانے والوں کی تباہی اُن کے اور سب کے سامنے ہوگی، اس دن آگ کی لپٹیں کافروں کے لئے محل جیسی اونچی اور بلند ہوں گی اور چنگاریاں یوں نظر آئیں گی جیسے زرد اونٹ اچھل رہے ہوں۔ لیکن عشا کی جماعت کی امامت کے لئے مسجد تشریف نہیں لے جاسکے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تین مرتبہ اٹھنے اور مسجد جانے کی کوشش کی لیکن غشی طاری ہوگئی۔ اور اُدھر جماعتِ صحابہ مسجد میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ آخر میں آپ نے کہلا بھیجا کہ حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھادیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے صدیق نے حکمِ رسول کے مطابق امامت کی ذمے داری اٹھالی۔

۳۔ التکویر: ابتدائی آیات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام میں وہ جامعیت اور کاملیت ہے جو ایک معجزہ ربانی ہے۔ دین کامل ہو چکا تھا، اللہ کی نعمت تکمیل کو پہنچ گئی تھی، اللہ کا پیغام آپ نے عالمِ انسانیت کے سامنے عملی طور پر پیش کر دیا تھا مگر امت سے آپ کا تعلق خاطر اُن اعمال کی شکل اختیار کر رہا تھا کہ اگر مسلمان حیاتِ طیبہ کے آخری ایام کو اپنے سامنے رکھے تو اس کی دنیا اور آخرت کو سنوارنے کے لئے کافی ہیں۔ معمارِ اعظم اپنی بنائی ہوئی عمارت کو دیکھ رہا تھا اور عمارت (نظامِ امن) کے ایک زاویہ اور گوشہ کو نظر میں رکھ کر امت کی سمت نمائی کر رہا تھا۔ اہم الفاظ، ہدایات اور اعمال کی تکرار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ ثابتہ ہے۔

ان آخری دنوں میں سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی حیثیت سے آپ نے لشکرِ اسامہ (رضی اللہ عنہ) کی روانگی کا حکم دُہرایا۔ یہ وصیت اسلامی اخوت کی عظیم روایت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر تھی۔ مہاجرین اور قریش کے اکابر موجود تھے، عظیم القدر انصار سپہ سالار بھی مسلمانوں کے درمیان تھے۔ اس کے باوجود ایک ''غلام زادے'' کو سالارِ لشکر بنایا عربوں کی نسلی عصبیت کو ختم کرنے کے لئے ضروری تھا تاکہ وقت ہمیشہ اس حقیقت کا شاہد رہے کہ اگر برتری کی کوئی بنیاد ہے تو وہ تقویٰ ہے اور یہ بھی لوگوں کے سامنے رہے کہ اپنے اولوالامر کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ اور ''سمع وطاعت'' کی حدود متعین ہو جائیں۔

وفات سے ایک یا دو دن پہلے سنیچر یا اتوار کو آپ دو صحابیوں کا سہارا لے کر مسجد نبوی تشریف لے گئے۔ ظہر کی نماز حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں ہو رہی تھی۔ نماز میں خشوع اور یکسوئی کے راز داں صحابۂ کرام کا دھیان نماز میں تھا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی علالت فکر اور احساس پر حاوی تھی۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کو سہارا دینے والے صحابیوں کی آمد نمازیوں اور اُن کے امام کو کیسے اپنی طرف متوجہ نہ کرتی۔ استغراقِ عبادت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام، ان کے ایمان کے لئے کسوٹی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کو دیکھ کر امام کی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگے لیکن سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی جگہ ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ اور آپ کے حکم پر دونوں ہمراہیوں نے آپ کو صدیق اکبرؓ کے بائیں طرف بٹھادیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی امامت فرما رہے تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ اقتدا کر رہے تھے

اور رکوع وسجود کی تکبیریں دوسرے مقتدیوں تک پہنچا رہے تھے۔ نماز کی امامت، معاشرے اور ریاست کی امامت کا اشارئیہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں دونوں امامتیں یک جا تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل نے آپ کے بعد دونوں اماموں کی یک جائی کا نکتہ روشن کر دیا۔ بلاشبہ ابوبکر صدیقؓ خلیفۃ الرسول بلافصل ہیں۔ دوسرے خلفائے راشدین اور حضرت صدیق ایک دوسرے کے خلیفہ ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے اور اس سے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے مفہوم پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

نماز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی، نماز ایمان اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ نماز مسلمان اور اس کے معاشرے کو فواحش اور منکرات سے بچاتی ہے، نماز کی صف بندی معرکۂ حیات میں اہلِ ایمان کی صف بندی ہے، اللہ کے رسول نے دنیا سے جاتے جاتے نماز کے سارے پہلوؤں کی معنویت کو روشن کر دیا۔ وفات کے دن یعنی ۱۲ ربیع الاول کو جب مسجدِ نبوی میں فجر کی نماز ہو رہی تھی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضرت صدیقؓ کی اقتدا میں صف بستہ تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ کے حجرے کا پردہ ہٹایا اور اس منظر کو دیکھا کہ مسلمانوں کے رکوع وسجود سے وہ سحر پیدا ہو رہی تھی جس سے کائنات ہمیشہ روشن رہے گی۔ آپ کے لب ہائے مبارک پر تبسم کی کرن پھوٹی، وہ کرن آج بھی مسجد نبوی میں نماز ادا کرنے والوں کے مقدر کو جگا رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاطر مطمئن کے ساتھ حجرے کا پردہ گرا دیا۔ یہ آخری نماز تھی جس کا آپ نے مشاہدہ کیا اور جو آپ نے حجرۂ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا میں ادا فرمائی۔

ایک طرف تو امت کا اس درجہ خیال، ازواجِ مطہرات کے حقوق کی دمِ آخر تک ادائیگی اور دوسری طرف اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کے ساتھ آپ کی محبت۔ اس بیماری، بیماری کے شدائد میں ان کی محبتوں کا آپ نے اس طرح حق ادا کیا کہ اگر مسلمان اُسے یاد رکھیں تو اُن کی گھریلو زندگی اعتدال وتوازن اور حسن کا نمونہ بن جائے۔ خوش گوار گھریلو اور عائلی زندگی کے بغیر انسان معاشرتی ذمہ داریاں حسن وخوبی کے ساتھ نہیں نبھا سکتا۔ جب دوشنبہ کو سورج بلند ہو گیا تو آپ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو اور حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو بلا بھیجا۔

حضرت فاطمہؓ کو نوید سنائی کہ میری اور تمہاری جدائی چند روزہ ہے، یوں جنابِ فاطمہ کے غم کو خوشی میں بدل دیا اور انہیں عورتوں کی سیادت کی بشارت دی۔ سیدۃ النساء العالم۔ حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو تسلی دی اور وصیت کی اور اسی کے ساتھ ساتھ لبوں پر اللہ۔ رفیق اعلیٰ اور ''تمہارے زیردست'' کے الفاظ جاری رہے۔

آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کی خواہش کا اظہار کیا۔ مسواک پیش کی گئی اور سخت تھی، سیدہ صدیقہ نے اسے اپنے منہ میں لے کر نرم کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسواک کی بہترین انداز سے۔ یہ رفیقِ اعلیٰ سے ملاقات کی تیاری تھی۔ آخر وہ لمحہ آگیا جب دنیا آپ کے وجودِ پاک سے محروم ہو گئی۔ اس وقت آپ کا سر مبارک حضرت عائشہؓ کی ہنسلی کی ہڈی اور ٹھوڑی کے درمیان تھا فی الرفیق الاعلیٰ کے الفاظ آپ نے تین مرتبہ ادا کئے اور آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ جلوت میں ایسی خلوت۔ لوگوں کے ہجوم میں اپنے رفیقِ اعلیٰ سے یہ قربت۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات، انسان اور انسانیت کے لئے ایک معراج ہے۔

اور آپ کی مثال نے موت کا کانٹا قلبِ مومن سے نکال دیا۔

سلام اس پر جس نے انسان کو سربلند فرمایا۔

کاش ہم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابدی محفل میں خاک روبی کی سعادت حاصل ہو۔

AF-1105

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com

toobaa-elibrary.blogspot.com